بی۔اے : سال اول (سیمسٹر : ۲)

F. Y B. A (Semester - II)

اردو اختیاری : پرچہ ۔ ۱

(اردوافسانہ)

(Urdu Ancillary : Paper - I)

(Urdu Afsana)

Subject Code : UAURD 2.45

© UNIVERSITY OF MUMBAI

© یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر سہاس پیڈنیکر
وائس چانسلر
یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر رویندر کلکرنی
پرو۔وائس چانسلر
یونیورسٹی آف ممبئی

پروفیسر پرکاش مہانوَر
ڈائرکٹر
فاصلاتی تعلیمی ادارہ (IDOL)
یونیورسٹی آف ممبئی

پروگرام کوآرڈینٹر : ڈاکٹر انل بنکر
صدر ، فیکلٹی آف ہیومینیٹیز
فاصلاتی تعلیمی ادارہ (IDOL)
یونیورسٹی آف ممبئی

کورس رابطہ کار و مدیر : ڈاکٹر معزہ (قاضی) دلوی
فاصلاتی تعلیمی ادارہ (IDOL)
یونیورسٹی آف ممبئی

مضمون نگار :

پروفیسر مسرت فردوس (اکائی : 1)
سابق صدر، شعبہ اُردو
باباصاحب امبیڈکر یونیورسٹی، اورنگ آباد

ڈاکٹر کہکشاں لطیف (اکائی : 2)
اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف ٹرانسلشنز
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر نصراللہ خان (اکائی : 3)
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ پی۔جی اسٹڈیز و تحقیق (اردو)
کویمپو یونیورسٹی، کرناٹک

ڈاکٹر ماجد قاضی (اکائی : 4)
اسوسی ایٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو
مہاراشٹر کالج، ممبئی

جنوری 2021 طباعت۔I

پبلشر : ڈائرکٹر
فاصلاتی تعلیمی ادارہ (IDOL)
یونیورسٹی آف ممبئی

ماہر طباعت و ٹائپسٹ : جناب عبدالسنان فہیم احمد شیخ
پرنٹر : ممبئی یونیورسٹی پریس

نصاب

(حصہ اول)

اکائی 1: اردافسانے کافن

اکائی 2: اردوافسانے کا آغاز وارتقا

اکائی 3: منشی پریم چند

۱۔عہد

۲۔حیات وشخصیت

۳۔ادبی خدمات

۴۔افسانہ نگاری کی خصوصیات

اکائی 4: راجندر سنگھ بیدی

۱۔عہد

۲۔حیات وشخصیت

۳۔ادبی خدمات

۴۔افسانہ نگاری کی خصوصیات

نمونۂ امتحانی سوالیہ پرچہ

کل نمبرات: ۱۰۰ وقت: ۳ گھنٹے

تمام سوالات لازمی ہیں۔

ہر سوال بیس (۲۰) نمبر کا ہوگا۔

سوال نمبر ۱: اکائی۔۱ پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔

سوال نمبر ۲: اکائی۔۲ پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔

سوال نمبر ۳: اکائی۔۳ پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔

سوال نمبر ۴: اکائی۔۴ پر مشتمل متبادل سوالوں میں سے ایک سوال کا تفصیلی جواب لکھنا ہوگا۔

سوال نمبر ۵: نصاب (حصہ اول اور دوم) پر مشتمل چھے سوالات میں سے کوئی چار سوالات کے جوابات لکھنے ہوں گے۔

اکائی : ۱۔ اردو افسانے کا فن

ساخت:

1.1۔ اغراض ومقاصد

1.2۔ تمہید

1.3۔ افسانے کی تعریف

1.4۔ افسانے کے اجزا

1.5 ۔ افسانے کے موضوعات

1.6۔ خلاصہ

1.7۔ نمونہ امتحانی سوالات

1.8۔ فرہنگ

1.9۔ معاون کتابیں

1.1 اغراض ومقاصد

فنونِ لطیفہ کی تمام شاخوں میں ادب سب سے مؤثر اور دلکش ذریعۂ اظہار ہے۔ادب ایک طرح سے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ادب کی تخلیق ایک باشعور انسان کی ذہنی کارکردگی ہے۔ایسا باشعور انسان جونسلِ انسانی کے ماضی کا شناسا اور حال سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے۔ادیب اپنے زمانے کی حسیت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے دور کے مسائل ، واقعات ، حادثات اور تغیرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ تمام واقعات وتغیرات اس کا تجربہ اور واردات نہ ہوں۔لیکن ایک حساس اور فکرمند فرد کی حیثیت سے وہ ان وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اردو کے افسانہ نگاروں نے اپنے زمانے کے واقعات، سانحات اور تغیرات کی ترجمانی مؤثر طریقے سے کی ہے۔افسانوی ادب کا مطالعہ شعور میں پختگی پیدا کرتا ہے۔افسانوی ادب کے مطالعہ سے قبل افسانے کے فن سے واقفیت لازمی ہے۔افسانہ اردو نثر کی مقبول ترین صنف ہے۔ زندگی کے ہر

گوشے کی عکاسی افسانہ میں ہوتی رہی ہے۔اردو زبان وادب اورافسانہ کی تعلیم کے مقاصد وسیع وعمیق ہیں۔ زبان و بیان کا لطف وخوبصورتی کا جذبہ پیدا کرنا، زندگی کا باریکی سے مشاہدہ کرنا، بےشمار چھوٹے بڑے حادثات، واقعات و سانحات کا زندگی پر پڑنے والے اثرات کو سمجھنا، موزوں، مناسب ومؤثر الفاظ میں اظہارِخیال کی صلاحیت بیدار کرنا، ادبی تحسین کا ذوق پیدا کرنا، احساسات وجذبات میں پختگی اور زندگی کے سفر میں ان کی اہمیت اور دوررس نتائج کو جاننا وسمجھنا، ادب کے مطالعے کا شوق پیدا کرنا، نثر کو روانی اور صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی مشق بہم پہنچانا، نثری اصناف، ان کی ساخت، ان کے فن اور اہم خصوصیات کو جاننا، اس کے اہم مقاصد ہیں۔افسانہ کسے کہتے ہیں، اس کے اجزاء کیا ہیں، افسانے کے موضوعات کیا ہوتے ہیں، یہی موضوعات کیوں تخلیق کار کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔قاری کتنا متاثر ہوتا ہے۔کامیاب افسانہ نگاری کی کیا شرائط ہیں۔ ہر دور میں افسانہ میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، طالب علم کو جاننا ضروری ہے۔اردو کے اہم افسانہ نگار کون ہیں اور ان افسانوں کا ادب میں کیا مقام ہے۔ان مقاصد کے تحت یہ اکائی نصاب میں شامل کی گئی ہے۔

1.2 تمہید

افسانہ دراصل زندگی کی عکاسی ہے۔اس میں کرداروں کے توسط سے انسانی جذبات واحساسات کا تجزیاتی مطالعہ ہوتا ہے۔خارجی واقعات بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔انسان کی نفسیات پر یا اس کی فکر پر خارجی اثرات کا مطالعہ بھی افسانے میں جگہ پاتا ہے۔مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر اچھا افسانہ راست یا غیر راست انداز میں اپنے دور اور زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی کوائف کا بھی عکاس ہوتا ہے اور انسانی نفسیات سے بھی متعلق ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ افسانہ لکھنے والے کی آرزوؤں، تمناؤں اور جذبات واحساسات کی بھی آئینہ داری کرتا ہے۔

اس اکائی میں افسانے کے فن پر مختصر مگر جامع معلومات پیش کی جائے گی۔افسانہ کیا ہے، اُس کی تعریف کس طرح کی جاسکتی ہے، افسانے میں کون کون سے اجزاء ہوتے ہیں، اُن کی کیا اہمیت وضرورت ہے۔ افسانے کے موضوعات کیا ہیں۔ وقت کے ساتھ موضوعات میں تبدیلی کیوں آتی ہے۔اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا۔ مختصر و تفصیلی سوالات اور اُن کے بطور نمونہ جوابات بھی درج کئے جائیں گے۔فرہنگ ومعاون کتابیں بھی اس اکائی کا حصہ ہوں گی۔اس اکائی کے مطالعے سے آپ کو افسانے کے فن کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوگی۔

1.3 افسانے کی تعریف

'افسانہ' ایک نثری صنف ہے۔ داستان، ناول اور افسانہ میں مماثلت ہے۔ ان تینوں کو افسانوی ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ ان تینوں کی خصوصیت ایک ہے اور وہ ہے قصہ پن۔ اردو میں افسانہ شارٹ اسٹوری (short story) کا مترادف ہے۔ یہ صنف جدید مغربی ادب کی دین ہے۔ دی انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں شارٹ اسٹوری کی تعریف ووضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے :

> "Short story, brief fectional process narrative that is shorter than a novel and that usually deals with only a few characters. The short story is usually concerned with a single effect conveyed in only one or few significant episode or scences.

اس اقتباس سے یہ بات اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ مختصر افسانہ ایک ایسی صنف ہے جو ناول کے مقابلے میں بہت کم ضخامت کی حامل ہوتی ہے اور ایک یا چند باتوں کا وحدت تاثر کے ساتھ اظہار کرتی ہے۔

کہانی انسان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ اپنی اجتماعی زندگی کے بالکل ابتدائی دور سے کہانی کہنا اور سننا انسان کا محبوب ومرغوب مشغلہ رہا ہے۔ مغرب اور مشرق دونوں میں اس نے مختلف شکلیں اختیار کیں اور مختلف نام پائے۔ جیسے قصہ، کہانی، داستان، حکایت، روایت وغیرہ۔ ہر ایک کے مفہوم میں تھوڑا اور بعض صورتوں میں بہت نازک فرق ہے۔ صنف افسانہ اور کہانی میں بھی نازک فرق ہے۔ لفظ افسانہ مختلف زمانوں میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ حافظ شیرازی نے اس لفظ کو ترانہ یا نغمہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ بعد میں اس کا اطلاق ماضی کے واقعات کے بیان پر ہونے لگا۔

لفظ افسانہ ''افسوں'' سے مشتق ہے۔ اس اصطلاح کے معنی ''کلام متاثر کن'' ہوتے ہیں۔ افسوں سے بھی دوسروں کے دلوں کو موم کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ افسانہ سنا کر بھی دلوں کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ افسوں کے معنی جادو بھی ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس کے ابتدائی افسانوں اور داستانوں میں جنوں، پریوں اور مافوق الفطرت عناصر کا چلن عام رہا ہے۔ تحریر کے وجود میں آنے سے پہلے بھی کہانیوں کا تصور ملتا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ تہذیب کے دائرے میں آتا گیا ویسے ویسے ان کہانیوں کے مزاج اور انداز میں تبدیلیاں آتی گئیں۔

مختصر افسانے کی منطقی تعریف دشوار ہے اور اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف ادبی اصناف کی ایک مجموعی اور فنی شکل ہے۔ مختصر افسانے کے وجود میں آنے سے صدیوں پہلے انگریزی اور فرانسیسی میں اور خود سنسکرت اور فارسی میں بہت سی ایسی چیزیں رائج تھیں جن میں اور افسانوں میں بعض حیثیتوں سے مماثلت موجود ہے۔ افسانے کے بارے میں ایک نقاد کی رائے قابل تحریر معلوم ہوتی ہے کہ ''افسانہ زندگی کے پھل کی ایک قاش ہے۔'' یعنی ایک قاش کے توسط سے ہم پورے پھل کا ذائقہ معلوم کر سکتے ہیں۔ افسانہ پوری زندگی میں سے صرف ایک پہلو اور اس طرح اور اپنے دور کی پوری زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔

مغربی و مشرقی ناقدین نے افسانے کی تعریف اپنے اپنے انداز سے بیان کی ہے۔ افسانہ کی ایک جامع تعریف اس طرح ہے :

''افسانہ وہ نثری تخلیق ہے جس میں اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت ہو اور کسی خاص مرکزی تاثر پر استوار ہونے کے ساتھ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ یا عکس پیش کرے۔ اس کی زبان پُرکشش اور اندازِ تحریر انتشار سے پاک ہو۔''

Brander Mothews نے چھوٹی کہانی اور افسانے کے فرق کو اس طرح واضح کیا ہے :

''مختصر افسانہ ان کہانیوں سے بالکل مختلف اور امتیازی صنف ہے جو اتفاق سے کہانی ہونے کے علاوہ مختصر بھی ہوتی ہے۔ یہ کہانی ایک واضح فنی صورت ہے اور ایجاز و اختصار، جدت، فنی حسن اور تخیل کی چاشنی اس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔''

A.J.J. Ratcluff نے لکھا ہے کہ :

''مختصر افسانہ سیدھی سادی کہانی نہیں بلکہ ایسی فنی تخلیق ہے جس میں فنکار کے ارادے اور حکمت کو دخل ہوتا ہے۔''

H.G.Wall نے مختصر افسانے کی تعریف کرتے ہوئے اسے قصے کی ایسی قسم بتایا ہے جسے

''آدھ گھنٹہ پڑھا جا سکے۔''

E.J.O.Bicien کے نزدیک مختصر افسانے کی پہلی شناخت یہ ہے کہ افسانہ نگار اپنے منتخب کئے ہوئے حقائق اور واقعات کو حد درجہ مؤثر بناتا ہو۔

W.B.Pithin مختصر افسانے کو ایسا بیانیہ ڈراما بتاتا ہے جو واحد تاثیر پیدا کرے۔

J.B.Eeleulin لکھتے ہیں کہ :

''مختصر افسانہ ایک مختصر تخیلی تخلیق ہے جس سے کسی ایک مخصوص واقعے یا ایک مخصوص کردار کا نقش پلاٹ کے ذریعے اس طرح ابھارا جاتا ہے کہ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم سے ایک مخصوص (واحد) تاثر پیدا ہو سکے۔''

ان تمام تعریفوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ افسانہ نثر کی ایک مختصر بیانیہ تحریر (تخلیق) ہے جو ایک واحد ڈرامائی واقعے کو ابھارتی ہے جس میں کسی ایک کردار یا کرداروں کے ایک مخصوص گروہ کے نقوش نمایاں کئے جاتے ہیں۔ (اس میں کردار کی ذہنی کشمکش یا اس کی زندگی کا کوئی ایک واقعہ بھی شامل ہے) اور واقعات کی تفصیل اتنے اختصار اور ایجاز کے ساتھ کی جاتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس کا ایک (واحد) تاثر قبول کرے۔

صنفِ افسانہ اردو میں مغربی ادب کے اثر اور انگریزی زبان کے وسیلے سے بیسویں صدی میں رائج ہوا۔ ممتاز شیرین صاحبہ کہتی ہیں کہ :

''افسانہ مغرب میں بھی سب سے نئی اور کم عمر صنفِ ادب ہے۔ ہمارے یہاں افسانے کی پیدائش ہی اس وقت ہوئی جب ہمارے ادیب مغربی ادب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے اور اس سے مستفیض ہونے لگے۔''

مغربی ادب سے متاثر ہونے کے باوجود اردو افسانہ کی اپنی ایک شناخت، ایک پہچان ہے۔ اس نے ہندوستان میں پروان چڑھنے والی کہانیوں اور داستانوں کو اپنے اندر جذب کیا ہے۔ ملکی معاشرت، تہذیب اور قومی زندگی کی عکاسی کی ہے اور کم عمری میں ہی فن کے مختلف مدارج طئے کرتے ہوئے ادب کو بیش بہا نمونے بخش دیئے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

(۱) : لفظ ''افسانہ'' کے کیا معنی ہیں؟

(۲) : افسانہ کی جامع تعریف بیان کیجئے۔

(۳) : تعریفوں کے پس منظر افسانہ کی اہم خصوصیات تحریر کیجئے۔

1.4 افسانے کے اجزا

افسانہ ادب کی دیگر اصناف کی مانند مختلف اجزاء یا عناصر سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ اس کے عناصر زندگی کی بدلتی ہوئے قدروں کی طرح تبدیل ہوا کرتے ہیں۔ اس کے تشکیلی عناصر میں پلاٹ، کردار، ماحول، فضاء کے علاوہ وحدتِ تاثر، موضوع اور اسلوب کو اہمیت حاصل ہے۔

پلاٹ :

واقعات کی فنی ترتیب کو پلاٹ کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ واقعات کو فنی ترتیب کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ ایک واقعہ دوسرے کی وجہ ثابت ہو۔ واقعات میں پہلے سے ترتیب قائم کر لی جائے تو افسانہ نگار اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچا رہتا ہے۔ مرکزی خیال پر اس کی نظر جمی رہتی ہے۔ غیر ضروری تفصیلات افسانے کے ارتقاء میں رکاوٹ نہیں بنتیں اور افسانہ منطقی ترتیب سے آگے بڑھتے بڑھتے نقطہ عروج تک پہنچ جاتا ہے۔ کہانی کی تعمیر کا تمام تر انحصار پلاٹ پر ہوتا ہے اسی لئے افسانے میں اس کی حیثیت جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ ای ایم فاسٹر نے پلاٹ سے متعلق اس بات پر زور دیا ہے کہ اس میں علت و معلول کی بنیاد پر بات کہی جائے۔

افسانہ میں واقعات، مشاہدات اور حادثات کی فنی تعمیر دراصل پلاٹ کی تشکیل کی وساطت سے ہوتی ہے جو

افسانہ کے دیگر اجزاء کو مربوط رکھ کر آغاز سے انجام تک تجسس اور تسلسل کو برقرار رکھتی ہے۔ پلاٹ جس قدر مربوط، متجسس اور متناسب ہوگا۔ افسانہ اتنا ہی دلچسپ اور معیاری ہوگا اور قاری اسی قدر منہمک ہو کر بھرپور تاثر قبول کر سکے گا۔ سپاٹ یا غیر منظم پلاٹ افسانویت سے عاری ہوتے ہیں اُن میں وہ کرید برقرار نہیں رہ پاتی جو قاری کو بے چین کر دیا کرتی ہے۔ اس لئے پلاٹ کے صیغے میں افسانہ نگار کو واقعات اس ترتیب کے ساتھ بیان کرنے چاہئے کہ قاری کی دلچسپی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جائے اور وہ انجام جاننے کے لئے مضطرب ہوجائے۔ پلاٹ کے متعلق وقار عظیم کے خیالات اس طرح ہیں: ''افسانہ حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں، ان کے تاثرات، ان تاثرات کی بلندی و پستی، ان کی تبدیلی، حرکت و جمود اور اس طرح کی بہت سی چیزوں کا ایک ادبی اور فنی عکس ہے جو واقعہ، تجربہ یا خیال افسانے کی بنیاد بنتا ہے۔ پلاٹ اس واقعہ، تجربہ یا خیال کو ایک فنی ترتیب دیتا ہے۔ کہانی کی ترتیب میں مناظر، کردار اور ان کرداروں کے عمل اور ان کے مکالموں سے اور افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے رنگ بھرا جاتا ہے۔ کہانی کا یہ ڈھانچہ اس کا پلاٹ کہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ افسانے میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے افسانہ نگاروں کا ایک گروہ پلاٹ سے بیزار ہو گیا تھا۔ افسانوی تکنیک میں تجربہ پسندی کا عمل باقاعدگی سے جاری رہا ہے۔ پلاٹ میں زماں و مکاں کے منطقی رشتوں کی شکست پر زور دیا جاتا رہا۔ شعور کی رو نے افسانے کی صورت بدل دی۔ جدید افسانے میں پلاٹ سے انحراف کیا گیا۔ ابتدائی دور کے افسانوں پر داستانی اسلوب غالب ہونے کی وجہ سے حقیقی زندگی کی طرح ترتیب و توازن نہیں تھا۔ حقیقت سے دور ہونے کی وجہ سے باقاعدہ پلاٹ کا ہونا بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ بہت دنوں تک رومانی فضا سے بھرپور حزنیہ یا طربیہ انجام دینے والے افسانے لکھے جاتے رہے۔ ہر دور میں افسانے کے مزاج میں تبدیلی آئی اور اس صنف نے نئی جہتوں کی طرف قدم بڑھایا، پھر اس کے بعد جدیدیت کے زمانے میں نئے نئے تجربات کئے گئے۔ بغیر پلاٹ کے پیچیدہ نفسیات پر مبنی افسانے لکھے گئے۔ علامت اور ابہام کے پردے میں پوشیدہ بات کہنے کی کوشش کی گئی۔ مختصر یہ کہ افسانہ نگاروں نے پلاٹ کو کبھی اہمیت دی اور کبھی نہیں۔

پلاٹ کی کئی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ جیسے سادہ پلاٹ، پیچیدہ پلاٹ، ضمنی پلاٹ وغیرہ۔ ناقدین نے پلاٹ کا پہلا جز افسانہ کا عنوان قرار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ عنوان میں مقناطیسی کشش اور معنویت ہونی چاہئے کہ قاری سرخی دیکھ کر افسانہ پڑھنے پر آمادہ ہوجائے۔ اچھے عنوان کی پہلی شرط افسانے کے موضوع سے اُس کی مناسبت ہے۔ دوسری خصوصیت اُس کا مختصر ہونا ہے اور تیسرا وصف اُس کا نیا پن ہے۔

کردار :

اشخاص قصہ کے حرکات وسکنات کی عکاسی کا نام کردار سازی ہے۔ کردار سازی کا مضبوط ترین ستون ہے۔ افسانہ میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ کسی نہ کسی کردار کے سہارے ہی پیش آتے ہیں۔ بغیر اشخاص قصہ، افسانہ کی تکمیل مشکل ہے۔ جن افسانوں میں حیوانات یا نباتات ہیرو کی شکل میں ہیں۔ ان میں بھی ان کو انسانوں کی طرح بولتے، سوچتے، سمجھتے اور عمل کرتے دکھایا گیا ہے۔ افسانہ نگار زندگی کے جس رخ کی نقاب کشائی کرنا چاہتا ہے وہ ان کرداروں کے وسیلے سے منعکس کرتا ہے۔ افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے افسانے کے ذریعے ایسے کردار پیش کرے جو نوعیت کے لحاظ سے نئے اور انوکھے ہوں اور فوراً نظروں میں کھپ جائیں۔ ناول نگار اچھے کرداروں کو گونا گوں واقعات میں سے گزار کر ارتقا کے مختلف مرحلوں سے گزرتا دکھا کر آہستہ آہستہ ان کی شخصیت کے نقش کو ابھارتا اور مکمل کرتا ہے۔ ہم انھیں ہر آن بدلتا اور واضح شکل اختیار کرتا ہوا پاتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے وقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور متعدد واقعات کی بھی۔ مختصر افسانہ نگار کے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں۔ نہ زیادہ وقت نہ زیادہ واقعات اس لئے اسے اپنے مقصد کے لئے ایسے کردار منتخب کرنے پڑتے ہیں جن پر ایک خاص رنگ چڑھا ہوا ہے اور اگر اس کا مقصود کردار کی بدلتی ہوئی حالتوں کا دکھانا اور اس کے ارتقاء اور نشو ونما کے نقوش کو ابھارنا ہے تو اس کے لئے اسے خود ایسے واقعات کا انتخاب کرنا پڑے گا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنے تیکھے اور اتنے گہرے ہوں کہ کردار کی شخصیت کو پوری طرح نمایاں کرسکیں۔ کہانی میں کردار کو پیش کرنے کے عموماً تین طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ پہلا طریقہ تو کردار کے تفصیلی تعارف کا ہے۔ دوسرا طریقہ ڈرامائی ہے جس میں کردار اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ تیسرا طریقہ تجزیہ کا ہے جس میں کہانی لکھنے والا کردار کے خارجی ماحول کے علاوہ اس کے ذہن اور دل کی کیفیتوں کا شناسا اور راز داں بن کر اس کے نقش کو ابھارتا ہے۔ افسانہ نگار کو اپنے مقصد کے لئے ان تینوں طریقوں میں ترتیب کرنی پڑتی ہے۔ پہلے طریقہ میں وہ بیان کو زیادہ سے زیادہ مختصر کرتا ہے اور دوسرے طریقے میں وہ کرداروں کے لئے گفتگو اور عمل کے صرف چند موقعے فراہم کرتا ہے اور تیسرے طریقے میں تجزیے کی حدیں متعین کر کے اپنے آپ کا صرف ان ہی کے اندر رکھتا ہے اس کی کہانی میں کرداروں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے اور اس کی توجہ ان میں سے چند کرداروں اور یا صرف ایک کردار پر ہوتی ہے۔

ای۔ایم فارسٹر کے مطابق کردار دو طرح کے ہوتے ہیں : (۱) فلیٹ کردار (۲) راونڈ کردار

فلیٹ کردار وہ ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔شروع سے آخر تک ان کے رویے، اعمال وافعال ایک جیسے ہوتے ہیں۔فنی اعتبار سے سپاٹ و جامد کردار معیوب سمجھے جاتے ہیں اور اس کے مقابلے راونڈ یعنی متحرک کرداروں والے افسانے بہتر قرار دیئے جاتے ہیں۔راؤنڈ کرداروں کے رویے حالات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔وہ قاری کو اپنے نظریات وخیالات سے متاثر کرتے ہیں۔افسانہ کا کینوس محدود ہونے کے باوجود، افسانہ نگاروں نے بہت سے ایسے لافانی کردار تخلیق کئے ہیں جن کے انمٹ نقوش اب تک ذہن میں موجود ہیں۔ مثلاً ٹوبہ ٹیک سنگھ،تنویر فاطمہ (پت جھڑ کی آواز) وغیرہ راؤنڈ کردار کے بہترین نمونے ہیں۔بعض جامد کردار کبھی ایسے ہیں جوافسانوی دنیا میں بے حد مقبول ہوئے۔مثلاً کالو بھنگی، بابو گوپی ناتھ، لاجونتی، گھیسو مادھو وغیرہ۔

افسانے کی صنف ہر دور میں تبدیلیوں سے دوچار ہوتی رہی۔تقسیم کے بعد جدیدیت کے دور میں معاشرتی حالات کے نشیب وفراز کے پیش نظر افسانہ نگاروں نے ایسی کہانیاں لکھیں جن میں جسمانی وجود رکھنے والے کردار غائب ہوگئے۔اس عرصہ میں کردار کے قدوقامت، ناک نقشہ اور چال ڈھال کے بیان کے بجائے ان کی تصویر کا ایک ایسا رخ پیش کیا گیا جو پراسرار اور دھندلی ہوتی تھی۔یہاں تک کہ ناموں کے بجائے ان کے لئے ضمائر کا استعمال ہوا یا پھر وہ اپنی کسی ذاتی عادت یا کسی حلیے سے پہچانے جاتے تھے۔مثلاً ''وہ'' (بلراج مینرا) باریش آدمی' تھیلے والا آدمی (انتظار حسین)، الف، ب (رشید امجد) وغیرہ۔ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کی رائے بھی درست ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ :

> ''ہمارے نئے افسانے نگار اپنی کہانیوں میں مثالی یادگار یا ایسے کردار پیش نہیں
> کر پارہے ہیں جو ہمارے ذہن ودماغ پر اپنا دیرپا اور مثبت اثر چھوڑ سکیں۔''

غرض کردار نگاری افسانے کی جان ہے۔افسانہ نگار جتنا کامیاب کردار نگار ہوگا،نفسیات انسانی کا جتنا ماہر ہوگا، اتنا ہی اچھا افسانہ پیش کر سکے گا۔انسانی توجہ کو برانگیختہ کرنے کے لئے کردار جتنا کارآمد ہے۔واقعہ اتنا کارآمد نہیں ہوتا۔

نقطہ نظر :

ہر فنکار کوئی خاص نقطہ نظر رکھتا ہے اور اس نقطہ نظر کی پیشکش کے لئے ہی فنکار اپنی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔مثلاً پچھڑے ہوئے طبقے کی خراب وخستہ مالی حالت نے پریم چند کو رنج پہنچایا اور انھوں نے افسانہ 'کفن' لکھا۔مولوی نذیر احمد نے محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی نقل نہیں کرنی چاہئے ایسا نقطہ نظر انھوں نے ناول ''ابن الوقت'' میں پیش کیا۔ایک ہی زمانے میں لکھنے والے فنکاروں کا موضوع تو یکساں ہوسکتا ہے تاہم ہر ایک کا نقطہ نظر مختلف ہوگا۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ فنکاروں میں کرشن چند، بیدی، احمد ندیم قاسم، بلونت سنگھ وغیرہ نے مزدوروں، مظلوموں و محنت کشوں کے مسائل کو موضوع بنایا، مگر ان میں ہر ایک کا نقطہ نظر مختلف تھا۔ جس طرح زندگی ہر قدم پر ایک نئے تلخ تجربے سے آشنا کرتی ہے اسی طرح مصنف کا نقطہ نظر بھی ہر افسانے میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں نقادوں کا کہنا ہے کہ نقطہ نظر کا واضح ہوجانا افسانہ کا عیب ہے۔ جس افسانہ میں مصنف کا نقطہ نظر بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ اس کی فنی حیثیت معدوم ہوجاتی ہے۔ ایک خاص زمانے میں مقبول ہونے کے بعد اُس کا تاثر ختم ہوجاتا ہے لیکن نقطہ نظر اتنا مبہم بھی نہ ہو کہ متن کی تعبیر وتشریح میں رکاوٹ بن جائے، معانی کے امکانات کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مرکزی خیال ایسا ہو کہ قاری کو اشارہ مل جائے تاکہ فن پارے کی تفہیم بہتر طریقہ سے ہوسکے۔ بنیادی طور پر ہر افسانوی تخلیق مصنف کی شخصیت تاثرات وخیالات اور نظریات کا پرتو ہوتی ہے لیکن فنکار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ فن پارے کو ذاتی پسند وناپسند کا نمونہ نہ بننے دے بلکہ فنی وسیلوں کی کارفرمائی سے اسے فطری اظہار سے قریب کردے اور حیات وکائنات کے مسائل سے وابستہ کردے۔

ماحول اور فضا:

ماحول وفضا افسانے کے ضروری عناصر قرار دیئے جاتے ہیں۔ یہ پلاٹ اور کردار کی ایسی درمیانی کڑیاں ہیں جو تمام واقعات کے تانوں بانوں کو جوڑتی ہے۔ ماحول کے تحت کہانی کے گردوپیش کے مناظر، مقام کی جغرافیائی خصوصیات، مکان کے سازوسامان آتے ہیں۔ سناٹا نیز رات کی تاریکی سے خوف کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ چمن، سبزہ زار اور چاندنی رات پُرمسرت ماحول کو جنم دیتے ہیں۔ کہانی کا ماحول وقت کی گردش کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کی تصویرکشی سے ماحول بنتا ہے لیکن فضا اُس تاثر کو کہیں گے جو ماحول کی تصویرکشی سے دل ودماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسے قبرستان کی ویران تاریک رات کا منظر ماحول میں شمار ہوتا ہے لیکن اس کے تصور سے دل و دماغ پر خوف واداسی طاری ہوتی ہے اُسے فضا کہیں گے۔ فنکار ضرورت کے مطابق غم، خوشی، خوف، حیرت، اداسی کا ماحول پیدا کرتا ہے۔

اسلوب:

اسلوب کے معنی ہیں طرز، ڈھنگ، طریقہ۔ کہانی کا اسلوب یا طرز نگارش کہانی کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ افسانے کا کینوس بہت چھوٹا ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دی جائے۔ ابتدائی دور کی تخلیقات میں داستانوں کے اثر سے فارسی آمیز جملے اور شاعرانہ اندازِ بیان غالب تھا۔لیکن ترقی پسندی کے زمانے میں جو ادب تخلیق کیا گیا اس روزمرہ کی زبان اور سماج کے مسائل کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے لئے سیدھا سادا طرز اختیار کیا گیا۔ اس طرح اردو افسانے میں نیا اسلوب داخل ہوا۔ آزادی کے بعد تقسیم ہند کے المیے نے لوگوں کو منتشر کر دیا تھا۔ ادیبوں کو تہذیبی ورثے کے تقسیم ہو جانے کا احساس سے ہوا اور ان کی شخصیت بھی اس المیہ سے متاثر ہوئی جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں جذباتی ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ افسانے میں تکنیک کی تبدیلی کے ساتھ اسلوب بھی بدلتا گیا۔ شعور کی رو کی تکنیک کے ساتھ منفرد اسلوب افسانوں میں استعمال ہونے لگا۔ اسی طرح جدیدیت کے زمانے میں انسان کی ذاتی تنہائی، شناخت کے فقدان اور باطنی انتشار کو بیان کرنے کے لئے علامتی اسلوب اختیار کیا گیا اور ایسے انداز میں کہانیاں لکھی گئیں جن سے انسان کی ذہنی ونفسیاتی پیچیدگیوں کا اندازہ لگایا جا سکے۔ شعور کی رو میں داخلی خود کلامی کی تکنیک بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس تکنیک میں انسان صیغہ واحد متکلم میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ اردو افسانے میں بیانیہ (Narration) اور روئیدا (Description) دونوں کی اہمیت سے اسلوب متاثر ہوتا ہے۔ افسانے میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کہانی بیان کرنے والا کون ہوتا ہے خود افسانہ نگار یا کوئی تیسرا کردار۔ کہانی بیان کرنے والے کو راوی کہا جاتا ہے۔ یہ راوی عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ واحد غائب اور واحد متکلم۔ اردو میں زیادہ تر کہانیاں واحد غائب راوی کے ذریعہ بیان ہوئی ہیں۔

آغاز واختتام :

آغاز واختتام سے افسانے کی پوری فضا متاثر ہوتی ہے۔ آغاز ایسے پرتجسس اور معنی خیز انداز میں ہو کہ قاری پورا افسانہ پڑھنے پر مجبور ہو۔ جو بھی منظر یا مکالمہ ابتداء میں پیش کرے اس کا تعلق مرکزی خیال سے ہو، جو کہانی میں آنے والے کسی مبہم واقعہ کا یا منظر کا اشاریہ ثابت ہو۔ ابتدائی دور میں عموماً کرداروں کا تعارف پیش کر دیا

جاتا تھا یا کسی رومانی واقعہ کے دلکش و پُر لطف فضا کا بیان ہوتا تھا۔ مگر جدید دور میں طریقۂ کار بدل گئے۔ افسانے کے ابتدائی مناظر صرف لطف اندوزی کے لئے نہیں رہے بلکہ کرداروں کی ذہنی کیفیات یا دوسرے مقصد کو واضح کرنے کے لئے بیان کئے جانے لگے۔

وحدت تاثر:

وحدت تاثر افسانوں کا لازمی جز قرار پایا ہے۔ اس عنصر کو برقرار رکھنے کے لئے افسانہ نگار مختلف حربوں کا سہارا لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے پورے تاثر کے ساتھ افسانے میں نظر آئے اور قاری اُس کو اُسی شدت سے محسوس کرے۔ افسانے میں پیش کیا جانے والا تاثر جس قدر توانا اور مضبوط ہوگا افسانہ اُسی قدر کامیاب ہوگا۔ افسانہ کے ناقد وقار عظیم کا کہنا ہے کہ ''ہر ادب کے جانچنے کا پہلا معیار یہی ہے کہ اس نے انسان کے دل پر اس کے جذبات اور دماغ پر کیا اور کیسا اثر ڈالا؟ اس کی نوعیت کیا ہے اسے مختلف لوگ کس کس نظریے سے دیکھتے ہیں۔'' افسانے کی کامیابی اور فنی حسن میں وحدت تاثر کا بڑا عمل دخل ہے۔ بعض افسانے ایسے بھی لکھے گئے ہیں جو متعدد چھوٹے چھوٹے مناظر یا قصوں سے مل کر تیار ہوتے ہیں اور زندگی کے کسی ایک رخ یا پہلو کے بجائے متعدد اور متضاد پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔

صنفِ افسانہ کے ابتدائی دور کے ناقدین نے افسانے کے ان اجزاء کا تعین کیا ہے لیکن آج افسانہ کے رنگ روپ اور ہیئتی ڈھانچے میں نمایاں فرق آچکا ہے۔ جدید افسانہ اپنے ماضی سے بڑا مختلف ہوتا جا رہا ہے اور نت نئے تجربوں سے دوچار ہے۔ آج افسانے نے ساری پابندیوں کو توڑ دیا ہے۔ زندگی کی ساری وسعت اُس میں سمائی ہوئی ہے۔ اب پلاٹ، کردار، وقت اور مقام کی مکمل شکل نظر نہیں آتی۔ اس صنف میں نئے نئے تجربے جاری ہیں۔ تکنیک کی نئی نئی صورتیں سامنے آ رہی ہیں۔ ناقدین اس کی تشریح و تعبیر میں مصروف ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ فسانے کے اجزاء کون کون سے ہیں؟

۲۔ افسانے کے پلاٹ کے متعلق اظہار خیال کیجئے۔

۳۔ افسانہ میں کردار نگاری کی اہمیت واضح کیجئے۔

1.5 افسانے کے موضوعات

ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ دونوں کبھی محسوس اور کبھی غیر محسوس طریقہ سے ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ اردو افسانے کی تاریخ ایک صدی پر محیط ہے۔ اردو افسانے نے ہر دور کے مسائل اور موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ افسانہ نگار اسی سرزمین کے حساس افراد ہوتے ہیں۔ اُن کا مشاہدہ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ سماج اور معاشرے میں رونما ہونے والے بے شمار واقعات و حادثات و حالات پر اُن کی نظر بڑی گہری ہوتی ہے۔ دیہاتوں، شہروں، ہر ریاست، ہر قوم اور ہر مذہب اور ہر طبقہ کے افراد کی زندگی میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کا کمال یہی ہے کہ باریک سے باریک پہلو کا مشاہدہ کرے اور مناسب و موثر لب و لہجہ میں اس طرح پیش کرے کہ قاری کو جھنجھوڑ ڈالے۔ سو سالوں میں ہمارا ملک کئی طرح کے حالات سے دوچار رہا۔ آزادی سے پہلے اور بعد بے شمار مسائل میں ہندوستانی گھرے رہے۔ جاگیردارانہ نظام، آزادی کی جدوجہد، آزادی، تقسیم، فسادات، محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں کے مسائل، طبقاتی تقسیم، صنعتی انقلاب، رشوت خوری، بے ایمانی، بے روزگاری، فرسودہ رسومات، خاندانی مسائل، غرض یہ کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بھرپور عکاسی اردو افسانوں میں نظر آتی ہے۔ زندگی کا ہر پہلو افسانہ کا موضوع ہے۔ افسانہ زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ افسانہ اپنی ہی زندگی کی روداد معلوم ہوتا ہے۔ افسانہ عصری زندگی کے مسائل، داخلی و خارجی عمل ورد عمل، ذہنی و جذباتی کیفیات کے برجستہ و بے ساختہ اظہار اور تحلیل نفسی کا ایسا وسیلہ بن گیا کہ جلد ہی افسانہ کو قبول عام کی سند مل گئی۔ عصری زندگی کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کا کام افسانے سے لیا جانے لگا۔ جس کی ہیئت میں ایسی لچک ہے کہ وہ زندگی کے بہتے ہوئے دھارے کو آسانی سے اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔ ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں افسانہ زندگی سے زیادہ قریب ہے جس کے آئینہ میں عصری زندگی کے نشیب و فراز انفرادی و اجتماعی زندگی کے مسائل، ذہنی و جذباتی کیفیات، سیاسی و معاشی اور سماجی رویوں اور تحریکات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ابتدائی دور کے افسانوں میں جاگیردارانہ نظام فکر سے گریز کا موضوع ملتا ہے۔ برطانوی سامراج کی غلامی سے نجات پانے کی خواہش کو فضیلت حاصل ہے۔ پریم چند کا افسانہ دنیا کا انمول رتن، عشق دنیا اور حب وطن ایسے افسانے ہیں جن میں حب الوطنی کے جذبات اور آزادی کی خواہش کو موضوع بنایا ہے۔ پریم چند کے افسانے حب الوطنی، جذبۂ آزادی، اخلاقی اقدار اور سپاہیانہ اوصاف کو بیدار کرنے کا وسیلہ ہیں۔ پریم چند اور اُن کے ہم عصر افسانہ نگاروں کا موضوع راجپوتوں کی تہذیب و معاشرت و حریت پسندی بھی ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کے افسانے کا ایک اہم موضوع تعلیم نسواں، اصلاح معاشرت اور مرد اور عورت کے رشتوں کی نئی تفہیم بھی رہا ہے۔ اردو کے رومانی اور اصلاحی افسانوں میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری فرسودہ رسم و رواج کے موضوع پر افسانے لکھے۔ سجاد حیدر یلدرم کے زیر اثر مجنوں گورکھپوری، ل۔ احمد اور حجاب امتیاز علی نے حسن و عشق، مرد اور عورت کے رشتوں کو افسانوں کا موضوع بنایا۔ سماجی اور معاشرتی زندگی کے مسائل، مشترکہ خاندان کی روایت، بوڑھوں اور بیواؤں کے مسائل، محبت، فرض اور انصاف ،تقاضوں کے علاوہ روشن خیالی اور خوشگوار ازدواجی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کو ہر حساس فنکار نے موضوع بنایا۔ اس دور میں سیاسی افسانے بھی لکھے گئے۔ سیاسی موضوعات کا احاطہ کیا گیا۔ افسانوں میں برطانوی سامراج اور ان کے حواری طبقہ کی فکر و نظر کے تضاد، اخلاق اور قومی اقدار کے زوال کو پیش کیا گیا۔ اسی طرح تحریک آزادی کے پس منظر میں عوامی زندگی، ان کی خدمت و قربانی، آزادی کی اڈتی، ابھرتی لہروں، احتجاجی رویوں اور عدم تعاون وغیرہ کا عکس بھی افسانوں میں نظر آتا ہے۔ اس دور کے تعلیم یافتہ نوجوان معاشی ابتری اور بیروزگاری کا شکار تھے اور سماجی و معاشرتی مساوات پر یقین رکھتے تھے اس لئے ان کا نشانہ انگریز حکام کم اور وہ ذخیرہ اندوز، سودخور ساہوکار اور سرمایہ دار کے خلاف تھے جنھوں نے عوام کے معاشی استحصال کو اپنا پیشہ بنایا تھا۔ افسانہ تخلیق کاروں نے ان ہی نوجوان طبقہ اور ان کی نفسیات و نظریات اور اسباب و نتائج کو موضوع بنایا ہے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی اور جمہوری شعور کے فروغ کا ایک لازمی نتیجہ کسان و مزدور اور پسماندہ طبقوں کی اہمیت و افادیت کا احساس بھی تھا۔ یہی وہ احساس تھا جس نے ہندوستان کے ادیب و فنکاروں کو مزدور و کسان اور پسماندہ طبقہ کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنانے کے لئے مجبور کیا۔ اس دور میں زراعت ہی آمدنی کا وسیلہ تھا۔ کسان اور سرکار کے درمیان نئے دلال زمیندار طبقہ کی وجہ سے دیہی معاشرے کو روز بہ روز نئے مسائل اور نئے انداز تصادم سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ پریم چند اور اُن کے ہم عصروں کے افسانوں کا موضوع ہی استحصال زدہ دیہی معاشرہ ہے۔ ان افسانوں میں انھوں نے نہ صرف شہر اور گاؤں کے درمیان رشتوں پر روشنی ڈالی ہے بلکہ دیہی معاشرے کی زندگی، تہذیب معاشرت، مسائل اور نفسیات کے نقوش ابھارے ہیں۔ یہ افسانے اچھوت ہریجن اور پسماندہ طبقوں کے مسائل و مصائب اور زندگی کی تصویر کشی کے ذریعہ عام سماج کے شعور کو بیدار کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں اردو افسانے کا موضوع وہ نیا شہری سماج بھی رہا ہے جس نے سیاسی و معاشی نظام کے بطن سے جنم لیا تھا۔ یہ نیا شہری سماج کئی اعتبار سے اس فرسودہ سماج سے مختلف تھا جس نے انسانوں کو

اعلیٰ وادنیٰ کے درمیان تقسیم کر کے ان کے مابین روایات، تصورات اور توہمات کی دیواریں بلند کر دی تھیں۔ افسانہ نگاروں نے برسراقتدار طبقے کے حلقہ بگوش راجاؤں، نوابوں اور جاگیرداروں کی حکام پرستی، عوام دشمنی، عیش کوشی، لایعنی مشاغل اور بے جا نام ونمود وغیرہ کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ بیسویں صدی کے اردو افسانے کا سب سے اہم موضوع وہ نوزائیدہ متوسط طبقہ تھا جس نے نئے سیاسی ومعاشی نظام کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور جو حکومت وعوام، صنعت کار وصارفین، طبقہ ادنی واعلیٰ کے درمیان رابطہ کی کڑی ہونے کی وجہ سے سماج میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان افسانوں میں متوسط طبقہ کی نفسیات ان کی ذہنی وجذباتی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے۔ نئے سیاسی ومعاشی نظام اور صنعتی معیشت کے اثرات انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہندوستانی سماج پر واضح طور پر نظر آنے لگے تھے جس کا نتیجہ معاشی بدحالی، سرمایہ دارانہ ذہنیت، سودخوری، رشوت ستانی اور اخلاقی زوال وغیرہ کی شکل میں برآمد ہوا، جس کے واضح نقوش اردو افسانے میں نظر آتے ہیں۔

۱۹۳۶ء سے قبل انسانوں میں موضوعات کا دائرہ اگرچہ خاصہ وسیع ہے اس میں جہاں سماج کے مختلف پہلوؤں، نئے سیاسی ومعاشی نظام کے زیر اثر ظہور میں آنے والے طبقات، تبدیلیوں اور تضادات کو موضوع بنایا ہے۔ وہاں اس نے افسانے میں تحلیل نفسی اور سماجی حقیقت نگاری کی مستحکم روایت بھی قائم کی ہے۔ ان میں اصلاح و اخلاق کا پہلو بھی نمایاں ہے۔

اردو افسانے میں نمایاں تبدیلی ''انگارے'' کی اشاعت (۱۹۳۵ء) اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام (۱۹۳۶ء) کے بعد نظر آتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو افسانے میں نہ صرف فکر واظہار، موضوع ومواد تکنیک وہیت کی سطح پر نئے تجربے کئے گئے بلکہ اس نے بے ریا حقیقت نگاری اور تحلیل نفسی کے ذریعہ ان بنیادی مسائل، داخلی وخارجی اسباب ومحرکات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی جو فرد اور سماج کی زندگی میں مرکز ومحور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ عام سماجی پستی، غربت افلاس، بھوک بیماری، جہالت، بیروزگاری، مایوسی، محرومی، استحصال پسندی، طبقہ نسواں کی زبوں حالی، توہمات تعصّبات سے پیدا ہونے والے مسائل اور موضوعات تھے جس کا عکس اُس دور کے ہر افسانہ نگار کے یہاں نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند افسانے کا ایک اہم موضوع عورت، طوائف، جنسی استحصال یا جنس زدگی بھی رہا ہے۔ طبقہ نسواں کے بارے میں ترقی پسند افسانے کا ابتداء ہی سے ایک مخصوص اور ہمدردانہ رویہ رہا ہے۔ ان افسانوں میں جاگیردارانہ تصورت، رسم ورواج پر طنز وتنقید کا نشانہ بنایا ہے جو طبقہ نسواں کی آزادی، مساوات، خوداعتمادی اور خودکفالتی کی راہ میں حائل رہے ہیں۔

موضوعات کے اعتبار سے ترقی پسند افسانے کا دائرہ اتنا وسیع رہا ہے کہ اس کے آئینہ میں نہ صرف انفرادی و اجتماعی مسائل انسانی نفسیات اور سیاسی معاشی نظام کی فتنہ پردازی اور انسان کی ازلی وابدی محرومی و مجبوری کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ ۴۴۔۱۹۴۳ء کا قحطِ بنگال بھی ایک ایسا موضوع تھا جس نے ہندوستان کے ہر حساس انسان کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ یہ قحط سرمایہ دارانہ ذہنیت، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری اور سیاسی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے تھا۔ اردو میں اس موضوع پر متعدد افسانے لکھے گئے۔ افسانوں میں عالمی مسائل، جنگ کی تباہ کاریاں اور عالم انسانیت کے دکھ درد کو موضوع بنایا گیا۔ مثلاً کوریا کے محاذ جنگ سے ایک خط وغیرہ۔

آزادی اگرچہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہے لیکن آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد اپنی جلو میں مسرت و پیغام نہ لا سکا جس کا صدیوں سے انتظار تھا۔ سامراجی اور سرمایہ دار قوتوں کی ریشہ دوانیاں ایسا رنگ لاتیں کہ صدیوں کے دبے کچلے جذبات اپنے اظہار کی سمت نہ پا کر اس طرح بے راہ رو ہو گئے کہ ہندوستانی سماج، آگ، خون، قتل وغارت گری، وحشت و بربریت اور انسانیت سوز مظالم کا اس طرح شکار بن کر رہ گیا کہ زندگی جیسی نعمت وبالِ جان معلوم ہونے لگی۔ فسادات کے موضوع پر متعدد افسانے لکھے گئے۔ جن میں پشاور ایکسپریس، ہم وحشی ہیں، اندھے، لال باغ، ایک طوائف کا خط، تنہائی، محرومی، بے بسی، انسانی رشتوں کی کم مائیگی، بے قدری، خوف، اپنے وجود کے تحفظ کا احساس، جڑوں کی تلاش وغیرہ ایسی بین الاقوامی موضوعات اور مسائل ہیں جن سے اردو افسانہ پہلی مرتبہ دوچار ہوا تھا۔

تقسیم ہند برصغیر میں ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے جس نے ایک انقلاب عظیم برپا کیا۔ تقسیم کی وجہ سے ہجرت کا مسئلہ درپیش آیا۔ لاکھوں افراد نے ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی۔ اس دوران قتل وخون کے ایسے دل دہلا دینے والے واقعات ہوئے کہ برصغیر کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی معیشت مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔ ازسرنو زندگی شروع کرنا، جینے کا وسائل مہیا کرنا، انتہائی دشوار گزار تھا۔ اس موضوع پر حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، کرشن چند، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، رام لعل وغیرہ نے لازوال افسانے قلم بند کئے۔

آزادی کے اردو افسانے کو جس دوسری بڑی سماجی تبدیلی سے دوچار ہونا پڑا وہ جاگیرداری نظام کے باقیات یعنی خاتمہ زمینداری سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس نے نہ صرف پرانے نظام اور وسائل آمدنی سے وابستہ تہذیبی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی اقدار، افکار اور تصوارت پر کاری ضرب لگائی تھی بلکہ وہ علوم ونظریات جو صدیوں کے تجربات

ومشاہدات کا نتیجہ تھے یک قلم باطل قرار پائے۔قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، قاضی عبدالستار نے ان موضوعات پر افسانے تحریر کئے۔

افسانہ نگار اپنی تخلیقات کے توسط سے سوال کرتے ہیں کہ وہ آزادی اور وہ دیش کہاں ہے جس کے لئے ہم مزدوروں، کسانوں اور عوام نے قربانیاں دی تھیں اور برسوں زندگی کے حسین خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے بھوک، بیماری، غربت افلاس اور ظلم سے لڑتے رہتے تھے۔ کرشن چندر کے افسانے میں یہ احتجاجی رویہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آمد و رفت اور خبر رسائی کی جدید سہولتوں کے تحت آبادی کا بڑا حصہ گاؤں چھوڑ کر شہروں کا رخ کرنے لگا۔ ہر لمحہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جانے کا خوف، عدم استحکام، غیر یقینی مستقبل، بے سمتی، بے چہرگی، ان موضوعات کا اظہار نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتا ہے۔ بھاری صنعتوں کے قیام، تعلیم کے فروغ، سائنسی شعور کے ساتھ افسانے کی دنیا بھی بدل گئی۔ مغرب کے زیر اثر اردو افسانہ نگاروں نے علامتوں کے استعمال کو شروع کیا اور نجی علامتیں وضع کر لی، جس کی وجہ سے ان افسانے معمہ یا چیتاں بن گئے۔ اردو افسانے میں علامتوں کے کامیاب اور ناکام استعمال کی دونوں ہی صورتیں نظر آتی ہیں۔

سلام بن رزاق، انور خان، مظہر الزماں خان، شفق، شوکت حیات، حمید سہروردی، انور قمر، بیگ احساس، حسین الحق، طارق چھتاری، احمد عثمانی، نورالحسنین نے بھی علامتی اور تمثیلی افسانے لکھے۔ انور خان نے بے شمار موضوعات پر افسانے لکھے لیکن ان کا پسندیدہ موضوع فرد کی تنہائی کا کرب ہے۔ شفق نے زندگی کے خارجی مظاہر کی روشنی میں فرد کی ذہنی احساسات کو گرفت میں لانے کی کوشش کی۔ شوکت حیات کے افسانے کے موضوعات زندگی سے بھر پور ہیں۔ وہ چاہے ہجرتوں کا مسئلہ، شناخت کا کرب، بھوپال گیس سانحہ ہو، صنعتی انقلاب، ضعیفی کا کرب، ذہنی الجھاؤ، بابری مسجد کی شہادت وغیرہ۔ سلام بن رزاق نے مڈل کلاس طبقے کی زندگیوں کو موضوع بنایا ہے۔ حسین الحق، ملک میں پھیلا انتشار، ناآسودگی، گھٹن، عدم تحفظ کا ماحول، تشکیک کو موضوع بناتے ہیں۔ فسادات کا موضوع جدیدیت کے دور میں بھی جاری رہا۔ عبدالصمد فسادات میں ہونے والے مادی اور جانی نقصانات کے ساتھ ہی ساتھ تہذیبی نقصان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ بیگ احساس نے بربریت، نفرت، عدم تحفظ اور انتشار کو موضوع بنایا ہے۔ انور قمر بنیادی طور پر شہری موضوعات کے افسانہ نگار ہیں اور شہر میں بھی وہ ان افراد کی کہانیاں لکھتے ہیں جو معاشی طور پر کمزور ہیں۔

جہاں تک ان جدید افسانہ نگاروں کے موضوعات کا سوال ہے تو ان میں صنعتی انقلاب کی بو باس بھی ہے، روزی کے مسائل بھی ہیں۔فرد کی تنہائی کا کرب بھی ہے رشتوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی آوازیں بھی ہیں۔ مذہبی استحصال بھی ہے، معاشی اقتصادی گھٹن کے ساتھ ہی ساتھ آسودگیوں کی تلاش اور مصلحت کوشی کا مزاج بھی ہے۔ظاہر و باطن کی اجنبیت بھی ہے،خودغرض کے مکھوٹے بھی ہیں اور قدروں کے ٹوٹنے ، بکھرنے کا غم بھی۔نئ قدروں کا احترام بھی ہے اور جنریشن گیپ کے تصادم سے پیدا ہونے والے مسائل بھی ہیں۔اردو افسانہ ایک صدی سے زیادہ کا سفر طے کر چکا ہے اُس کے موضوعات وہی ہیں جو بدلتی ہوئی زندگی کے موضوعات ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

: ۔ اردو افسانے کے کیا موصوعات ہیں چند سطروں میں لکھئے۔

۲۔ ترقی پسند تحریک سے قبل اردو افسانے کے موضوعات کا جائزہ لیجئے۔

۳۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں کے موضوعات کیا ہیں؟

۴۔ آزادی کے بعد افسانہ کا اہم موضوع کیا تھا؟

۵۔ جدید دور کے افسانہ نگار کون ہیں اور ان کے کیا موضوعات ہیں؟

1.6 خلاصہ

’’افسانہ‘‘ایک نثری صنف ہے۔داستان،ناول اور افسانے میں مماثلت ہوتی ہے اور وہ ہے قصہ پن۔لفظ افسانہ’’افسوں‘‘ سے مشتق ہے۔افسانہ بھی سننے والوں پر جادوئی اثر کرتا ہے۔افسانہ کی تعریف ناقدین نے الگ الگ انداز سے بیان کی ہے۔’’افسانہ وہ نثری تخلیق ہے جس میں اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت ہو اور کسی خاص مرکزی تاثر پر استوار ہونے کے ساتھ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ یا عکس پیش کرے ، اس کی زبان پُرکشش اور اندازِ تحریر انتشار سے پاک ہو۔‘‘افسانہ نثر کی مختصر بیانیہ تحریر ہوتی ہے۔اس میں ایک کردار یا کرداروں کے ذریعہ زندگی کا کوئی ایک واقعہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور پڑھنے والا اس کا ایک تاثر قبول کرتا ہے۔مختلف اجزاء یا عناصر سے مل کر افسانہ وجود میں آتا ہے۔ پلاٹ،کردار،ماحول،فضا،وحدت تاثر،موضوع اور اسلوب جیسے عناصر

اس کی تشکیل میں مددگار ہوتے ہیں۔ واقعات کی فنی ترتیب کو پلاٹ کہتے ہیں۔ پلاٹ ایک خاکہ ہوتا ہے اس میں کرداروں کے عمل اوران کے مکالموں، مناظر، فضا اور ماحول کے ساتھ افسانہ نگار کے نقطہ نظر کے مطابق رنگ بھرا جاتا ہے۔ کردار وہ اشخاص ہوتے ہیں جن کی حرکات وسکنات اور گفتگو سے قصہ آگے بڑھتا ہے۔ ہر فنکار اپنے نقطہ نظر سے قصہ اور کرداروں کا انتخاب کرتا ہے۔ ماحول اور فضا کی عکاسی بھی کہانی پیش کرنے میں اہم ہوتی ہے۔ خوب صورت مناظر سے پڑھنے والا راحت اور خوشی محسوس کرتا ہے۔ کہانی سنانے اور لکھنے کا طرز تحریر اسلوب کہلاتا ہے۔ اسلوب جتنا پُرتاثر ہوگا افسانہ اُتنا ہی کامیاب کہلائے گا۔ پورا افسانہ پڑھنے کے بعد قاری پر ایک تاثر قائم ہوتا ہے۔

اردو میں افسانہ نگاری کی تاریخ ایک صدی کا احاطہ کرتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم سے لے کر آج تک کئی افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے موضوعات اور تکنیک سے افسانے تحریر کئے ہیں۔ اس صنف میں مختلف تجربے ہوئے اور آج بھی جاری ہے۔ اردو افسانہ میں زندگی کے تمام مسائل اور موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ جاگیردارانہ نظام، آزادی کی جدوجہد، برطانوی حکومت، آزادی، تقسیم ملک، فسادات، محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں کے مسائل، طبقاتی تقسیم، بے روزگاری، رشوت خوری، بے ایمانی، اخلاقی گراوٹ، فرسودہ رسومات، خاندانی مسائل، غرض یہ کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بھرپور عکاسی اردو افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگار پریم چند، کرشن چند، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر کی خدمات لائق ستائش ہے۔ دورِ جدید کے افسانہ نگار بھی اس صنف کی آبیاری کر رہے ہیں۔

1.7 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ افسانہ کی جامع تعریف بیان کیجئے۔

۲۔ افسانہ کی اہم خصوصیات تحریر کیجئے۔

۳۔ افسانے کے اہم جز پلاٹ کے بارے میں مختصراً تحریر کیجئے۔

۴۔ کردار نگاری افسانہ میں کیوں ضروری ہے؟

۵۔ افسانے میں ''اسلوب'' کی کیا اہمیت ہے، تحریر کیجئے۔

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ افسانہ میں آزادی ہند، تقسیم ملک اور فسادات ان موضوعات پر اپنی رائے تحریر کیجیے۔

۲۔ ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں کے موضوعات کا جائزہ لیجیے۔

۳۔ افسانے کے اجزاء کون سے ہیں؟ مفصل نوٹ لکھیے۔

1.8 فرہنگ

فنون	فن کی جمع
المیہ تحریر	ایسی تحریر جس کے مطالعے سے غم اور درد کا تاثر پیدا ہو
فنہن	
مؤثر	اثر کرنے والا
شعور کی رو	افسانہ لکھنے کی ایک تکنیک
تخلیق	خلق کیا ہوا/ پیدا کیا گیا/ بنایا گیا/تشکیل دیا گیا
استحصال	مجبوری کا فائدہ اٹھا کر سخت رویہ اپنانا
تخلیق کار	لکھنے والا
توہم پرستی	وہم۔ کسی کام یا واقعہ کو بدشگونی یا منحوس سمجھنا
باشعور	سمجھدار
تغیرات	تبدیلیاں
تعصّبات	تعصب کرنا، حسد، جلن
مافوق الفطر تفطرت کے خلاف	جیسے پری، بھوت
انفرادی	ایک فرد/ ایک شخص

اجتماعی	ایک سے زیادہ افراد کا
اختصار	مختصر
ابہام	مبہم کی جمع، غیر واضح
متعین کرنا	طے کرنا
تفہیم	سمجھنا

1.9 معاون کتابیں

اردو افسانہ فکری و فنی مباحث	عظیم الشان صدیقی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۰ء
اردو افسانہ فن، ہنر اور متنی تجزیہ	ڈاکٹر اقبال آفاقی	فکشن ہاؤس۔ حیدرآباد ۲۰۱۲ء
اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل	پروفیسر گوپی چند نارنگ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۰ء
اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل	پروفیسر صغیر افراہیم	ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۲۰۰۹ء
اردو فکشن کی تنقید	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	تخلیق کار پبلشرز۔ دہلی ۱۹۹۶ء
اردو فکشن تفہیم، تعبیر اور تنقید	شہناز رحمن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی ۲۰۰۱۶ء
اردو نثر کا فنی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء
تاریخ ادب اردو	نور الحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۲۰۰۱ء
تقسیم ہند کے اثرات اردو افسانے پر	قمر النساء بیگم	اسلامک پبلشرز نئی دہلی ۲۰۱۳ء
فن افسانہ نگاری	سید وقار عظیم	اعتقاد پبلشنگ ہاوس دہلی ۱۹۷۷ء

☆☆☆

اکائی۔ 2: اردو افسانے کا آغاز و ارتقا

ساخت:

2.1 اغراض و مقاصد

2.2 تمہید

2.3 افسانے کی تعریف

2.4 اردو افسانے کی ابتدا تا 1936

2.5 ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ

2.6 جدیدیت اور اردو افسانہ

2.7 مابعد جدید اردو افسانہ اور موجودہ صورتِ حال

2.8 خلاصہ

2.9 نمونہ امتحانی سوالات

2.10 فرہنگ

2.11 معاون کتابیں

2.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ:

۔اردو افسانے کے آغاز و ارتقا پر سیر حاصل گفتگو کر سکیں گے۔

۔اردو افسانہ اور ترقی پسند تحریک کے باہمی رشتے پر معلومات حاصل کر سکیں گے۔

۔اردو افسانے پر جدیدیت کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔

۔مابعد جدید افسانہ اور موجودہ صورتِ حال پر اپنی رائے قائم کر سکیں گے۔

2.2 تمہید

افسانہ ادب کی نثری صنف ہے۔افسانے کو کہانی بھی کہا جاتا ہے۔دراصل افسانہ ایک ایسا قصہ ہوتا ہے کہ جس میں زندگی کے کسی اہم پہلو یا ایک واقعہ کو اختصار اور دلچسپ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔اس میں وحدت اور تاثر کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔افسانے میں انسانی زندگی کے تجربات،احساسات کو فنی پیرائے میں دلچسپ بنا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ قاری اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکے۔یعنی افسانہ زندگی کے تمام عوامل اور نشیب وفراز کو نثری تخلیق کی شکل میں پیش کرتا ہے۔اس میں بیانیہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔یہ نثر کی مقبول ترین صنف ہے۔جس طرح انسانی زندگی کے مزاج میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں،اسی طرح اس صنف کے مزاج میں بھی حرکیاتی پہلو نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔افسانہ فن کار کے تخیلات مشاہدات اور تجربات سے روشناس کرانے کا ایک مستحکم ذریعہ ہے۔افسانہ کم سے کم وقت میں قاری کے ذہن کو جس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

2.3 افسانے کی تعریف

افسانے پر سیر حاصل گفتگو کرنے سے پہلے اس کے معنی مفہوم اور اربابِ ادب کی پیش کردہ تعریف کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔امریکی فکشن نگار ایڈ گر ایلن پو کے مطابق:

> افسانہ ایک ایسی بیانیہ صنفِ نثر ہے جو اتنی مختصر ہو کہ ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے،جسے قاری کو متاثر کرنے کے لئے لکھا گیا ہو اور جس سے وہ تمام غیر ضروری اجزا نکال دیئے گئے ہوں جو تاثر کو قائم رکھنے میں معاون نہ ہوں۔اس میں وحدت تاثر اور کلیت (Totality) ہو۔

(The Readers Companion to World Literature p.415)

اسی طرح The Modern Short Stories میں H.E.Bates رقم طراز ہیں:

> مختصر افسانہ بادل کی طرح ہے جو ہر لمحہ اپنی ہیئت بدلتا رہتا ہے یعنی جس طرح بادل کی کوئی شکل نہیں ہوتی،اسی طرح افسانہ نگار کے ذریعے افسانہ کی شکل یعنی ہیئت بدلتی رہتی ہے۔

افسانوی ادب کے ابتدائی دور کے تنقید نگار وقار عظیم کے نزدیک:

> افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا، کسی ایک واقعے، ایک جذبے، ایک احساس ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو، افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے، جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔
>
> (داستان سے افسانے تک ص۔22)

اسی طرح ڈاکٹر مسیح الزماں افسانے کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

> افسانہ زندگی کی تفسیر ہے۔ اس میں زندگی کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا جاتا ہے جس پر حقیقت کا دھوکا ہو سکے۔ وہ زندگی کی تعبیر بھی ہے اور تصویر بھی اور اسی کے ساتھ میں (افسانہ) میں مصنف کا ایک نقطۂ نظر بھی ہونا ضروری ہے۔
>
> (معیارِ میزان، ص۔24)

مندرجہ بالا مغربی اور مشرقی اربابِ ادب کی افسانہ سے متعلق پیش کردہ تعریفوں کی روشنی میں یہ عندیہ ملتا ہے کہ ہر افسانہ تخلیق کار کی تخلیقی اور فنی حسیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اس میں کسی واقعے اور کردار کے ذریعے انفرادی طور پر زندگی میں پیش آنے والے حادثات اور اس سے متعلق عوامل کے ساتھ ساتھ زندگی کے کسی خاص پہلو کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس میں وحدت اور تاثر کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں افسانہ نگار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایجاز و اختصار کے ساتھ فنی چابک دستی سے کسی نقطہ نظر کو اپنے خیالات و تصورات کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔

2.4 اردو افسانے کی ابتدا تا 1936

اردو افسانے کے آغاز و ارتقا پر اگر غور کیا جائے تو اس کے ابتدائی نقوش ہماری داستانوں میں جس طرح قصوں کی فراوانی ہے۔ ان سے افسانے کی کیفیت اجاگر ہوتی ہے۔ ان قصوں کو افسانوں سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ افسانے سے قریب ضرور ہیں۔ ان میں افسانے کی منظر نگاری جیسی خصوصیت کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے

۔افسانے کا باضابطہ آغاز انیسویں صدی کے اواخر میں محمد حسین آزاد ،فیض الحسن، پیارے لال، آشوب عبد الحلیم شرر،شیو برت لال ورمن، اور خواجہ حسن نظامی کی تخلیقات جو انشائیہ نگاری کے زمرے میں شامل ہیں، ان میں دیکھا جاسکتا ہے۔تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ افسانے کی ابتدا بیسویں صدی کے اوئل میں ہوئی ۔اردو کا پہلا طبعزاد افسانہ علامہ راشد الخیری کا نصیر اور خدیجہ تسلیم کیا جاتا ہے جو لاہور سے شائع ہونے والے رسالے مخزن میں دسمبر 1903 کو منظرِ عام پر آیا۔ یہ افسانہ بڑی بہن کے چھوٹے بھائی کے لئے پند ونصائح پر مشتمل خط کی شکل میں نظر آتا ہے اور اس میں اس کے لئے یہ پیغام پوشیدہ ہے کہ وہ اپنی مرحومہ بہن کے مصیبت زدہ بچوں کی کفالت میں ان کی مدد کرے۔اس عہد کے دیگر افسانہ نگاروں میں نگار علی محمود، وزارت حسین اورینی ،حکیم یوسف حسن ،سجاد حیدر یلدرم،، سلطان حیدر جوش، پریم چند اور سدرشن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔ان سب کی ابتدائی تخلیقات نہایت سلیس اور سادگی سے پر دکھائی دیتی ہیں جن میں مشرقی تہذیبی اقدار وروایات اور ان سے متعلق اخلاقی پیغامات کی عکاسی ہوتی ہے نیز ان میں وطن پرستی جیسے موضوعات پر گفتگو شامل ہے۔ان کے اسلوب میں رومانویت اور مرصع زبان کی خوبی دیکھی جاسکتی ہے ۔ پلاٹ اور کرداروں کو نہایت منظم انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ان میں واقعات کی پیش کش کچھ اس طرح ہے کہ افسانہ نگار قاری کو ساحرانہ انداز میں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے یعنی اسے قاری کا اعتماد بآسانی حاصل ہوجاتا ہے۔

اردو افسانے کے آغاز وارتقا میں پریم چند کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔انہوں نے شعوری طور پر سماجی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان کا حل تلاش کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی۔انہوں نے ادب برائے زندگی کے زاویے کے تحت معاشرتی مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔وہ اتر پردیش کے زمینی مسائل اور حقائق سے بخوبی واقف تھے۔کیونکہ انہوں نے وہاں دیہاتوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ دیہاتوں میں ہی گزارا تھا۔ یہاں کے لوگوں کے وہ درد آشنا تھے۔ 1907 میں ان کا افسانوی مجموعہ سوزِ وطن منظرِ عام پر آیا۔اس کا طرزِ بیان اس وقت مروجہ اسلوب سے جداگانہ تھا۔اس میں روایتی داستان کی جھلک ہونے کے باوجود وطن پرستی سے مملو جذبات واحساسات کی کیفیت بالکل مختلف ہے۔ان کے افسانوں میں بڑے گھر کی بیٹی ،نمک کا داروغہ، بوڑھی کاکی،، عیدگاہ، پنچایت، حج اکبر ،نئی بیوی ،نئی بیوی ،نجات ،شطرنج کی بازی اور کفن جیسے افسانے ان کے سماجی شعور اور حقیقت نگاری کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں تاہم بعض اوقات ان کے یہاں اصلاحی پہلو حاوی نظر آتا ہے مگر ان کا فن قاری کو مکمل طور پر اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ان کے کردار بالکل فطری ہیں بالخصوص کفن کی کردار نگاری جس نقطہ عروج کی حامل ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پریم چند ایسے افسانہ نگار ہیں

جنھوں نے ملکی مسائل پر سب سے پہلے توجہ دی۔ اس سے پیش تر سجاد حیدر یلدرم نے ترکی افسانوں سے استفادہ کرتے ہوئے داستان کے اثرات سے آزاد کرانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس کے پہلو بہ پہلو راشد الخیری ،سلطان حیدر جوش ،سدرشن،اعظم کریوی،علی عباس حسینی ،حکیم یوسف حسن، حامداللہ افسر وغیرہ پریم چند کی طرح کسانوں ،مزدوروں،اور کمزور طبقوں کے موضوعات کو اپنے افسانوں کا موضوعِ گفتگو بنا رہے تھے۔ ان سبھی تخلیق کاروں نے سرمایہ داروں اور زمینداروں کے ذریعہ روا استحصال کی روش کے خلاف آواز اٹھائی۔ اسی لئے ان کا شمار اصلاح پسنی اور حقیقت نگاری پر طبع آزمائی کرنے والوں میں ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ علامہ راشد الخیری کا افسانہ نصیر اور خدیجہ اردو ادب میں پہلا افسانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی ادبی تخلیقات کا آغاز 1898 سے ہوتا ہے ان کے افسانوں میں فسانہ تنویر، مظلوم بیوی کا پاک جذبہ، محروم وراثت ،ولایتی ننھی، ویڈیا کی سرگذشت قابلِ ذکر ہیں۔ افسانے کی ابتدا میں ان کا کردا نہایت اہم ہے۔ مجموعی طور پر ان کے افسانے اصلاحِ معاشرہ اور اخلاقی پیغام کے آئینہ دار ہیں۔ وہ اسلامی نقطہ نظر کے تحت سماج کے درد کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دور میں پریم چند کے ساتھ ساتھ سدرشن نے ہندوستان کے متوسط طبقے کے مسائل کی عکاسی کی اور ہندو سماج کی مروجہ برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کے افسانوں میں شاعر، مصور ایک نامکمل کہانی، گورومنتر اور باپ اس ضمن میں قابلِ غور ہیں۔ پرم چن نے دیہی زندگی پر قلم اٹھایا اور سدرشن نے شہری متوسط طبقے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ پریم چند کے ہم قدم افسانہ نگاروں میں عبداللہ حسینی کا نام نہایت اہم ہے۔ انہوں نے سماجی حقیقت نگاری کے زاویہ نگاہ میں وسعت پیدا کی۔ ان کے افسانے انسانی نفسیاتی کیفیت پر مشتمل بہترین افسانے ہیں۔ نور ونار، آئی سی ایس اور باسی پھول وغیرہ ان کے اہم افسانے تعبیر کئے جاتے ہیں۔ علی عباس حسینی کے یہاں بھی اصلاحی جذبے کی کارفرمائی ملتی ہے تاہم یہ حقیقت منکشف نہیں ہو پاتی ہے کہ اس کے پسِ پشت کون سے عوامل تھے جس کے سبب ان کا طبعی میلان ان موضوعات کی طرف مائل ہوا۔ بعد ازاں ان کا ترقی پسند نقطہ نظر بڑی آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ پریم چند کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں اعظم کریوی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کے افسانوں میں بگلا بھگت، گناہ کی گٹھری، مایا، دکھیا اور لاج خاصے اہم ہیں۔ حالانکہ حقیقت نگاری ان کے افسانوں کی بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے تاہم ان کے افسانے قارئین پر وہ تاثر پیدا نہیں کر سکے جو پریم چند علی عباس حسینی اور سدرشن کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ان تخلیق کاروں کی فہرست میں نیاز فتح پوری ،مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی، حکیم احمد شجاع، ایم سلیم، امتیاز علی تاج، نذر سجاد حیدر، سید عابد علی عابد نے رومان پرور فضا اور محبت کے حسین جذبات اور دلفریب فضاؤں کو موضوعِ گفتگو بنایا۔ ادبِ لطیف کی نمائندگی کرنے والوں میں نیاز

فتح پوری کا نام نہایت اہم ہے۔تخیل کی پرواز ورشعری طرزِ بیان ان کے افسانوں کا وصف ہے۔وہ اپنے فن میں رومانوی اور تاثراتی فضا کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔وہ سماجی حقیقت نگاری کو ان کے افسانوں کی خوبی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔نگارستان ، جمالستان، شبنمستان ان کے افسانوی مجموعے ہیں جن سے ان کے رومانوی جمال پرستی اور تاثراتی نقطہ نظر کی عکاسی ہوتی ہے۔

اسی عہد میں تاثراتی تخلیق کار اور تنقید نگار کی حیثیت سے مجنوں گورکھپوری کا نام قابلِ ذکر ہے۔مغربی ادبیات پر ان کی گہری نظر رہی ہے۔شکست بے صدا، خواب وخیال ، بے گانہ، سمن پوش اور تم میرے ہو ان کے معروف افسانے ہیں۔وہ ادبِ لطیف میں سجاد حیدر یلدرم ایک نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں ان کے افسانے یا تو ماخوذ ہیں یا ترکی زبان سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔خیالستان وگلستان، سودائے سنگین، چڑیا چڑے کی کہانی صحبت ناجنس ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

حجاب اسماعیل جو بعد میں حجاب امتیاز علی تاج کے نام سے مشہور ہوئیں۔وہ مغربی رومانویت سے متاثر نظر آتی ہیں ان کے افسانوں میں پراسرار فضا اور سناٹا پایا جاتا ہے۔میری ناتمام محبت ان کا اہم افسانہ ہے۔ترقی پسند نقط نظر کی ابتدا سے پہلے ردو افسانے میں بغاوت کی آواز اس وقت شروع ہوئی کہ جب رشید جہاں کا افسانوی مجموعہ انگارے کی شکل میں 1932 میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔اسے ترقی پسند تحریک کی خاموش پیش بندی قرار دیا جا سکتا ہے اس میں شامل نو افسانوں نے پوری ادبی دنیا میں انقلاب کی کیفیت پیدا کر دی۔تخلیق کاروں کا زاویہ نگاہ یکسر تبدیل ہو گیا اب وہ نئے طرزِ فکر کے تحت افسانوی ادب کی دنیا تعمیر کرنے لگے۔اس عہد کے منظرنامے کا اگر مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ 1914 تا1919 پہلی عالمی جنگ انقلابِ روس اکتوبر 1917 کے بعد انسانی افکار وخیالات میں جس طرح تبدیلی رونما ہوئی اور عوامی حلقوں میں محکومی کے کلاف ایک جذبہ بیدار ہو گیا۔اسی دور میں جرمنی میں ہٹلر کی آمریت کے سے بڑھتے ہوئے ظالمانہ رویے نے دانش مند طبقے کو نئی فہم کی طرف مائل کیا ۔چنانچہ وہ فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرات کے پیشِ نظر متحد ہو کر اپنے شدید ردِعمل کا بآوازِ بلند اظہار کرنے لگے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

1۔ افسانے کا آغاز وارتقا کب ہوا؟

2۔ کس افسانے کو اردو کا طبع زاد افسانہ کہا جاتا ہے؟

3۔ ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں میں سے چند افسانہ نگاروں کے نام لکھئے۔

2.5 ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ

ترقی پسند تحریک نے ادب کو ادب برائے زندگی کے نظریے سے آشنا کرایا۔نومبر 1935 کو ڈنمار اسٹریٹ لندن میں اس وقت کے اربابِ ادب دانشوران موجودہ صورتِ حال پر غور وفکر کے مقصد سے جمع ہوئے۔ یہ حضرات اس وقت آکسفرڈ، کیمبرج اور پیرس میں زیرِ تعلیم تھے۔انہوں نے اپنے ہم خیالوگوں کی ایک انجمن بنائی۔اس کے تحت ایک منشور شائع کرایا گیا۔دسمبر 1935 میں جب سجاد ظہیر اپنی تعلیم مکمل کر کے الہٰ آباد آ گئے۔اسی اثنٰی میں اردو ہندی ادباء کا ایک اجلاس متوقع تھا۔سجاد ظہیر جو اس انجمن کے سالارِ کارواں تھے انہوں نے ترقی پسند تحریک کے لئے اپنی انتھک کاوشیں انجام دیں۔اپریل 1936 میں لکھنؤ میں ایک کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔اس کی صدارت کے فرائض منشی پریم چند نے انجام دیئے۔ان کے صدارتی خطبے کے اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں:

> مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کے میزان پر تولتا ہوں۔بے شک آرٹ کا مقصد ذوقِ حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔مسرت خود ایک افادی شے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور غم بھی۔آسمان پر چھائی شفق بے شک ایک خوشنما نظارہ ہے لیکن اگر اساڑھ میں آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ خوشی کا باعث نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ابھی تک کا معیار امیرانہ عیش پرورانہ تھا۔ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔انہیں کی قدردانی پر ہر ہستی قائم تھی اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔انہیں وہ انسانیت کے دامن سے خالی سمجھتا تھا۔آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں، زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔

(بحوالہ اردو میں ترقی پسند تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی ص۔43)

اس دور میں دیہی مسائل اور سماج کے تمام زمینی مسائل کو جداگانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ پسماندہ اور متوسط دونوں طبقات کے موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا نیز زمینداروں، تعلق داروں، سرمایہ داروں اور مل مالکوں کے استحصال کو نہایت بے باک انداز میں پیش کیا گیا۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں عزیز احمد غلام عباس، خواجہ احمد عباس احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری، دیویندر ستیارتھی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، خدیجہ مستور اور غیاث احمد گدی شامل ہیں۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری پلاٹ کے منطقی تسلسل اور لطیف طرزِ بیان کی خصوصیت کے حامل ہیں۔ انوکھی مصیبت، ڈھائی سیر آٹا، کمزور پودا اور بھرے بازار میں، ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ آخری کوشش کو خلیل الرحمٰن اعظمی نے معنویت اور بنیادی مسائل کا عرفان قرار دیا ہے جو پریم چند کا افسانہ کفن کی یاد دلاتا ہے۔ اختر اورینوی نے بہار کے مسائل پر بہت عمدہ افسانے لکھے ہیں۔ انہوں نے نچلے طبقے کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کے افسانوں میں، اندھی نگری، بوڑھی ماما، یہ پس منظر، شکور دادا، پناہ گزیں، اور کلیاں کانٹے شاہکار افسانے ہیں۔ انہوں نے جنسی مسائل کی بھی عکاسی کی ہے۔ ان کے کردار فطری انداز میں پیش کیا۔ ان کے کرداروں میں تاثر اور پلاٹ کی وحدت خوبی پائی جاتی ہے۔ اس دور میں سدرشن بیدی اور احمد ندیم قاسمی نے دیہی مسائل پر قلم اٹھایا۔ گرداب اور آبلے اور چوپال احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعے ہیں۔ انہوں نے دکھ دردمری، افلاس، قحط، سیلاب اور غربت کو اپنی افسانوی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ عصری مسائل پر انہوں نے فنی اور فکری آگہی فراہم کی ہے۔ ان کا افسانہ ہیروشیما جنگِ عظیم کے موضوع پر ایک شاہ کار افسانہ سمجھا جاتا ہے۔ سناٹا، ارتقا، چوپال، نمک حلال اور کفارہ نفسیاتی نوعیت کے نمائندہ افسانے ہیں۔ دیویندر ستیارتھی نے ہندوستانی لوک گیتوں کو جمع کیا اور ان سے متعلق تجربات کو موضوعِ گفتگو بنایا۔ کٹاری کے انڈے، جگنو ہی جگنو، پرانے پل، اگلا پڑاؤ، کانگڑی اور دوراہا ان کے اہم افسانے ہیں۔ نئے دھان سے پہلے ان کا افسانہ قحطِ بنگال پر مشتمل اہم افسانہ ہے جو ان کی فنی صلاحیت کا غماز ہے۔ خواجہ احمد عباس کے جن افسانوں کو شہرت حاصل ہوئی ان میں ابابیل اور ایک پائلی اہم ہے۔ ایک پائلی بنگال کے قحط پر مشتمل ہے۔ خدیجہ مستور نے جو افسانے تخلیق کئے ہیں ان سے ان کے سماجی شعور کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے تاہم ان کے افسانوں میں ایک سنجیدہ اور غمگین فضا حاوی رہتی ہے۔ لالہ صحرائی اور دادا ان کے اہم افسانے ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے ادب میں ہر صنف پر طبع آزمائی کی۔ رومانوی حقیقت نگاری ان کے فن کی اہم خصوصیت ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں طلسم

خیال، نظارے، ہوائی قلعے، گھونگھٹ میں گوری جلے، زندگی کے موڑ پر نئے افسانے، نغمے کی موت، پرانے خدا، ان داتا، ہم وحشی ہیں، ٹوٹے ہوئے تارے، تین غنڈے، اجنتا سے آگے، ایک گرجا ایک خندق، سمندر دور ہے، شکست کے بعد، نئے غلام، میں انتظام کرونگا، مزاحیہ افسانے، ایک روپیہ ایک پھول، پولی ٹیکس کی ڈالی، ہائیڈروجن بم کے بعد، کتاب کا کفن، دل کسی کا دوست نہیں، کرشن چندر کے افسانے، مسکرانے والیاں، سپنوں کا قیدی، مس نینی تال، دسواں پل، گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو، آدھے گھنٹے کا خدا، الجھی لڑکی کالے بال۔ ان کے افسانوں میں کالو بھنگی شہرہ آفاق سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی شگفتہ بیانی کے لئے مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں عزیز احمد رقم طراز ہیں:

> منظر کشی میں کرشن چندر کا مقابلہ اردو کا کوئی نثر نگار نہیں کرسکتا۔ کسی ادیب یا شاعر نے کشمیر کے پہاڑوں، وادیوں، چشموں، ندیوں جھیلوں مرغزاروں قصبوں اور دیہاتوں کی ایسی اچھی تصویریں نہ کھینچی ہونگی۔ مناظرِ قدرت پریم چند کی نگاہ کو وسعت اور معیار عطا کرتے ہیں جن کی وجہ سے وہ انسان کو اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ ہمدردی کرسکتا ہے۔
>
> (دیباچہ پرانے خدا)

بالکنی کرشن چندر کا اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ انقلابی اور حقیقت نگاری کو پیش کرتا ہے۔ ان کے افسانوں پر ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ کے اثرات کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ ممتاز شیرین رقم طراز ہیں:

> کرشن چندر نے مغربی افسانے سے متاثر ہوکر کئی ایک نئے تجربے کئے بلکہ ان کا ہر ایک افسانہ ایک نیا تجربہ تھا۔ کرشن چندر کے پاس ذہانت تھی کسی چیز کا فوری اثر قبول کر لینے والا مزاج ایک زود نویس تیز رفتار قلم چکتی ہوئی لمبی رنگیں زبان جس سے انہیں اظہار میں کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ جس مغربی افسانے سے متاثر ہوئے اسی طرز کے افسانے کو فوراً اردو میں منتقل کیا۔
>
> (بحوالہ اردو افسانے پر مغربی افسانے کا اثر: اردو افسانہ روایت اور مسائل، ص۔ 89)

ترقی پسند دور کے افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ حالانکہ ان کے افسانوں کی تعداد دیگر افسانہ نگاروں کی بہ نسبت کم ہے ان کے افسانوں کی تعداد تقریباً ستر ہے۔ انہیں انسانی نفسیات کی پیش کش میں جس قدر مہارت حاصل ہے وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس کے علاوہ حالات و

واقعات کو پیش کرنے میں ان کی فنی مہارت کا عندیہ ملتا ہے۔ان کے کردار سماجی تہذیبی ثقافت کی جھلک نیز منطقی پہلوؤں پر جذباتیت کا حاوی ہونا ان کے افسانوں کا خاصہ ہے ۔بیدی نے ازدواجی زندگی کے مسائل کولاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دواور گرم کوٹ میں پیش کیا ہے۔گرم کوٹ میں محدود آمدنی اور بڑھتی ہوئی ضروریاتِ زندگی کوفن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔اس کہانی میں کلرک کی بیوی شمی کا کردار فعالیت کا حامل ہے۔اس کے متعلق شمس الحق عثمانی لکھتے ہیں:

> بیدی کےفن کے تناظر میں عورت کی یہ ترجیح اس لئے درست ہے کہ وہ شوہر کے ہی وسیلے سے تو صاحبِ اولاد بنتی ہے، فریضۂ تخلیق ادا کرتی ہے۔ ماں بنتی ہے۔شمی نے گلاب جامن کا مطالبہ کرنے والی پشپامنی کے منھ پر زوردار چپت لگا کر دراصل ان تمام ضرورتوں کے تئیں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے جو اس کے شوہر کی ایک سماجی اور جسمانی ضرورتوں کا راستہ روک دیتی ہے۔

(بیدی نامہ ص۔215 تا216)

اس طرح بیدی ترقی پسند افسانی نگاروں میں انسانی نفسیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔

اسی دور میں سعادت حسن اردو افسانہ نگاری کے ایک ایسے تخلیق کار ہیں جنہوں نے فکری طور پر سماجی مسائل پر غور وفکر کیا مگر پورے معاشرتی ماحول کو متاثر کرنے والے مسائل کو موضوعِ گفتگو بنایا۔ان کا شمار صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ۔وہ افسانے کی فنی تکنیک سے بخوبی واقف تھے۔ان کی کہانی میں الفاظ کی بندش اور اشارے کنایوں میں بات کہنے کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔فرقہ وارانہ فسادات،جنسی اور نفسیاتی مسائل، تقسیمِ ہند کا المیہ،اور زندگی کے وہ گھناؤنے موضوعات جنہیں موضوعِ گفتگو لانا شرافت کے خلاف تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ان کے افسانوی مجموعے مندرجہ ذیل ہیں: دھواں،منٹو کے افسانے،نمرود کی خدائی،سڑک کے کنارے، برقعے، پھندے،شکاری عورتیں،سرکنڈوں کے پیچھے،گنجے فرشتے،بادشاہت کا خاتمہ،بغیر اجازت، رتی ماشہ تولہ، یزید،ٹھنڈا گوشت، بڈھا کھوسٹ، آتش پارے، خالی بوتلیں خالی ڈبے، سیاہ حاشیے، گلاب کا پھول، چغد،شیطان، نیلی رگیں، کالی شلوار،لذتِ سنگ، تلخ ترش شیریں، جنازے،بغیر اجازت وغیرہ۔منٹو ایک کامیاب حقیقت نگار ہیں۔انہوں نے انسانی زندگی اور سماج کے تلخ حقائق اور تجربات بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔اپنے افسانے کے بارے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

> زمانے کے جس دور سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں اگر اپ اس سے واقف

ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ نا قابلِ برداشت ہے۔میری تحریر میں کوئی نقص نہیں،جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے،وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔

(بحوالہ سعادت حسن منٹو، پریم گوپال،ص۔14)

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی کا نام نا قابلِ فراموش ہے۔انہوں نے عورت کی زندگی کے مختلف مسائل بالخصوص جنسی مسائل پر جس طرح گفتگو کی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔موجودہ دور میں ان کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔متوسط طبقے کی زبان کے حوالے سے ان کی بیساختگی اور روانی کی خصوصیت قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔افسانے کی ابتدا تا انتہا انہیں قاری کا اعتماد حاصل رہتا ہے۔کلیاں، چوٹیں،ایک بات، چھوئی موئی،دو ہاتھ، بدن کی خوشبو،امر بیل،تھوڑی سی پاگل،آدھی عورت آدھا خواب اور دوزخی وغیرہ ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔عصمت کی افسانہ نگاری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔پہلے زمرے میں گھریلو افسانے شامل ہیں۔اس میں ان خواتین کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے جو جنسی گھٹن میں مبتلا ہیں۔مزید برآں کثیر افراد پر مشتمل خاندانوں کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔دوسرا حصہ انہیں ایک نڈر عورت کی شکل میں پیش کرتا ہے۔عصمت نے شادی شدہ عورتوں کے مسائل پر بڑی فن کارانہ گفتگو کی ہے۔ان کا افسانہ لحاف اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ کس طرح جنسی نا آسودگی انسان کو بے راہ روی کی طرف مائل کرتی ہے۔چھوٹی آپا، جال اور پردے کے پیچھے اس کی اہم مثال ہیں۔فضیل جعفری کی نظر میں:

پردے کے پیچھے تو ایک نہایت ہی معصوم اور بے ضرر افسانہ ہے جس میں پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی طالبات پردے سے باہر موجود کچھ طالب علموں کے متعلق اپنی اپنی پسند یا یوں کہئے کہ اپنے تخیلی شوہروں کے بارے میں اظہارِ رائے کرتی ہیں اور ان کی سہیلیاں ایک دوسرے کے پسندیدہ لڑکوں کے بارے میں چہلیں اور چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں،ظاہر ہے کہ یہ محض اوپری چھیڑ چھاڑ ہے،اس افسانے کو جاں نثار اختر کی اسی ماحول میں لکھی گئی نظم کا نثری اور افسانوی counterpart کہا جا سکتا ہے۔

(بحوالہ،عصمت چغتائی کا فن مشمولہ اردو افسانہ روایت اور مسائل،ص۔431)

اس کے علاوہ ان نظریات سے متاثر ہوکر افسانوں کی تخلیق میں اختر انصاری، دیویندر ستیارتھی، سہیل انجم عظیم آبادی، ممتاز مفتی، مہیندر ناتھ، شوکت صدیقی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو اور بلونت سنگھ اور رام لعل قابلِ ذکر ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

1۔ ترقی پسند تحریک کے بانی کون ہیں؟

2۔ ترقی پسند تحریک کا نقطہ نظر کیا تھا؟

3۔ ترقی پسند تحریک کے نمائندہ افسانہ نگاروں کے نام اور ان کی خصوصیات لکھئے۔

2.6 جدیدیت اور اردو افسانہ

یہ دور آزادی کے بعد 1955 سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں تقسیمِ ہند کے سبب ہجرت کے مسائل کا تذکرہ شامل ہے تاہم اس سے وابستہ موضوعات میں درد کی کسک قدرِ کم ہو جاتی ہے۔ ترقی پسن نظریات کی گھن گرج اب معدوم ہوتی نظر آتی ہے۔ ترقی پسند نقطہ نظر اجتماعیت کا حامل تھا مگر جدیدیت انفرادی زاویہ نگاہ پر مشتمل تھی۔ اب خارجیت کے مقابل داخلی مسائل کو تخلیقات میں پیش کرنے کا نظریہ زور پکڑ رہا تھا۔ زبان میں برجستگی اور روانی کے بجائے غیر مانوس اور مبہم الفاظ کو عمداً پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ تصور عام ہو رہا تھا کہ پلاٹ کردار، واقعہ اور فضا یا ماحول کے بغیر بھی افسانہ وجود میں آ سکتا ہے۔ اس دور میں شعور کی رو کی تکنیک آزاد تلازمہ خیال کے ساتھ ساتھ علامتی اور تجریدی اور تمثیلی افسانے منظرِ عام پر آ رہے تھے۔ اس عہد کے نمائند افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، بلراج مینرا، انور سجاد، کلام حیدری، احمد ہمیش، سریندر پرکاش، دیویندر اسر، نرمل ورما، خالدہ حسین، جوگیندر پال، غیاث احمد گدی اور رشید امجد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ناول کے ساتھ ساتھ طویل افسانے لکھے ہیں جنہیں ناولٹ کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور سماجی انتشار کو انہوں نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ وہ شائستگی نفاست اور انسانی اقدار کو ملحوظِ خاطر رکھتی ہیں۔ انہوں نے شعور کی رو کا استعمال بڑے فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔ حسب نسب، آئینہ فروش شہرِ کوراں، فوٹو گرافر، روشنی کی رفتار، یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے، ڈالن والا، جلاوطن وغیرہ، ان کے اہم افسانے ہیں۔ ہاؤسنگ سوسائٹی اور چائے کے باغ ان کے طویل افسانے ہیں۔ ان کے افسانوں کی اہمیت سلوب کے اعتبار سے مسلم ہے۔

جدیدیت کے نقطہ نظر کے تحت انتظار حسین اپنے داستانوی طرزِ اظہار کے لئے معروف ہیں۔ تقسیمِ ہند کے سبب ہجرت کا المیہ ان کے افسانوں کا موضوع رہا ہے۔ ماضی کی روایات اور تہذیبی جڑوں کی تلاش کے علاوہ انہوں نے جاتک کتھاؤں، بدھ مت، تصوف، اساطیری روایات اور برِّ صغیرِ ہند کی پانچ ہزار سال کی تہذیب کو انہوں نے اپنی تخلیقات میں نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ جدید دور کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ آخری آدمی ، زرد کتا، ایکبن لکھی رزمیہ، خالی پنجرہ، کچھوے، شہر افسوس اور ایک خط ہندوستان سے ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

جدیدیت کے تحت افسانہ نگاروں میں بلراج مین را ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ علامتی افسانہ ان کے فن کا خاصہ ہے۔ ان کے افسانے علامت نگاری اور استعاراتی اسلوب کا نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ فرد کی ذلت، مشینی دور میں انسان کی بے بسی اور بے سروسامانی کی کیفیت، تخلیقی حسیت کے ساتھ ان کے افسانوں میں اجاگر ہوتی ہے۔ ان کی نثر کا آہنگ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ماچس مین را کا شاہ کار افسانہ ہے۔

جدیدیت کے ہم نواؤں میں سریندر پرکاش ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے انسان کے ذہنی مسائل کو قلم بند کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کہانی علامتی اور استعاراتی تانے بانے پر مشتمل ہے۔ آدمی کا ڈرائیگ روم ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اسی دور میں ایک اہم افسانہ نگار انور سجاد کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے سامراجی سیاسی اور سرمایہ دارانہ جبر کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یوریکا، کونپل و دیگر افسانے اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔

اس طرح جدید افسانہ نگاروں کا طرزِ فکر فرد کی افادیت پر مبنی تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس صنعتی دور کے معاشی طور پر بدحالی کا شکار اور جذباتی طور پر نا آسودہ انسان کے داخلی انتشار کو موضوعِ گفتگو بنایا نیز تہذیبی شکست و ریخت کے مسائل کو اپنے افسانوں میں اہمیت دی۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں کلام حیدری، رشید امجد، احمد یوسف، سلام بن رزاق، شموئل احمد، قمر احسن، آصف فرخی، عبد الصمد، رضوان احمد اور سید محمد اشرف قابلِ ذکر ہیں۔

2.7 مابعد جدیدیت اور اردو افسانہ اور موجودہ صورتِ حال

جدیدیت نے جس طرح بیانیہ انداز سے انحراف کیا۔ مابعد جدید دور بیانیہ انداز کی واپسی کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں مبہم اور تجریدی افسانے کے بجائے بیانیہ انداز کو ازسرِ نو پیش کرنے کا میلان نظر آتا ہے ۔اس کے تحت اربابِ ادب کے مطابق قاضی عبد الستار کا پیتل کا گھنٹا، سلام بن رزاق کا انجام کار، نیر مسعود کا طاؤس چمن کی مینا، شوکت حیات کا گھونسلا، انور خان کا اپنائیت، عبد الصمد کا شہر بند، سید محمد کا ڈار سے بچھڑے، انور قمر کا کابلی والا کی واپسی، بیگ احساس کا حنظل، مظہر الزماں کا پہلے دن کی تلاش میں، طارق چھتاری کا نیم پلیٹ وغیرہ قابلِ ذکر

ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے نہ تو مکمل طور پر ترقی پسند رجحان کو قبول کیا اور نہ ہی جدیدیت کی ابہام پسندی اور تجریدیت کو قبول کیا۔ بلکہ تمام اسالیب کے تئیں امتزاجی رویہ اختیار کرتے ہوئے نئی راہ نکالنے کی کوشش کی۔انہوں نے فرد کی افادیت، زندگی کے حقائق، ٹیکنالوجی کے آنے سے ماحول اور حالات کی نظریاتی تبدیلی اور مسائل کو زیرِ غور رکھا۔علاوہ ازیں جدید ترقیاتی وسائل اور ان کے مثبت اور منفی دونوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تخلیقیت کی راہ ہموار کی۔افسانوی تکنیک اور اس کے فروغ میں ذرائع ابلاغ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔مزید برآں سیاسی نظام کے نشیب و فراز نے اس دور کے افسانہ نگار کو جس نہج اور تصور سے آشنا کیا ہے اس پر غور وخوض کرنا اشد ضروری ہے۔

ان افسانہ نگاروں نے جس طرح تشبیہات اور استعارات کا استعمال کیا وہ فن پارے سے ہی ماخوذ دکھائی دیتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت ہے کہ اردو افسانہ ادب میں مغرب کے توسط سے داخل ہوا تاہم یہ جس طرح ہندوستانی رنگ میں رچ بس گیا ہے تو یہ امتیاز کرنا نہایت مشکل ہے کہ یہ غیر ملکی صنف ہے۔گزشتہ چند برسوں میں حقیقت نگاری کا رویہ افسانوں میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔اس میں کہانی کی بازیافت کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کے مسائل سے ہم آہنگ کرانے کا رویہ شامل ہے۔اس دور کے افسانہ نگاروں میں قدرت اللّٰہ شہاب، ممتاز شیریں ،شوکت صدیقی، شکیلہ اختر، اشفاق احمد جمیلہ ہاشمی، جوگیندر پال، اقبال متین، اقبال مجید، رتن سنگھ قاضی عبدالستار، حسین الحق، غضنفر، انور عظیم، عابد سہیل کے علاوہ حمید سہروردی، خالد جاوید، بیگ احساس، کنور سین علی امام طارق چھتاری ،ابنِ کنول، شائستہ فاخری، ترنم ریاض، اسلم جمشید پوری، قمر جمالی اور صادقہ نواب سحر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس حقیقت کو نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ مغرب کے زیرِ اثر کسی بھی نقطہ نظر کا اطلاق اردو ادب میں من وعن ممکن نہیں کیونہ یہاں کی تہذیبی اقدار و روایات کی نوعیت جداگانہ ہے۔البتہ ان سے یکسر انحراف نہیں کیا جا سکتا تاہم ایک متوازن زاویہ نگاہ کے پیشِ نظر نئے تخلیقی عوامل اور فنی تصورات کو برتنا ہر زمانے میں مفید ثابت ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اردو افسانے میں جدیدیت سے آپ کی کیا مراد ہے؟

۲۔ جدیدیت سے متاثر ہونے والے کسی دو افسانہ نگاروں پر مختصراً اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔

2.8 خلاصہ

افسانہ اردو ادب کی اصناف میں مقبول ترین صنف سمجھی جاتی ہے۔ انیسویں صدی سے قبل اسے امتیازی حاصل نہیں تھی جتنی کہ بعد میں۔ یہ ایک ایسی بیانیہ نثر ہے کہ جو اتنی مختصر ہوتی ہے کہ ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔ یہ زندگی کی فطری تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ کسی ایک واقعے، کردار، حادثے اور پہلو کو ایجاز و اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے جس میں تخلیق کار کی فنی خصوصیات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، عنوان، کردار نگاری، زمان و مکاں، وحدت و تاثر، موضوع، اسلوب، شامل ہیں۔ افسانے میں ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ افسانے کی تکنیک میں بیانہ انداز براہِ راست اور Indirect Narration دونوں کو برتا گیا۔ بعد میں خود کلامی کی تکنیک بھی اس میں شامل ہوگئی۔ اس کے تحت مرکزی کردار خود اپنے بارے میں بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات واقعات کو ڈائری یا مراسلات کے ذریعے بھی کہانی میں پیش کیا جاتا ہے۔ مغرب کے زیرِ اثر شعور کی رو کی تکنیک اردو میں نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علامت نگاری، تجریدیت، وجودیت، ماورائیت اور حقیقت نگاری وغیرہ کا چلن عام ہوا۔ اردو افسانے کے ابتدائی نقوش ہماری ہندوستانی داستانوں مین جا بجا ملتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں محمد حسین آزاد، فیض الحسن، پیارے لال، عبدالحلیم شرر شوبرت لال اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں افسانوی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ اردو افسانے کا آغاز باضابطہ طور پر بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ ارباب ادب کے مطابق راشد الخیری کا افسانہ نصیر اور خدیجہ پہلا طبع زاد افسانہ ہے۔ پریم چند کو اردو افسانوں کا بانی کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے فنی اعتبار سے افسانوی قواعد اور ضوابط کو برتا ہے۔ 1907 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ سوزِ وطن شائع ہوا۔ ان کے افسانوں میں بڑے گھر کی بیٹی نمک کا داروغہ، بوڑھی کاکی، عیدگاہ، پنچایت حجِ اکبر، نئی بیوی، نجات شطرنج کی بازی اور کفن شامل ہیں۔ اسی دور میں پریم چند کے ساتھ، راشد الخیری، سلطان حیدر جوش، سدرشن اور حامد اللہ افسر وغیر قابلِ ذکر ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے ادب میں مزدوروں اور مظلوموں کے تئیں رائج مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور ادب برائے سماج اور ادب برائے زندگی کا نظریہ پیش کیا۔ 1935 سے 1955 تک ترقی پسند نقطہ نظر حاوی رہا۔ بعد ازاں تقسیمِ ہند نے افسانوں کی نظریاتی دنیا کو یکسر بدل دیا۔ اب جدیدیت کا نقطہ نظر حاوی ہوگیا جس کے تحت ہجرت کا درد مہاجرین کے مسائل، اجتماعیت کی جگہ فرد کی افادیت تنہائی کے کرب کو اہمیت دی جانے لگی۔ افسانوی فن میں ابہام، علامت نگاری اور تجریدیت پر زور دیا جانے لگا۔ نیز شعور کی رو کی تکنیک عام ہوئی۔ اس دور میں قرۃ العین حیدر انتظار حسین، بلراج مین را، سریندر پرکاش انور سجاد کے علاوہ متعدد افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست دکھائی دیتی ہے جس کا تذکرہ اس اکائی میں شامل ہے۔ جدیدیت کے بعد

مابعد جدیدیت نے ابہام اور تجریدیت کے استراد کا تصور پیش کیا اور بیانیہ انداز کو ازسرِ نو اپنانے کی کوشش کی۔ ان افسانہ نگاروں میں قاضی عبدالستار، سلام بن رزاق، نیر مسعود، شوکت حیات، انور خان، عبدالصمد، سید محمد اشرف، انور قمر، بیگ احساس، مظہرالزماں، اور طارق چھتاری شامل ہیں۔

2.9 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

ا۔ افسانہ کیا ہے؟ اس کی کوئی تعریف لکھئے۔

۲۔ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری پر نوٹ لکھیے۔

۳۔ بلراج مین را کی افسانہ نگاری پر نوٹ لکھیے۔

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

ا۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے افسانے پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

۲۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے افسانے پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

۳۔ افسانے کی مابعد جدیدیت اور موجودہ صورتِ حال پر اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔

2.10 فرہنگ

زمان و مکاں	وقت اور فضا
تاثر	اثر
نشیب و فراز	اتار چڑھاؤ
حرکیاتی	فعال
فضا	ماحول
عنوان	سرخی
قوتِ مشاہدہ	دیکھ کر سمجھنے کی صلاحیت
تعین	پرکھنا

عوامل	عمل کے اثرات
مرقع سازی	تصویر کھینچنا
تعبیروتشریح:	وضاحت کرنا
قالب	جسم
متوقع	جس کی امید ہو
استحصال	حاصل شدہ چیز کو لے لینا
طبع آزمائی	لکھنا، اپنی فنی صلاحیت کو نثر یا نظم میں پیش کرنا

2.11 معاون کتابیں

1	فنِ افسانہ نگاری	وقار عظیم
2	داستان سے افسانے تک	وقار عظیم
3	سعادت حسن منٹو	پریم گوپال متل
4	ترقی پسند تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی
5	بیدی نامہ	شمس الحق عثمانی
6	اردو میں مختصر افسانے کی تاریخ وتنقید	ڈاکٹر پروین اظہر
8	پرم چند کہانی کا رہنما	جعفر رضا
9	نیا افسانہ مسائل اور میلانات	ترتیب: قمر رئیس
11	اردو افسانے کا سفر	جلد اول: مرتبہ: نجمہ رحمانی
12	اردو افسانے کا سفر	جلد دوم: مرتبہ نجمہ رحمانی
13	ردو افسانہ روایت اور مسائل	گوپی چند نارنگ
14	پرانے خدا	کرشن چندر
15	تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین

انگریزی کتب:

Modern Short Story by

1. H.E.Bates
2. The Short Story by E.M.Albright
3. The Readers Companion to the World Literature by
   Hornstein Lillia Herlan

☆☆☆

اکائی: ۳ ۔ منشی پریم چند

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد
3.2 تمہید
3.3 منشی پریم چند کا عہد
3.4 منشی پریم چند کی حیات وشخصیت
3.5 منشی پریم چند کی ادبی خدمات
3.6 منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات
3.7 خلاصہ
3.8 نمونۂ امتحانی سوالات
3.9 فرہنگ
3.10 معاون کتابیں

3.1 اغراض ومقاصد

منشی پریم چند اردو کے ایک عظیم فنکار گزرے ہیں۔اس اکائی میں ان کی حیات وشخصیت اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ طلبا پریم چند کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کی افسانہ نگاری کی خصوصیات کو سمجھ پائیں۔

3.2 تمہید

پریم چند کا تعلق اردو سے بھی ہے اور ہندی سے بھی۔جن کی تحریریں ہندوستانی سماج کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔انھوں نے صدیوں پرانے خیالات اور بے تکے روایات پر سخت چوٹ کرتے ہوئے اپنی تحریروں سے سماج میں ایک بیداری لانے کی کامیاب کوشش کی۔بیسویں صدی میں مہاتما گاندھی جی کی قیادت میں ملک میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی بیک وقت ہندوستانی سماج ایک طرف انگریزوں کے ظلم وجبر کے خلاف آواز بلند کرچکا تھا

تو دوسری جانب سینکڑوں برسوں سے ہمارے سماج میں پرانے اور دقیانوسی خیالات سے ایک بڑے طبقے کی زندگیوں کو جہنم بنا چکے ساہوکار، ٹھاکر اور سرمایہ داروں کے خلاف آوازیں اٹھنا شروع ہو چکی تھی۔ پریم چند نے اپنے قلم کے ذریعے سماج کی سچائی کو منظر عام پر لانے کا کام کیا۔

پریم چند فنی وادبی طور پر ایک ایسی قدآور شخصیت تھی کہ آپ نے انسانی زندگی کے مسائل کو بڑی بیبا کی کے ساتھ پیش کیا۔ حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کے اصول وقاعدوں سے سرشار پریم چند ایک حساس ذہن کے مالک تھے۔ ان کے پاس ایک دل تھا جو غریبوں، مجبوروں، بے سہارہ لوگوں اور کمزور طبقے کے لئے ہمیشہ دھڑکتا تھا۔ عورتوں کے مسائل، بیواؤں کی زندگی، کسانوں کے مسائل اور سماج میں پھیلے ہوئے برائیوں پر بڑی بیبا کی سے لکھتے رہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور اصلاحی اور مقصدی پہلو بہت نمایاں تھے۔

3.3 منشی پریم چند کا عہد

بیسویں صدی کا ابتدائی دور ہندوستان اور دنیا بھر میں انقلابوں تحریکوں کا دور رہا۔ دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ انقلاب روس اور دنیا کے مختلف ملکوں میں تبدل اور تغیر کی فضا پھیل رہی تھی۔ اس وقت ہندوستان میں انگریزی سامراجیت کے خلاف سواراج یعنی آزادی کی مہم پورے شباب پر تھی۔ ہندوستانی مہاتما گاندھی جی کی قیادت مین سب ایک ہو کر انگریزوں کو نکال باہر کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ پریم چند خود مہاتما گاندھی جی کی تحریک میں شامل جس کو عوم کو بھر پور ساتھ مل رہا تھا۔ اپنے قلم کے ذریعے لوگوں میں آزادی کی فضا کو مہکایا۔ ایک طرف اردو شاعری تو دوسری طرف اردو ناول اور افسانے لوگوں میں آزادی کے جزبے کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ پریم چند نے حالات کے پیش نظر آزادی سے متعلق لکھنا شروع کیا۔ سماجی برائیوں اور طبقاتی کشمکش پر بیباک ہو کر لکھا۔ کیونکہ یہ وقت کی ضرورت اور سماج کی پکار تھی۔ پریم چند نے لوگوں کو حقیقت سے آشنا کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں کیا ہو رہا تھا۔

۲۔ پریم چند نے انگریزوں کے خلاف گاندھی جی ساتھ کیوں شامل ہو گئے؟

۳۔ ہندوستانی سماج کو پریم چند نے حقیقت سے آشنا کیا؟ کیا آپ اس بات ست متفق ہیں۔

3.4 منشی پریم چند کی حیات وشخصیت

منشی پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ وہ ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ کو ضلع وارانسی مرٹھوا کے ''لمہی'' نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نے آپ کا نام دھنپت رائے رکھا جبکہ چچا نے ان کا نام پریم چند رکھا۔ اس طرح یہی نام آپ کا مقبول عام ہو گیا۔ لال پور کے مولوی صاحب کے پاس اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۵ میں گورکھپور سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ پریم چند بچپن سے بڑے ذہن تھے۔ بعد میں معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دی اور ۸۱ روپے ماہوار تنخواہ پر معلم کے طور پر کام کیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۹ میں بنارس میں اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ ۱۹۰۰ میں بیرائچ کے گورنمنٹ سکول میں کام کیا اور ہر پرتاب گڑھ کے ضلع میں تبادلہ ہوا۔ الہ آباد جا کر آپ نے پہلی مرتبہ سنجیدگی سے لکھنا شروع کیا۔ جس میں ان کے خیال وفکر کی گہرائی اور ان کے تاثرات نظر آتے ہیں۔ پریم چند کا تعلیمی سفر بدستور جاری رہا ۱۹۰۴ میں جونیئر انگلش ٹیچر کا امتحان پاس کیا اور اسی سال الہ آباد یونیورسٹی سے اردو ہندی کا خصوصی امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۰۶ میں آپ کی دوسری شادی ایک بیوہ ''شیورانی دیوی'' سے ہوئی۔

۱۹۰۹ میں ترقی پا کر سب انسپکٹر آف سکولز ہو گئے۔ ۱۹۱۹ میں بی۔اے کیا۔ مہاتما گاندھی جی تحریک سے کافی متاثر تھے فروری ۱۹۲۱ میں عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو گئے اس بنا پر ملازمت سے علیحدہ ہوئے۔ ملک میں ترقی پسند خیالات ہو دی جارہی تھی لہٰذا لندن کا بہت سار ہمارے ادباء وشعراء سفر کر رہے تھے۔ ان حالات میں ادب میں ایک نمایاں تبدیلی کی آواز بلند ہو رہی تھی ایسی صورت میں پریم چند کے خیالات بھی ان سے ملتے جھلتے تھے۔ آپ اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں شامل ہیں اور ساتھ ہی اردو ناول کو ایک مقصد عطا کرنے میں آپ کامیاب رہے۔ اصلاح معاشرہ کا خاص مقصد لے کر انھوں نے ہندوستانی سماج کو سوچنے اور غور وفکر کی دعوت بھی دی اور یہ احساس کرایا کہ غریب، لاچار اور کمزوروں پر صدیوں سے جو ظلم ہو رہا ہے اب وہ سوچ بدلنے کا وقت آ گیا۔ اب انسان اور انسانیت کے لئے جینا اور مرنا ہے۔ اردو میں ترقی پسند تحریک باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ میں۔ آپ نے لکھنؤ میں پہلی مرتبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس کی صدارت کی۔ اس تقریب میں آپ نے کہا کہ ہمیں حسن کے معیار کو بدلنا ہوگا۔ اب صرف محلوں، عالی شان عمارتوں میں ہی حسن نہیں بلکہ اس عورت کے پسینے میں بھی حسن کو تلاش کریں جو عورت اپنی مجبوری اور لاچاری کے باعث اپنی بچے کو کھیت کے مینڈ پر سلا کر سارا دن اس کھیت میں محنت مزدوری کرتی ہے۔ ہمیں اس عورت کے پسینے مین حسن کو تلاش کرنا ہے ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ کو ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

پریم چند کی ذہنی وادبی شخصیت کی تعمیر اور ان کی ذہنی تشکیل میں مہاتما گاندھی جی، ٹالسٹائی، رابندر ناتھ ٹیگور اور سرت چٹر جی کا اہم مقام ہے۔ آپ کا فارسی مطالعہ کافی گہرا تھا۔ اردو میں حالی کی سادگی سے بھی کافی متاثر تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ پریم چند کا اصل نام کیا تھا۔

۲۔ پریم چند کہاں پیدا ہوئے۔اور انکے والد کا نام بتائے۔

۳۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس میں پریم چند کس حیثیت سے شریک ہوئے۔

3.5 منشی پریم چند کی ادبی خدمات

منشی پریم چند ایک قد آور افسانہ نگار ایک کامیاب ناول نگار اور اردو کے قابل قدر مصنف تھے،جن کا قلم ہندوستان اور ہندوستان کی سچائی بیان کرتا ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا امتزاج زندگی کے خارجی معاملات اور معاشرے کی صحیح عکاسی ملتی ہے۔ان کی تحریریں حقیقت نگاری کے اعلٰی معیار پر کھرا اترتی ہیں۔آپ کی تحریروں میں حقیقت اور رومان کا میل ہے۔ رومانیت میں زندگی کے باطنی پہلو اور وجدانی معاملات کو اہمیت دی جاتی ہے۔اس ح بنا پر رومانیت میں تخیل کی آمیزش ہوجاتی ہے۔ڈاکٹر محمد عالم خان کے مطابق

''رومانوی ادیب زندگی کی عکاسی ایک مصور کی حیثیت سے کرتا ہے جبکہ
حقیقت پسند، زندگی کو فوٹو گرافر کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔''

پریم چند کے ہاں ہمیں دونوں رنگ ملتے ہیں۔ایک طرف سماج کی مکمل تصویر تو دوسری جانب تخیل کی رنگ آمیزی ملتی ہے۔ڈاکٹر محمد عالم خان کی رائے کے مطابق'' پریم چند کے پاس رومانیت کا تصور ایک سماجی پہلو لیے ہوئے ہے جس میں سماج کی ہو بہو تصویر مناسب عکاسی ملتی ہے اور وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے انحراف نہیں کرتے۔نظام زندگی کی واقعی ایک جاذب تصویر ہمیں پریم چند کے افسانوں میں ملتی ہے

منشی پریم چند کی ابتدائی ادبی زندگی آپ کا پہلا ناول ''اسرارِ مابعد'' رسالہ آوازِ خلق میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۳ کو شائع ہوا۔ ۱۹۰۷ میں دوسرا ناول ''کیش نا'' کے نام لکھا جواب دستیاب نہیں ہے۔اس کے بعد ۵ افسانوں کا مجموعہ ''سوزِ وطن'' کے نام سے ۱۹۰۸ میں منظر عام پر آیا۔جس میں آپ نے آزادی، حریت، غلامی اور بغاوت کے موضوعات کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا۔وقت اور حالات کی مناسبت سے لوگوں یہ ضروری تھا انگریزوں کو لگا کہ یہ عوم میں آزادی کا جذبہ ابھار رہے ہیں۔تو حکومتِ برطانیہ نے اس پر پابندی عائد کر دی۔ چنانچہ گورکھ پور کی حکومت نے اس کی تمام کاپیوں کو ضبط کر کے جلا دیں اور آئندہ کے لیے ایسی تخلیقات لکھنے اور شائع کرنے پر سخت پابندی عائد کر دی۔ پریم چند نے ان افسانوں میں ''نواب رائے'' کے قلمی نام کا استعمال کیا۔آگے چل کر پریم چند

کے نام سے لکھنا شروع کیا۔

منشی پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار مانا جاتا ہے۔منشی پریم چند کا افسانہ نگاری میں بہت ہی بلند و اعلیٰ مقام حاصل ہے۔اردو افسانہ نگاری کے میدان کو اور معنویت عطا کرنے میں سب سے بڑا نام آپ کا رہا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اردو کا پہلا اہم اور بڑا افسانہ نگار پریم چند ہے۔اردو ادب میں یہ ایک ایسا نام ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پریم چند کو قلم کا سپاہی کہا جاتا ہے۔ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے مضمون ''پریم چند کی افسانہ نگاری کے دور'' میں ان کی افسانہ نگاری کے چار ادوار بتائے ہیں۔

پہلا دور: ۱۹۰۳ سے ۱۹۰۹ تک ابتدائی کوشش

دوسرا دور: ۱۹۹۰۱ سے ۱۹۲۰ تک تاریخی اور اصلاحی افسانے

تیسرا دور: ۱۹۲۰ سے ۱۹۲۳ تک اصلاحی اور سیاسی افسانے

چوتھا دور: ۱۹۲۳ سے ۱۹۳۶ تک سیاسی اور فکری افسانے

پریم چند کے افسانوی مجموعوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

۱۔	سوز وطن	سن اشاعت : 1908ء	کہانیوں کی تعداد : 05
۲۔	پریم پچیسی اول پریم پچیسی دوم	سن اشاعت: 1915ء اور 1918ء	کہانیوں کی تعداد : 25
۳۔	پریم بتیسی اول اور دوم	سن اشاعت : 1920ء	کہانیوں کی تعداد : 31
۴۔	خاک پروانہ	سن اشاعت : 1928ء	کہانیوں کی تعداد : 16
۵۔	خواب وخیال	سن اشاعت : 1928،	کہانیوں کی تعداد : 16
۶۔	فردوس خیال	سن اشاعت : 1929ء	کہانیوں کی تعداد : 11
۷۔	پریم چالیسی اول اور دوم	سن اشاعت : 1930ء	کہانیوں کی تعداد : 40
۸۔	آخری تحفہ	سن اشاعت : 1934ء	کہانیوں کی تعداد : 13
۹۔	زادراہ	سن اشاعت : 1936ء	کہانیوں کی تعداد : 15
۱۰۔	دودھ کی قیمت	سن اشاعت : 1937ء	کہانیوں کی تعداد : 09
۱۱۔	واردات	سن اشاعت : 1938ء	کہانیوں کی تعداد : 13

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ پریم چند کے افسانوں میں کیسا امتزاج ملتا ہے

۲۔ پریم چند نے سماج کے کس طبقے کی خاطر لکھنے پر مجبور ہوئے؟

۳۔ پریم چند سماج میں کس بات کی وکالت کرتے ہیں؟

۴۔ پریم چند ابتدائی طور پر کس نام سے لکھنا شروع کیا؟

۵۔ افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' کس سن میں شائع ہوا؟

۶۔ پریم چند نے ۱۹۲۰ کے بعد کس موضوع پر افسانے لکھے؟

3.6 منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات

پریم چند نے ان کمزور اور مزدور پیشہ لوگوں کی زندگی کی مناسب ترجمانی ادب کے ذریعے کی۔ دیہاتی زندگی کے مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے آپ نے پیش کیا۔ جس کی وجہ سے قدیم زنجیروں میں جکڑ کر نہ انہیں برابری کا حق حاصل تھا اور نہ انہیں سماج میں یکساں حقوق حاصل تھے۔ سماج میں اونچ نیچ، غربت، افلاس، لاعلمی اور سرمایہ دارانہ نظام نے ان کی زندگیوں کو جہنم بنا چکے تھے۔ پریم چند کی تحریریں برسوں پرانے اور بے تکے نظام پر ایک طمانچہ تھا۔ ایک طرف کسانوں کے مسائل، مزدوروں کے مسائل، غریب اور بے سہارہ لوگوں کے مسائل، ذات پات کے بھید بھاؤ سے ہمارا سماج طبقوں میں بٹا تھا۔ طبقاتی کشمکش نے ہندوستان کی ایک بڑی آبادی کو بنیادی حقوق کا علم تک نہ تھا۔ سماج میں اونچ نیچ کے فرق نے نسلوں کو برباد کر دیا تھا۔ ایسے عالم میں پریم چند کے افسانے اور ناول سچائی اور حقائق کو منظر عام پر لانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ ایسے میں پریم چند کی افسانے اور ناول سماج کی سچائی بیان کرتے ہوئے لوگوں میں ایک شعور اور احساس جگانے میں کامیاب رہے۔ ہندوستانی معاشرے کی اس قدر بہترین عکاسی شاید ہی اس قبل ہوئی ہو۔ آپ نے سماج اور قوم سے متعلق اپنے خیالات اور احساسات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا۔ پریم چند کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کی تحریروں کو حقیقت پسندی کی سند مانا جاتا ہے۔ آپ نے وہی لکھا جو کچھ آپ سماج میں دیکھ اور محسوس کر رہے تھے۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی سے ہو جاتا ہے۔ ادب کے ذریعے انقلاب اور معاشرے میں تبدیلی لانے کا تصور پریم چند کی ابتدائی کہانیوں ہی سے سامنے آ گیا تھا۔ اس حوالے سے وہ مقصدی ادب کو پروان چڑھانے پر زور دیتے رہے۔ ۱۸۵۷ کے بعد سرسید اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں جو علمی ادبی تحریک کا آغاز

ہوا تھا پریم چند اس سے متاثر تھے۔حالی کی سادگی اور انجمن پنجاب کی کاوشوں سے بھی آپ متاثر تھے۔۔ان کی ابتدائی کہانیوں میں حقیقت نگاری کا پہلو نمایاں رہا ہے۔ پریم چند اس نکتہ سے واقف تھے کہ حقیقت نگاری کا محدود تصور فن کو تباہ کر دیتا ہے۔اس سے قبل جو ادب لکھا جا رہا تھا وہ صرف گل وبلبل کے آس پاس نظر آتا ہے پریم چند اپنے افسانوں کا کینواس سماجی زندگی کے مسائل اور سیاسی حالات کو بنا کر ہندوستان مین ایک عظیم انقلاب پر پا کرنے میں کامیاب رہے۔

پریم چند کامیاب نثر نگار تھے۔انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار اپنے افسانوں اور ناول سے کیا۔معاشرے کی بدحالی کا ایسا نقشہ پیش کیا کی ان کے افسانے اور ناول ایک آئینہ بن گئے جو صرف سچائی کو پیش کرتے ہیں۔آپ نے سماج کے کمزور طبقے کی خاطر لکھنے پر مجبور ہوئے۔سماج میں بٹے ہوئے طبقوں کو سماجی انصاف کی وکالت آپ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

عورتوں کے مسائل پر کھل کر لکھنے کا ہنر آپ میں تھا۔مذہبی ظلم و جبر کو وہ دور کرنا چاہتے تھے۔ پریم چند نے اردو افسانے کو ایک مقصد اور معنویت عطا کیا۔زندگی کے خدوخال بیان کئے۔ان کے افسانے آزادی کے جذبے کو ابھارنے کا کام کئے۔ پریم چند کی بصارت اور بصیرت کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ان مظلوم طبقے کی جانب توجہ کی اور کھل کر لکھا۔

پریم چند نے اپنے افسانوں میں نہایت ہی سادہ زبان استعمال کی اور سنسکرت کے الفاظ کا کم استعمال کیا۔ اکثر کرداروں کے مکالمے ان کی معاشی اور معاشرتی حیثیت کے مطابق تھے جو ایک مظلوم طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔آپ کا تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ اور زبردست مشاہدے کا غماز ہے۔آپ نے لوگوں کو حقیقت پسندی سے روشناس کرایا ہے۔اُس وقت جب ہندوستان میں مذہبی داستانیں اور مافوق الفطرت موضوعات عروج پر تھے لوگ قصے کہانیوں میں ایسی مزیدار اور دلچسپ کہانیوں سننے کے عادی تھے۔بناوٹی اور خیالی معاملات وموضوعات سے لوگ جڑ کر اپنی سوچ وفکر اس میں لگا دئے تھے اور اسی کو دنیا سمجھ بیٹھے تھے۔،انھوں نے علاقائی،معاشرتی اور معاشی مسائل پر قلم اٹھایا سماج کی بے راہ روی پر لکھا اور طبقاتی کشمکش پر گہرے چوٹ کی۔امیر غریب کے فرق پر کھل کر لکھا۔آپ نے ہندوستان کے دیہی موضوعات سے ساتھ ساتھ متوسط شہری کی زندگی کے مسائل پر بھی لکھا۔

پریم چند کے کردار اکثر معاشرے کے ستائے ہوئے یا وہ مظلوم لوگ ہیں جو عام لوگوں میں شمار ہوتے ہیں عام لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے ان ستائے ہوئے اور کچلے ہوئے مظلوم لوگوں خصوصاً دیہاتوں میں جاگیرداروں اور مہاجنوں کے ظلم کے مارے ہوئے لوگوں کو آواز دی ہے اور ان کے مسائل کو فن کا موضوع خاص

بنایا ہے ۔ ان کے اندر آزادی کی تڑپ اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا ۔ ایک نئی دنیا تعمیر کی اور طبقات سے آزاد معاشرے کا وجود ان کا بنیادی نظریہ تھا۔ جو کہ ان کے افسانوں سے ظاہر ہے۔ کفن افسانہ اس سماج پر ایک کرارا تھپڑ ہے جو سماج ترقی تغیر وتبدل کی دہائی دیتا رہا۔لوگ مذہب کی آڑ میں نچلے طبقے کے لوگوں پر ظلم وستم جبر وتشدد کی بجلیاں گراتے ہیں۔ جو کہ ہر حال میں ناانصافی اور زیادتی ہیں ۔ بے حس سماج آنکھیں بند کئے ہوئے ہے۔

پریم چند نے آزادی کی تحریک میں گاندھی جی کے ساتھ شامل ہونے کی خاطر ملازمت چھوڑ دیا ور غریب، مجبور، بے سہارا اور معاشی اعتبار سے کمزور لوگوں کی زندگی کو موضوع فن بنایا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ پریم چند کا مطالعہ کیوں ضروری ہوجاتا ہے؟

۲۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کا آغاز کب سے ہوتا ہے؟

۳۔ پریم چند کس کی علمی ادبی تحریک سے متاثر تھے؟

3.7 خلاصہ

پریم چند بنیادی طور پر مذہب کے بیجا اصول اور طبقاتی جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں ۔ ساتھ ہی فرد کی آزادی کو بھی اہم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر انسان کا جینا دشوار ہے۔ ان کے فن پر رومانیت پر وطن پرستی کا رنگ غالب ہے جس کا جابجا اظہار ان کی ابتدائی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ پریم چند محبت کا تصور رومانوی اثرات کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق کا اظہار کرنے سے کتراتے ہیں۔ کیونکہ ان کی سوچ ان کا تصور محبت سماجی روایت سے جڑا ہوا ہے۔ جس میں محبت کے کئی رنگ موجود ہیں۔ جس میں حب الوطنی، دبے کچلے ہوئے طبقات سے ہمدردی، مادی حقائق کی اہمیت کو تسلیم کرنا وغیرہ۔ ان کا ذہن محنت کش طبقے کی جانب زیادہ مائل ہے، مذہب کے ٹھیکیداروں سے وہ سخت نالاں ہیں۔

وہ ماضی کی خامیوں کو دور کر کے ایک نیک اور صالح سماج کی جانب مائل ہوا یسی سوچ رکھتے تھے۔ مگر ہمارا سماج غلط بندھنوں اور سماج کے بیکار روایات سے بندھا تھا۔ دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح ظاہری چیزوں سے صرف اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ وہ آنکھ سے ان چیزوں کو ہی نہیں دیکھتے بلکہ سماجی رویوں کے حوالے سے پہچان کراتے ہیں۔ ان کے یہاں تخیل کی بلندی ضروری ہے لیکن ان کے پاؤں اپنے سماج اور زمین سے اوپر نہیں اٹھتے ۔ کیونکہ

آپ زمینی حقائق سے واقف تھے۔آپ اپنا ایک فطری نظریہ حیات رکھتے ہیں۔ وہ ماضی کے تسلسل اور اس کے حالات کی روشنی میں میں حال کی پہچان کرنا چاہتے ہیں۔انقلاب اوررومان کا ایک ایسا امتزاج جو شاید اردو یا ہندوستانی ادب مین نہیں ملتا پریم چند اس نئے اور انوکھے مزاج کے خالق ہیں۔ ان کی فن کا مرکز ومحور انسان اور انسان دوستی ہے۔اردوادب میں ندرت خیال کے لئے پریم چند کو ہمیشہ یادرکھا جائے گا کیونکہ وہ اپنی بات کو نئے انداز مین پیش کرتے بات وہی ہوتی لیکن انداز نیا ہوتا۔

3.8 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ پریم چند کی حالت زندگی پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ پریم چند کے افسانوں کے موضوعات بیان کیجیے۔

۳۔ پریم چند نے ملازمت کیوں چھوڑی؟

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ پریم چند کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالئے۔

۲۔ پریم چند کے افسانے حقیقت پسندی اوررومانیت کا ایک سنگم ہیں واضح کیجئے

۳۔ 'پریم چند نے طبقاتی کشمکش پر بیباک ہوکر لکھا' آپ اس بات سے کس حد تک متفق ہیں۔

3.9 فرہنگ

ربط	تعلق	بصیرت	دانائی، آگاہی
تخیل	تصور، قیاس	سطحی	اوپری، سرسری
دانش مندی	عقل مندی	سنگم	میل۔ملاپ
کشمکش	پریشانی	بیباک	نڈر رہوکر کہنا، صاف کہنا
تمدن	کلچر	ندرت	نیاپن

3.10 معاون کتابیں

تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ
قلم کا مزدور	مدن گوپال
پریم چند کے افسانوں میں حقیقت کی تلاش	ڈاکٹر واجد قریشی
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احتشام حسین
شعور و فن	فخر الاسلام اعظمی
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	فخر الاسلام اعظمی
پریم چند فن اور تعمیر فن	پروفیسر جعفر رضا

☆☆☆

اکائی : ۴۔ راجندر سنگھ بیدی

ساخت :

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 راجندر سنگھ بیدی کا عہد

4.4 راجندر سنگھ بیدیکی حیات وشخصیت

4.5 راجندر سنگھ بیدی کی ادبی خدمات

4.6 راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کی خصوصیات

4.7 خلاصہ

4.8 نمونۂ امتحانی سوالات

4.9 فرہنگ

4.10 معاون کتابیں

4.1 اغراض ومقاصد

اردو اختیاری میں راجندر سنگھ بیدی کی حیات اور کارناموں کے ساتھ ان کے منتخب افسانوں کی تدریس کے ذریعے درج ذیل اہداف حاصل کیے جاسکتے ہیں:

☆ طلبہ کو اردو نثر کی اہم صنف 'افسانہ' کے مبادیات اور عناصرِ ترکیبی سے روشناس کرانا۔

☆ راجندر سنگھ بیدی کے ہم عصر افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف پیش کرنا

☆ راجندر سنگھ بیدی کے سوانحی کوائف اور اردو افسانے کی ترقی میں اُن کی بے مثال خدمات سے طلبہ کو واقف کرانا۔

☆ راجندر سنگھ بیدی کو بطور ایک اہم ترقی پسند افسانہ نگار متعارف کرانا۔

☆ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے موضوعات، ان کی کردار نگاری، اسلوبِ نگارش اور دیگر فنی خوبیوں کا محاسبہ کرنا۔

☆ 'افسانے' کا تنقیدی تجزیہ کرنا۔

4.2 تمہید

راجندر سنگھ بیدی کا شمار اردو کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے ترقی پسند تحریک کے زیرِ سایہ اردو افسانے کو فکر وفن کی نئی جہات سے روشناس کرایا۔متوسط طبقے کے اجتماعی مسائل کو پیش کرنے اور افراد کی نفسیات اور خاندانی روابط و رویوں کا تجزیہ کرنے میں انھیں غیر معمولی دست رس حاصل تھی۔ انھوں نے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی مادی ونفسیاتی ضرورتوں کو جس فن کاری سے پیش کیا ہے،اس کی مثالیں ان کے پیش رووں اور معاصرین میں نہیں ملتیں۔ دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح بیدی نے طبقاتی کشمکش اور سماجی رویوں کو صرف مادی وسائل کی بنیادوں پر آنکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انھوں نے مذہبی وتہذیبی وراثت اور تاریخی وجغرافیائی عوامل کو بھی مدّ نظر رکھا۔جس پس منظر میں ان کی ذہنی وفکری تربیت ہوئی تھی،اس کا اثر ان کی اثر آخرِ عمر تک قائم رہا۔اُن کے والد سکھ تھے اور والدہ ہندو۔بچپن لاہور کے مسلم محلوں میں گزرا تھا اور جب ترقی پسند تحریک سے واسطہ پڑا تو مذہب کو ایک اضافی چیز سمجھنے لگے۔بچپن سے غربت دیکھی تھی، والدہ کی بیماری اور والد کی معاشی پریشانیوں کے سائے میں پروان چڑھے تھے اس لیے زود رنجی اُن کے مزاج کا حصّہ بن گئی۔ بہر حال بیدی کی شخصیت کی تشکیل میں اور انھیں ایک کام یاب افسانہ نگار بنانے میں بے شمار عوامل نے حصّہ لیا ہے۔

اردو کے جدید اسالیبِ نثر میں 'افسانہ' ایک دل چسپ ،سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مقبولِ عام صنف ہے۔بیسویں صدی کے آغاز سے اردو افسانے کا دور شروع ہوتا ہے اور آج اکیسویں صدی کی دو دہائی گزرنے کے بعد بھی'افسانہ' نہ صرف اردو کی اہم ترین صنفِ نثر کی مسند پر فائز ہے بلکہ مختلف ادبی تحریکات، رجحانات اور تجربات سے گزرتا ہوا،مسائلِ زندگی کی عکاسی کرنے اور اپنے عہد کی سماجی وسیاسی ترجمانی کرنے میں، یہ مضبوط سے مظبوط تر اور مفید سے مفید تر ہوتا جا رہا ہے۔اس وسیع ترین کائنات کا ہر موضوع اِس کی گرفت میں ہے۔اس میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو فن کاری کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے۔فرد کی ذات کا المیہ ہو یا اس کے نفسیاتی مسائل کا تجزیہ، سماج میں موجود طبقاتی کشمکش اور اس سے ابھر آنے والے مسائل ہوں یا مختلف انقلابی و سیاسی تحریکیں، نظریاتی جنگیں ہوں یا مذہبی، لسانی اور علاقائی تعصّبات، سائنسی وتکنیکی پیش رفت اور ان سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں ہوں یا ارضی وسماوی آفات، مادی علوم وفنون کی ترقی ہو یا روحانی سفر کی حیرت انگیزیاں، بادشاہی زندگی کا جاہ وجلال ہو یا فقیر کے کٹیا کی کہانی، اردو افسانے نے ہر موضوع کو کام یابی سے برتا ہے۔اس عرصے میں افسانہ نگاروں نے اسلوب اور تکنیک کے بیش بہا تجربات کیے ہیں اور'ادب برائے ادب' اور'ادب برائے زندگی' دونوں کے قائلین نے اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے'افسانے' ہی کو موضوع ترین صنف سمجھا ہے۔اسی لیے

رومانیت اور تخیل پسندی کے بہترین نمونے اور سفاک حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں، اردو افسانوں کے خزانے میں موجود ہیں۔

'افسانہ' ایک مخصوص صنفِ ادب ہے جو اپنی ماہیت، نوعیت اور مقصد کے لحاظ سے دیگر اسالیبِ نثر سے علاحدہ شناخت رکھتی ہے۔ اس میں کسی واقعے، کردار، جذبے، احساس، تاثر، اصلاحی مقصد یا روحانی کیفیت کو اس طرح کہانی کے روپ میں سمیٹا جاتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد وہ کوئی مثبت یا منفی رائے ضرور قائم کرتا ہے۔ انسانی زندگی، اس کے رشتوں اور رویوں میں بوالعجبی ہے۔ انسان ہمیشہ متوقع اور یقینی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوتا۔ اتفاقات، حادثات اور غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا کرنا بھی اس کا مقدر ہے۔ 'افسانہ' اِن بے شمار کہانیوں میں سے کسی ایک کو فن کاری کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے اس شرط کے ساتھ کہ وحدتِ تاثر قائم رہے اور قاری گراں بار ہوئے بغیر اسے ایک نشست میں مکمل کر سکے۔ فنی اعتبار سے 'افسانہ'، ڈرامے، خاکے، انشائیے، ناول اور ناولٹ سے الگ ہوتا ہے گو کہ ان میں سے ہر صنف، زندگی سے بھرپور کہانیاں اور جیتے جاگتے کردار پیش کرتی ہے لیکن ہر صنف اپنی پیش کش اور مقاصد کے لحاظ سے دوسری صنف سے ممتاز اور منفرد ہوتی ہے۔ موضوع، سرخی، پلاٹ، فضا یا ماحول، کردار اور مکالمے وغیرہ دراصل مشترک عناصرِ ترکیبی ہیں جو ہر صنف کے فنی تقاضوں کے تحت جلوہ گر ہوتے ہیں، مصنف کی تخلیقی صلاحیتیں اور اس کا اسلوبِ تحریر انھیں فن پاروں میں تبدیل کرتا ہے۔ ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کی زندگی کو پیش کرتا ہے، وہ اپنے عہد کی تبدیلیوں کو انگیز بھی کرتا ہے اور اس پر کسی نہ کسی صورت اثر انداز ہونے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اردو افسانے کا تاریخی و تدریجی مطالعہ کر کے ہم برّ صغیر کی سماجی، سیاسی، لسانی، تہذیبی و ثقافتی اور دیگر مادی تبدیلیوں کا گراف تیار کر سکتے ہیں۔

اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز منشی پریم چند کے افسانے 'دنیا کا سب سے نمول رتن' سے ہوتا ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۰۷ء میں کان پور سے نکلنے والے رسالے 'زمانہ' میں شائع ہوا تھا۔ ان سے پہلے سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان کے بعض افسانوں کا ترجمہ پیش کیا تھا۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ مصورِ غم اور معروف ناول نگار علامہ راشد الخیری کے افسانے 'نصیر اور خدیجہ' کو تاریخی لحاظ سے اولیت حاصل ہے۔ اُن کا یہ افسانہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا ہے اس لیے موصوف ہی اردو کے پہلے افسانہ نگار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک منشی پریم چند سے پہلے کئی ادیبوں کی ایسی تخلیقات شائع ہوئی ہیں جنھیں 'افسانہ' قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ منشی پریم چند ابتدائی دور کے ہمارے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے تین سو سے زیادہ افسانوں میں دیہاتی زندگی اور اس سے جڑے مسائل کو پورے خلوص اور فن کارانہ چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ اُن کا افسانہ 'کفن'

سماجی حقیقت نگاری اور انسانی رشتوں اور رویوں کی سفاک کہانی سناتا ہے۔ پریم چند کی زندگی ہی میں ہندستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کُل ہند کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت انھوں نے کی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو زندگی سے قریب لانے کے ساتھ اُسے سیاسی انقلاب کے حصول کا آلۂ کار بنایا۔ ترقی پسند تحریک کی جڑیں اشتراکیت میں پیوست تھیں اور اس سے وابستہ تمام مصنفین اور شعرا ،سماجی نابرابری کو ختم کرنے ،سرمایہ دارانہ نظام سے چھٹکارا پانے ،مزدوروں اور محنت کشوں کو اُن کا حق دلانے اور عوامی انقلاب برپا کرنے کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔ راجندر سنگھ بیدی نہ صرف ترقی پسند تحریک کے ادبی مقاصد سے کلی طور پر متفق تھے بلکہ وہ اشتراکی طرز زندگی ہی کو انسانیت کی نجات کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے ابتدا ہی سے ان کے افسانوں میں غریب اور متوسط طبقے کے مسائل اور ان سے لوہا لیتے ہوئے کردار نظر آتے ہیں۔ اپنے معاصرین میں بیدی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے کبھی فنی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ مقاصد پیشِ نظر ضرور رہے لیکن کہانی کے فطری تقاضوں کو پورا کرنے میں ان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر عطیہ رئیس نے لکھا ہے:

> ’’حالانکہ راجندر سنگھ بیدی ترقی پسند تحریک سے اُسی حد تک وابستہ تھے کہ اپنے اِردگرد کے پس منظر اور ماحول کی مصوّری اور مرقع کشی کر سکیں کیوں کہ بیدی کا خیال تھا کہ ادب کو تحریکوں کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ اُن کی نظر میں سب سے زیادہ اہم چیز انسان کا اپنا وجود اور اُس کا اپنا ذہن ہوتا ہے، جو تخلیق کرتا ہے۔ یہی تخلیق بیدی کی نگاہ میں سچا ادب تھا۔ اِسی متوازن مزاج وخیالات نے راجندر سنگھ بیدی کی ترقی پسندی کو کبھی انتہا پسندی کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیا۔‘‘

4.3 راجندر سنگھ بیدی کا عہد

راجندر سنگھ بیدی کے معاصرین میں سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، بلونت سنگھ، اپندر ناتھ اشک خواجہ احمد عباس وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ تھے۔ اس دور کے تمام افسانہ نگار فکری و عملی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نہ صرف اشتراکیت ہی کو انسانوں اور انسانیت کے تمام مسائل کا حل سمجھتا تھا بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے اشتراکی انقلاب کے لیے راہیں ہموار کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے اردو کو بہترین افسانے دیے۔ ان افسانہ نگاروں نے زندگی کے

مسائل پورے خلوص اورفن کاری سے پیش کیا۔ ہر افسانہ نگار کی اپنی شناخت قائم ہوئی۔راجندر سنگھ بیدی اپنے معاصرین میں ایک خاص امتیازی اسلوب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔متوسط طبقے کے سماجی اورنفسیاتی مسائل کو بیدی نے غیر معمولی فن کاری سے پیش کیا ہے۔منٹو کے مقابلے میں بیدی کے قلم میں زیادہ تنظیم اور رکھ رکھاو پایا جاتا ہے۔ان کا خاص موضوع عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کے مسائل کو سماج کے گوش گزار کرنا تھا۔گرم کوٹ، تلادان، رحمٰن کے جوتے، لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دو، گرہن، ایک باپ بکاو ہے، کوارنٹین، پان شاپ، ٹرمینس سے پرے جیسے افسانوں میں بیدی کے تجزیہ نگار قلم کا عروج دیکھا جاسکتا ہے۔ان کے نسوانی کردار زیادہ طاقت ور اور زندگی سے بھرپور ہیں۔

منٹو کا اپنا الگ رنگ ہے۔ان کے قلم میں بے باکی ہے۔انھوں نے اپنے عہد کی خود ساختہ اقدار سے بغاوت کی ہے۔زندگی کے مختلف مظاہر اور عناصر کا تجزیہ کرتے وقت ان کا قلم کچھ زیادہ سفاک ہو جاتا ہے۔جنسیات پر لکھنے کی وجہ سے منٹو کو بہت ساری مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، ان پر، مقدمے قائم ہوئے، انھیں عدالت کے چکر کاٹنے پڑے لیکن بالآخر وہ سنجیدہ اور باشعور قارئین کو اپنا ادبی نقطۂ نظر سمجھانے میں کام یاب ہوئے۔

راجندر سنگھ بیدی کے دیگر معاصرین میں ایک بہت بڑا نام کرشن چندر کا ہے۔انھوں نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ لکھا اور اپنے عہد میں وہ سب سے زیادہ پسند کیے گئے۔انھوں شہروں میں زندگی بسر کرنے والے غریبوں کے حقیقی مسائل تک پہنچنے کی کوشش بھی کی اور دولت وشہرت کے لیے سیٹھ ساہوکاروں کی بےلگام حرص اور بیمار ذہنیت کو بھی نشانہ بنایا۔امیروں کی جنسی بے راہ روی اور مجبور عورتوں کے استحصال کو اجاگر کرنے میں کرشن چندر کا قلم زیادہ کام یاب رہا ہے۔کرشن چندر کے ابتدائی افسانے خالص رومانی ہیں لیکن آہستہ آہستہ اُن کے قلم نے اپنا اصل میدان تلاش کرلیا گو کہ رومانیت ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔

عصمت چغتائی نے شمالی ہندستان کے متوسط خاندانوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان مشترکہ خاندانوں میں خاص طور سے عورتوں کے مسائل کو عصمت نے بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔زبان کے اعتبار سے بھی ان کے افسانے منفرد ہیں۔احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کے مسلم دیہاتوں کی تصویر کشی کی ہے۔انھوں نے مسلم جاگیرداروں اور محنت کش عوام کی طبقاتی کشمکش کو بھی پیش کیا ہے اور اپنے سماج سے ہم آہنگ نہ ہونے والے افراد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔انھیں اپنے قارئین کو اعتماد میں لے کر کہانی سنانے کا فن آتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ راجندر سنگھ بیدی کے معاصرین کے نام لکھیے۔

۲۔ راجندر سنگھ بیدی کے معاصرین کس تحریک سے وابستہ تھے؟

۳۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا خاص موضوع کیا رہا ہے؟

۴۔ عصمت چغتائی کے افسانوں کا کیا موضوع ہے؟

4.4 راجندر سنگھ بیدی کی حیات وشخصیت

معروف ترقی پسند افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر 1915ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی گاؤں "ڈلے کی" تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ تھا۔ ان کی والدہ سیوا دیوی ہندو برہمن تھیں، جبکہ والد ہیرا سنگھ ذات کے کھتری اور مسلک کے اعتبار سے بیدی تھے۔ یہ خاندان وید کو اپنا گرنتھ ماننے کے باعث بیدی (ویدی) کہلاتا ہے۔ ان کے والد ہیرا سنگھ لاہور کے صدر بازار ڈاک خانے کے پوسٹ ماسٹر تھے۔ بیدی کی ابتدائی تعلیم لاہور چھاونی کے اسکول میں ہوئی جہاں سے انھوں نے چوتھی جماعت پاس کی اس کے بعد ان کا داخلہ ایس بی بی ایس خالصہ اسکول میں کرادیا گیا، انھوں نے وہاں سے 1931 میں فرسٹ ڈویزن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد انھوں نے ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ لیکن انٹرمیڈیٹ تک ہی پہنچے تھے کہ والدہ کا، جو ٹی بی کی مریضہ تھیں، انتقال ہوگیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کے والد نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ 1933 میں بیدی نے کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑی اور ڈاک خانے میں ملازم ہوگئے۔ یہاں ان کی تنخواہ 46 روپے ماہوار تھی۔ ملازمت کے دوران انھیں ہر قسم کے کام کرنے پڑتے تھے۔ ڈیوٹی کے اوقات بھی مقرر نہیں تھے۔ کبھی کبھی سترہ اٹھارہ گھنٹے بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں فرصت کے اوقات میں مطالعہ کرنا ہی بیدی کا محبوب مشغلہ تھا۔ ساتھ ہی افسانہ نگاری بھی جاری تھی۔ اس دوران وہ ریڈیو کے لیے بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کے افسانے ملک کے اہم ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ 1934 صرف اُنیس سال کی عمر میں بیدی کی شادی سوماوتی عرف ستونت کور سے شادی ہوئی۔ سوماوتی ایک گھریلو خاتون تھیں۔ وہ بیدی کی قلیل آمدنی میں شاکر تھیں اور خوش انتظامی سے گھر کے اخراجات چلاتی رہیں۔ 1936 میں بیدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'دانہ ودام' منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے میں ان کی ابتدائی دور کے تمام اہم افسانے مثلاً بھولا، کوارنٹین، گرم کوٹ، وٹامن بی، پان شاپ، دس منٹ بارش میں اور تلادان وغیرہ شامل تھے۔ 1943ء میں بیدی نے ڈاک خانے کی ملازمت سے استعفیٰ

دے دیا۔ بیدی کی ادبی حیثیت مستحکم ہورہی تھی۔انھیں لاہور سے نکلنے والے ادبی رسالے 'ادبِ لطیف' کا اعزازی مدیر بنایا گیا۔ پطرس بخاری اس وقت آل انڈیا ریڈیو میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں بیدی کا تقرر بطور ریڈیو آرٹسٹ کیا۔ بیدی یہاں پر ریڈیو پروگرام کے تقاضوں کے مطابق اسکرپٹ تیار کرتے تھے۔ یہاں انھیں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ بیدی کو جنگی نشریات کے لیے صوبۂ سرحد کے ریڈیو پر بھیج دیا گیا۔تنخواہ بھی پانچ سو روپے ماہانہ ہوگئی۔ بیدی نے ایک سال وہاں کام کیا پھر ملازمت سے استعفا دیا اور لاہور آ گئے۔ یہاں انھیں مہیشوری فلم کمپنی میں ملازمت مل گئی لیکن ایک سال بعد انھوں نے اسے بھی چھوڑ کر 'سنگم پبلشنگ ہاؤس' قائم کیا۔ 1947 میں تقسیمِ ہند کا المیہ پیش آیا۔ بیدی کو لاہور چھوڑنا پڑا۔ وہ کچھ دن روپڑ اور شملہ میں رہے۔اسی دوران ان کی ملاقات شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ سے ہوئی۔انھوں نے بیدی کو جموں ریڈیو اسٹیشن کا ڈائریکٹر مقرر کیا۔ 1948ء میں تقریباً آٹھ ماہ جموں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر رہے۔ وہ 1949ء میں ممبئی آ گئے۔ ممبئی کی فلم نگری میں ان کا داخلہ ہوا۔ 'فیمس پکچر کمپنی' میں انھیں ایک ہزار روپے ماہانہ پر مکالمہ نویسی کا کام مل گیا۔ ممبئی کی فلم انڈسٹری میں بیدی نے بطور اسٹوری رایٹر، ڈائلاگ رائٹر، اسکرین رائٹر، ڈائرکٹر اور فلم پروڈیوسر تقریباً تیس سال گزارے۔ بیدی نے تقریباً ستر فلموں کے مکالمے لکھے۔ ان میں بڑی بہن، داغ، مرزا غالب، دیوداس، ستیہ کام اور ابھیمان کے مکالمے اپنی ادبیت اور کردار و ماحول شناسی کی بنا پر سراہے گئے۔ بیدی نے فلم ساز کی حیثیت سے گرم کوٹ، رنگولی، بھاگن اور آنکھیں نامی فلمیں بنائیں۔ 1956 میں انھیں گرم کوٹ کے لیے بہترین کہانی کا فلم فیر ایوارڈ ملا۔ دوسرا فلم فیر ایوارڈ ان کو مدھومتی کے بہترین مکالموں پر اور تیسرا 1971 میں ستیہ کام کے مکالموں کے لیے دیا گیا۔ **1965** میں ان کو ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا۔ دستک کو اعلیٰ فنی خوبیوں کی بنا پر 1970ء کا قومی ایوارڈ دیا گیا۔ 1978 میں ان کو ڈرامہ کے لیے غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ممبئی میں بیدی نے زندگی کے اچھے دن بھی دیکھے اور تلخیوں میں بھی گزارا کیا۔ ان کی گھریلو زندگی تنازعات کا شکار ہوئی، بیوی کا انتقال ہوا۔ ان کا بیٹا نریندر بیدی جس کے لیے خود انھوں نے فلم انڈسٹری میں مواقع پیدا کیے تھے اور جو فلم ڈایریکٹر اور پروڈیوسر بن گیا تھا، 1982 میں انتقال کر گیا۔ بیدی کے آخری ایام بیماریوں اور کس مپرسی میں گزرے۔ 1982 میں ان پر فالج کا حملہ ہوا پھر وہ کینسر میں مبتلا ہو گئے۔ 1984ء میں بمبئی میں ان کا انتقال ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ راجندر سنگھ بیدی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ بیدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'دانہ ودام' کس سن میں منظرِ عام پر آیا؟

۳۔ 1965ء میں بیدی کو کس تصنیف پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا؟

۴۔ راجندر سنگھ بیدی کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

4.5 راجندر سنگھ بیدی کی ادبی خدمات

افسانوی مجموعے : دانہ ودام (1936، لاہور) ، گرہن (1942، لاہور) ، کوکھ جلی (1949، ممبئ) ، اپنے دکھ مجھے دے دو (1965، دہلی) ، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (1974، دہلی) ، مکتی بودھ (1982، دہلی)

ڈراموں کے مجموعے : بے جان چیزیں (1943، لاہور)، سات کھیل (1946، لاہور)

ناولٹ : ایک چادر میلی سی (1962، دہلی)

راجندر سنگھ بیدی اپنے عہد کے بڑے اور صاحبِ طرز ادیب تسلیم کیے گئے۔ بعض لوگوں کے خیال میں وہ ترقی پسند نسل کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے فن پاروں میں متوسط طبقے کے متنوع کرداروں، ان کے رنگا رنگ ماحول، ان کے مابین انسانی رشتوں کے اتار چڑھاؤ سے ایک جہانِ معنی خلق ہوا ہے۔ بیدی کے افسانوں اور ناولوں میں متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی ہندوستانی عورت کے کردار اور مزاج کی جو تصویر کشی ملتی ہے اس کو ان کی افسانہ نگاری کا نقطۂ عروج کہا جاتا ہے۔ بیدی کی ادبی زندگی کا آغاز 1932ء میں ہوا۔ ابتدا میں انہوں نے محسن لاہوری کے نام سے انگریزی اور اردو میں نظمیں اور افسانے لکھے جو کالج میگزین اور مقامی اخبارات میں شائع ہوئے۔ راجندر سنگھ بیدی کے نام سے پہلا افسانہ "دکھ سکھ" فارسی رسم الخط میں پنجابی زبان کے رسالے "سارنگ" میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کے مجموعوں میں باسٹھ افسانے اور سات مضامین اور خاکے شامل ہیں۔ سات مضامین اور سات افسانے ایسے بھی ہیں جو کسی کتاب میں شامل نہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ بیدی کی ادبی زندگی کا آغاز کس سن میں ہوا؟

۲۔ بتدا میں بیدی کس نام سے لکھا کرتے تھے؟

۳۔ بیدی کا دوسراافسانوی مجموعہ کون سا ہے؟

4.6 راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کی خصوصیات

بیدی کے افسانوں کا موضوع متوسط طبقہ اور اُن کی زندگی کے مسائل کے اِرد گرد گھومتا ہے۔ ملک کی تقسیم اور فسادات نے اردو کے تقریباً سبھی فنکاروں کو بری طرح جھنجھوڑا اور بیدی نے بھی اس موضوع پر بعض لازوال افسانے تخلیق کئے۔ بیدی کی کہانی ''لاجونتی'' کا مرکزی کردار بابو سندر لال ہے جس کی بیوی لاجونتی ملک کی تقسیم کے ہنگامے میں پاکستان ہی میں رہ گئی ہے۔ اس کہانی کا موضوع فسادات اور ان کی تباہ کاریاں ہیں۔ جہاں تک بیدی کا اسلوب تکنیک اور زبان کا تعلق ہے، وہ کسی فیشن اور فارمولے کے پابند نہیں بلکہ اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کو سماجی پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی کہانیوں کی روایتی تکنیک اور اس کے عناصر ترکیبی کی روایتی ترتیب نہیں ملتی۔ ان کے افسانوں کی تکنیک ان کے مواد، موضوع اور تخلیقی تجربوں سے ابھرتی ہے۔

بیدی انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار محض کٹھ پتلی بننے کی بجائے انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ باطنی کیفیتوں کو وہ اتنی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں کہ انسانی کردار کی تہیں اپنے آپ کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ''زین العابدین'' بیدی کی کہانیوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بیکار، اوباش اور چور ہے لیکن اپنے گرد و پیش کے کتنے ہی مہذب اور شریف لوگوں سے بہتر ہے۔ وہ چوری کرتا ہے اور اس جرم کا اعتراف بھی کرلیتا ہے، وہ خوب مار کھاتا ہے، قرض لیتا ہے، چوری کرتا ہے، مگر ایک عجیب قسم کی ایمانداری کے ساتھ۔ اس نے کسی کا دل نہیں دکھایا اور اتنا خراب و برباد ہونے کے باوجود اس میں انسانیت کی چنگاری روشن ہے۔ بیدی نے اپنی افسانہ نگاری کا اس وقت آغاز کیا جب اردو میں اچھی کہانیاں برائے نام تھیں اور فضاء ایک نئے فنکار کیلئے سازگار تھی کیونکہ مقابلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان دنوں پریم چند اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سماجی موضوعات بہت مقبول تھے اور اس عہد کی کہانیوں میں رومانیت، جذباتیت اور خطابت غالب تھی۔ بیدی کی کہانیاں رومانی نہ ہوکر حقیقت پسندانہ جذباتی ہونے کی بجائے گہری سوچ کی آئینہ دار اور خطیبانہ نہ ہوکر ایک لطیف طنز کی حامل تھیں۔ انہوں نے اپنے فن کی بنیاد تخیل اور مشاہدے کے سنگم پر رکھی۔

بیدی ایک باشعور فنکار ہیں، اس لئے بچوں کے جذبات اور بوڑھوں کی نفسیات پر ان کی یکساں نظر ہے۔ دانہ و دوام میں پہلا افسانہ بھولا ایک ایسے معصوم بچے کی کہانی ہے جسے کہانیاں سننے کا شوق ہے۔ ایک بار اپنے نانا سے دن میں کہانی سنتا ہے، اگر چہ یہ جانتا ہے کہ دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اور پھر واقعی بھولا کے ماموں راستہ بھول جاتے ہیں اور آخر کار بھولا سب لوگوں کے سو جانے کے بعد انہیں تلاش کرنے کے لئے نکل پڑتا ہے۔ یہ ایک بچے کے بھولے پن کی کہانی ہی نہیں بلکہ اس بنیادی ضرورت کی کہانی بن گئی ہے کہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ دکھائی جائے۔ ''دانہ و دام'' کی اکثر کہانیوں میں بچہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اردو افسانے کے اولین علمبرداروں میں فیض الحسن بی اے، علی محمود، شرر، یلدرم، راشد الخیری اور پریم چند کے نام لئے جا سکتے ہیں لیکن اردو افسانے کو فکر و فن اور اسلوب و مواد کے اعتبار سے پریم چند نے بلند معیار عطا کیا۔ پریم چند سے راجندر سنگھ بیدی تک اردو افسانے کا رنگ و آہنگ بدلتا رہا۔ جہاں تک بیدی کا تعلق ہے وہ کسی ایک رجحان کے دائرے میں قید نہیں رہ سکے۔ ان کے فن کا ارتقاء مختلف سمتوں میں ہوا ہے۔ انہوں نے ادب اور زندگی کے تعلق کو میکانکی طور پر نہیں بلکہ متحرک، لچکدار اور سیال صورت میں قبول کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بہت سے رجحانات ایک دوسرے میں ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بیدی کی کردار نگاری سے متعلق سید محمد افتخار مشرف نے لکھا ہے:

> '' بیدی انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار محض کٹھ پتلی بننے کی بجائے انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ باطنی کیفیتوں کو وہ اتنی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں کہ انسانی کردار کی تہیں اپنے آپ کھلتی چلی جاتی ہیں۔''

اور ان کی زبان سے متعلق فرماتے ہیں :

> ''بیدی کی زبان خالص بول چال کی زبان ہے، اس پر ادبیت کا رنگ غالب ہے۔ بول چال کی زبان میں ترسیلی عناصر کی فراوانی ہوتی ہے۔ بیدی کے ذخیرہ الفاظ میں ہندی اور پنجابی کے لفظ بھی شامل ہیں جو ان لوگوں کیلئے نامانوس اجنبی اور ناقابل قبول ہیں جو افسانوں میں ادبی زبان پڑھنے کے عادی ہیں۔ بیدی نے ہندی، پنجابی اور دوسری مقامی بولیوں کے ذخیرہ الفاظ سے استفادہ کر کے اردو کے دامن کو نئے جواہر سے مالا مال

کیا ہے۔ بیدی کو اردو کے افسانوی ادب میں بہت ممتاز مقام حاصل ہے
اور ایک بڑے افسانہ نگار کی حیثیت سے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔‘‘

اپنے مطالعے کی جانچ

ا۔ بیدی کے افسانوں کا موضوع کس کے اردگرد گھومتا ہے؟

۲۔ بیدی کے افسانے ’لاجونتی‘ کا کیا موضوع ہے؟

۳۔ کن کی نفسیات پر بیدی کی یکساں نظر ہے؟

4.7 خلاصہ

’افسانہ‘ ایک مخصوص صنفِ ادب ہے جو اپنی ماہیت، نوعیت اور مقصد کے لحاظ سے دیگر اسالیبِ نثر سے علاحدہ شناخت رکھتی ہے۔ اس میں کسی واقعے، کردار، جذبے، احساس، تاثر، اصلاحی مقصد یا روحانی کیفیت کو اس طرح کہانی کے روپ میں سمیٹا جاتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ بعض محققین کے نزدیک منشی پریم چند سے پہلے کئی ادیبوں کی ایسی تخلیقات شائع ہوئی ہیں جنھیں ’افسانہ‘ قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہرحال اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ منشی پریم چند ابتدائی دور کے ہمارے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے تین سو سے زیادہ افسانوں میں دیہاتی زندگی اور اس سے جڑے مسائل کو پورے خلوص اور فن کارانہ چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ یم چند کی زندگی ہی میں ہندستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔

اجندر سنگھ بیدی نہ صرف ترقی پسند تحریک کے ادبی مقاصد سے کلی طور پر متفق تھے بلکہ وہ اشتراکی طرز زندگی ہی کو انسانیت کی نجات کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے ابتدا ہی سے ان کے افسانوں میں غریب اور متوسط طبقے کے مسائل اور ان سے لوہا لیتے ہوئے کردار نظر آتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے معاصرین میں سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، بلونت سنگھ، اپندر ناتھ اشک خواجہ احمد عباس وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ تھے۔ اس دور کے تمام افسانہ نگار فکری و عملی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نہ صرف اشتراکیت ہی کو انسانوں اور انسانیت کے تمام مسائل کا حل سمجھتا تھا بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے اشتراکی انقلاب کے لیے راہیں ہموار کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر 1915ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد انھوں نے ڈی اے وی کالج

لاہور میں داخلہ لیا۔ لیکن انٹرمیڈیٹ تک ہی پہنچے تھے کہ والدہ کا، جو ٹی بی کی مریضہ تھیں، انتقال ہو گیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کے والد نے ملازمت سے استعفے دے دیا۔ 1933 میں بیدی نے کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑی اور ڈاک خانے میں ملازم ہو گئے۔ 1936 میں بیدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'دانہ ودام' منظرِ عام پر آیا۔

ان کے افسانوں کے مجموعوں میں باسٹھ افسانے اور سات مضامین اور خاکے شامل ہیں۔ سات مضامین اور سات افسانے ایسے بھی ہیں جو کسی کتاب میں شامل نہیں۔ ملک کی تقسیم اور فسادات نے اردو کے تقریباً سبھی فنکاروں کو بری طرح جھنجھوڑا اور بیدی نے بھی اس موضوع پر بعض لازوال افسانے تخلیق کئے۔ بیدی کے ذخیرہ الفاظ میں ہندی اور پنجابی کے لفظ بھی شامل ہیں جو ان لوگوں کیلئے نامانوس اجنبی اور نا قابل قبول ہیں جو افسانوں میں ادبی زبان پڑھنے کے عادی ہیں۔

بیدی کے آخری ایام بیماریوں اور کس مپرسی میں گزرے۔ 1982 میں ان پر فالج کا حملہ ہوا پھر وہ کینسر میں مبتلا ہو گئے۔ 1984ء میں بمبئی میں ان کا انتقال ہوا۔

4.8 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

۱۔ راجندر سنگھ بیدی کی حالت زندگی پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ راجندر سنگھ بیدی کی ادبی خدمات پر نوٹ لکھیے۔

۳۔ راجندر سنگھ بیدی نے کہاں کہاں ملازمتیں کیں؟

(ب) درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیے۔

۱۔ راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالئے۔

۲۔ راجندر سنگھ بیدی کے معاصر افسانہ نگاروں کا تعارف پیش کیجیے۔

۳۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے موضوعات بیان کیجیے۔

4.9 فرہنگ

ماہئیت	حقیقت، کیفیت
اشترا کیت	ساجھا،شرکت، ایک نظریہ جس کے مطابق پیداوار عوام کی مشترکہ ملکیت ہو۔
متنوع	قسم قسم کا
باطنی	پوشیدہ
بی شعور	عقل مند، سلیقہ مند، ہوشیار

4.10 معاون کتابیں

راجندر سنگھ بیدی — وارث علوی: ہندوستانی ادب کے معمار

راجندر سنگھ بیدی — ایک مطالعہ

راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے — ڈاکٹر اطہر پرویز

☆☆☆

نصاب

(حصہ دوم)

(۱) منشی پریم چند

۱۔ شکوہ شکایت

۲۔ بدنصیب ماں

۳۔ شانتی

۴۔ روشنی

۵۔ مالکن

۶۔ گلّی ڈنڈا

۷۔ انصاف کی پولیس

۸۔ قاتل کی ماں

(۲) راجندر سنگھ بیدی

۱۔ بھولا

۲۔ ہمدوش

۳۔ من کی من میں

۴۔ گرم کوٹ

۵۔ کوارنٹین

۶۔ وٹامن 'بی'

۷۔ تلادان

۸۔ ردِ عمل

منشی پریم چند

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصہ تو اسی گھر میں گزر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاضی اور بیدار مغز ہوں گے لیکن جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کئے ڈالتے ہو۔ جو گھر والوں کے لیے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے۔ تنگ دل ہے، مغرور ہے۔ کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لیے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے، اب انھیں کو دیکھو، صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے، نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی انھیں ایسی ہی دکانوں سے سودا سلف خریدنے کا فرض ہے۔ بارہا کہا کسی چلتی ہوئی دکان سے چیزیں لایا کرو۔ وہاں مال زیادہ کھپتا ہے، اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں ٹٹ پونجیوں سے ان کو ہمدردی ہے اور وہ انھیں الٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب۔ گھنا ہوا چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو، کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں تیل اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم، تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چکٹ ہی جائیں۔ مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتے ہوئی دکانوں پر جاتے تو جیسے انھیں ڈر لگتا ہے شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت برداشت نہیں ہوتی ہے۔ کہتی ہوں آخر ٹٹ پونجیوں کی دکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیے بس۔ آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟

کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں؟ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابلِ نہیں۔ دھوکہ کھاؤ گی میں ایک سنار کو جانتا ہوں۔ میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ برسوں ساتھ کھیلے ہیں۔ میرے ساتھ چال بازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا ایک زیورا اور پچاس روپے ان کے حوالے کیے اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا، اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی برسوں کا رماں خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنہیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں عار نہیں۔ ان کی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانے بھر کے فاقہ مست۔ قلاّنچ بے سرو ساماں ہیں جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لیے سر پر سوار رہتے ہیں۔ اور بلا لیے گلا نہیں چھوڑتے مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے روپے ادا کیے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے، دو بار کھو کر سیکھتا ہے۔ مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے اب مانگ کیوں نہیں لاتے۔ کیا مر گئے تمہارے دوست؟ تو بس بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں دیا جاتا۔ خیر سوکھا جواب نہ دو۔ میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی کرو۔ مگر ٹال تو سکتے ہو۔ کیا بہانے نہیں بنا سکتے ہو۔ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بے چارے کیسے انکار کریں۔ آخر لوگ جان جائیں گے یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انھیں امیر سمجھتی ہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گروی رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپے کے دارے نیارے نہ کر لے اسے کسی پہلو قرار نہیں ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میرا تو ناک میں دم آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درمان کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈہ ہے۔ ذرا سا تو گھر، مشکل سے دو تو چار پائیاں اوڑھنا بچھونا ہے۔ ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے، جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سرزمین پر پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں۔ گرمیوں میں خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آ جاتی ہے گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لیے قفس میں تڑپا

کروں۔اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتّے تک نہیں۔خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہیں جو ضرورت کے وقت ان کے دھیلے سے مدد کر سکے۔دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔لیکن اس مردِ خدا نے تو آنکھیں نہ کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ایسے ہی ناداروں سے ان کی ٹپتی ہے۔ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے آپ کا دوست ہے۔شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں، آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں، کسی کے پاس نہیں جاتے۔امراء مغرور ہیں، خوشامد پسند ہیں۔ان کے پاس کیسے جائیں۔دوستی گانٹھیں گے، جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہیں ملا۔میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی۔مگر بابو صاحب کو جلد از جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوتی۔گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے۔مگر آپ کو معلوم ہے کہ گاڑی رکی ہوئی ہے۔ایک دن جانے کہاں سے ایک بانگڑ و کو پکڑ لائے اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں! بڑا فرماں بردار ہے، پرے سرے کا ایماندار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز۔خیر میں نے رکھ لیا۔میں بار بار کیوں کر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں مجھے خود تعجب ہے۔یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا۔آدمیت کی علامت اس میں نہ تھی۔کسی کام کی تمیز نہیں، بے ایمان نہ تھا مگر احمق اول نمبر کا۔بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاتا ہے۔کم بخت دکان داروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ایک روپیہ بازار دے کر بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سور کے کان اکھاڑ لوں۔مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے۔میرا خون کھولنے لگتا لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا، جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے۔اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔کم بخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے، اس میں جھاڑو دیتا تو ادھر کی چیز ادھر، اوپر کی نیچے گویا سارے کمرے میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل، مگر آپ کمرے میں آرام سے بیٹھے رہتے گویا کوئی بات ہی نہیں۔ایک دن میں نے اسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا ''اگر کل سے تو نے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔'' سویرے سو کر اٹھتی ہوں تو دیکھتی ہوں تو کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے۔گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔آپ نے

فوراً ہنس کر کہا۔ دیکھتی کیا ہو۔ آج گھورنے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا۔ تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو، الٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔'' لیجئے صاحب یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا۔ اب روز مرہ کمرہ صاف ستھرا ملتا اور میری نگاہوں میں بھی گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اٹھ بیٹھی۔ اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی ہی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخوہ تو بے باق کرو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے اس پر تنخواہ بھی دے دوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ کرتا بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے رُکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بے کاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر ہوں یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آ جائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنونے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی کی شدت تھی اس کا مجھے خود احساس تھا۔ غریبوں پر کیا گزرتی ہے اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس افسوس کے سوا اور کیا علاج تھا۔ جب رؤسا اور امراء کے پاس ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری ہوئی ہے تو پھر غرباء کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر میں نے تو اسے جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا؟ اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ بہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جاتے وہ بھی سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی قدرت نے انھیں عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں۔ آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے آپ کی بلا سے آخر مجھ سے دیکھا نہ گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آ جائے۔ آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے۔ سیدھی سادی حماقت جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا، اسی کو میں نے کئی بار رات کو شراب کے نشے میں بدمست جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے اور تو پھر دوسروں کی

کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں گے۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیے؟ اتنی عمر گذر گئی۔ مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل میں میرے لیے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بے شک جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں، مطلق عذر نہیں مگر روپیہ بھی دے دوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں اتنی کہ بیچارے اپنے لیے بھی کچھ نہیں لاتے۔ میں کچھ منگوادوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں گھر میں عورت کے لیے طرح طرح کے شوق اور سنگار لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لیے مٹھائی کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں۔ قسم سی کھالی ہے۔ اس لیے میں تو انھیں بخیل کہوں گی۔ مردہ دل کہوں گی۔ فیاض نہیں کہہ سکتی دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص، نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں آپ کی منکسر مزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسران کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر یا ڈالی کی بات تو الگ ہے اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں۔ آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے بیچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مشکل کام آ جائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں دفتر میں انھیں گھستو اور پسّو وغیرہ خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی قسمت میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو؟ دنیا میں مروّت اور رواداری سے کام چلتا ہے، اگر ہم کسی سے کھنچے رہے تو کوئی وُجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے، پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہونچتا ہے جس پر اعتبار ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی افسر بھی انسان ہیں ان کے دل میں اعزاز و امتیاز کی ہوس ہوتی ہے وہ کہاں پوری ہوں جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسران سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیل دار ہیں گھر کی جائداد انھیں کی نگرانی میں

ہے، وہ شان سے رہتے ہیں۔ موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر ہیں مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی۔ میں نے کہا اپنے برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں۔ آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہوگی۔ میں نے بہت مجبور کیا، تو آپ نے خط لکھا معلوم نہیں خط میں کیا لکھا۔ لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟'' آپ نے ترش ہو کر کہا۔ ''ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے ہوا۔ ابھی کیا جواب آ سکتا ہے۔ ایک ہفتہ اور گزرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش کوئی نہ کوئی شگوفہ لیے ہوئے۔ میری خوشامد بھی ہو رہی ہے، میرے میکے والوں کی بھی تعریف ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دل جوئیاں محض اس لیے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں سارے ملکی، مالی، اخلاقی، تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کیے جاتے تھے۔ اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جاتے۔ محض اس لیے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے۔ لیکن میں کیا چوکنے والی تھی جب پورے دو ہفتے گزر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آ پہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا؟ تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا بھی حصہ گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا منافع نو دس سال قبل تھا، اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا۔ کبھی ایک جھنجھی کوڑی بھی ہمیں نہ ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیئے۔ دو ہزار نہ ہو، ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو، ڈھائی سو ہو، کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھرنے کو تو ہے۔ تحصیل دار کی آمدنی ہماری آمدنی سے چوگنی ہے اور رشوتیں بھی لیتے تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ ہیں ہیں، ہاں ہاں کرنے لگے۔ بیچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں۔ عزیز و اقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔ خوب! گویا جائیداد کا منشاء محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے بھی گھڑنے نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بنا دیتی۔ کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا نہ چھوڑا۔ دس ہزار کا غلہ خریدا تھا۔ اس میں خسارہ ہو گیا۔ گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی۔ اس میں دیوالہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی تو لچر سی بات۔ اس جولانی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بیوی سے قرض لیے تب کہیں جا کر کام چلا پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے ایسے برادران یوسف سے خدا بچائے۔

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں، دو بچیاں ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ، مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو بھی تیز نگاہ سے دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں بڑے صاحب زادے ابھی گھوم کر نہیں آئے۔ میں گھبرا رہی ہوں آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں اور اخبار چھین کر کہتی ہوں ''جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں۔ تمہیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا۔'' تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں۔ ''ابھی تک نہیں آیا بڑا شیطان ہے آج بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں۔ مارے تھپیڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔'' یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کو تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ ادھر جاتے ہیں دھر لڑکا آ جاتا ہے میں کدھوں سے آ گیا۔ وہ بے چارے تجھے ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسا مرمت ہوتی ہے یہ عادت چھوٹ ہی جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے۔ آج قدر و عافیت معلوم ہوگی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں حیران و پریشان بدحواسی گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں ''آیا کہ نہیں؟''

میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں۔ ''آ کر بیٹھا تو ہے، جا کر پوچھتے کیوں نہیں پوچھ کر ہار گئی۔ کہاں گیا تھا۔ کچھ بولنا ہی نہیں۔''

آپ گرج پڑتے ہیں۔ ''سنو یہاں آؤ۔''

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامہ سے باہر ہیں ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضبناک چہرہ دیکھ کر سچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں۔ مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں۔ وہ تو آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مصنوعی غصہ سے کہتے ہیں۔ ''تم کہاں گئے تھے جی منع کیا جاتا ہے مانتے نہیں ہو۔ خبردار جواب اتنی دیر کی آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا ادھر ادھر گھومتا ہے۔''

میں سمجھ وہی ہوں یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہوگا، گریز تو بری نہیں۔ لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصہ فرد ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں۔ ''تم جیسے ڈر گئے۔ بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے اس طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے کل نو کی خبر لائے گا۔ اس نے بھی دل میں کیا سمجھا ہوگا۔''

آپ فرماتے ہیں۔ ''تم نے سُنا ہے میں نے کتنی زور سے ڈانٹا، بچے کی روح ہی فنا ہوگئی ہوگی دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے۔''

''تم نے ڈانٹا تو نہیں ہاں آنسو پونچھ دیے۔''

آپ نے ایک نئی اپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہوجاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہئیے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہئیے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشونما میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے کبھی گالیاں ہیں۔ کبھی کنکوے حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے۔ مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کوئی لڑکا کنکوا اڑا لے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اسکول سے جوں ہی لڑکے واپس آتے پھر بیٹھتے ۔بس شام کو آدھے گھنٹے کی چھٹی دیتے یہ نہیں تو آپ اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے باپ کا لڑکوں پر کیا رعب ہوسکتا ہے۔ ابا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوگئی ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پہ پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو ابا جان کی صحت کون اچھی تھی۔ بیچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہوجاتی لیکن کچھ بھی ہو تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوے کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو، ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے۔ گویا گرومنتر دے رہے ہیں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہیں۔ میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے؟ تمہیں گھر سے کوئی مطلب نہیں نہ ہو، لیکن آپ میرے بچوں کو خراب نہ کیجئے۔ برے برے شوق پیدا نہ کیجئے، اگر آپ انھیں سدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑیے مت لگے باتیں بنانے، ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ لے جاتے تھے۔ لڑکا سر ٹپک مرجائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے۔ خوب آتش بازیاں چھوٹیں گی غبارے اڑیں گے ولایتی چرخیاں بھی ہیں ان پر مزے سے بیٹھانا اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکٹ،

فٹ بال، ہاکی ایک سے ایک مہلک گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔کوئی لڑکا میچ جیت کر آجاتا ہے تو کتنے خوش ہوتے ہیں گویا کوئی قلعہ فتح کر کے آیا ہو۔حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں کہ کسی لڑکے کے چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا۔ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بے چاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے، چاہیں لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں پھر بھی چشمِ بصیرت نہ کھلتی۔جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم وفا نہیں ہوسکتی۔دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں،لیکن اس کا اثر عام حالات پر کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی بیس پچیس برس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا۔اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم ختم ہوجائے گی۔میں نے جہاں جہاں پیغام دیے جہیز کا مسئلہ پیدا ہوااور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑادی۔جب اس طرح پوراایک سال گذر گیااور لڑکی کا سترھواں سال شروع ہوگیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کرلی۔حضرت بھی راضی ہوگئے کیوں کہ ان لوگوں نے قرار داد نہیں کی حالاں کہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کی ایک اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔شادی کے بہ خیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ان مہاشے کے آگے میرے ایک نہ چلتی تھی۔یہ رسم بے ہودہ ہے۔یہ رسم بے معنی ہے، یہاں روپے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں گیتوں کی کیا ضرورت ہے؟ ناک میں دم تھا۔یہ کیوں۔وہ کیوں، یہ تو صاف جہیز ہے۔تم نے میرے منہ پر کالک لگا دی، میری آبرو مٹادی۔ذرا خیال کیجیے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات ہر درد قدح ہورہی ہے۔شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھی۔اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔میں نے بھی برت رکھا لیکن آپ کو یہ ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا۔لیکن آپ نے حسبِ معمول ناشتہ کیا۔کھانا کھایا۔خیر!رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی۔آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔لڑکی دان کی چیز نہیں۔دان روپے پیسے کا ہوتا ہے جانور بھی دان دیے جاسکتے ہیں لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے۔کتنا سمجھاتی ہوں ''صاحب پرانا رواج ہے۔شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔'' عزیز واقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہوگئے مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔پیروں پڑی۔یہاں تک کہا بابا تم کچھ نہ کرنا جو کچھ کرنا ہوگا میں کرلونگی تم چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور

اسے دعا دو۔ مگر اس مرد خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آ گیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی۔ آپ گھر جھانکے تک نہیں۔ لطف یہ ہے کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں۔ مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا، حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف اٹھا کر نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے ہرگز نہیں ہے۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے۔ بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں، گویا کسی کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول، نیا اور خوش نما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستہ سے ہم بے خوف آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی ان جانے رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے، ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف، بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

☆☆☆

بدنصیب ماں

پنڈت اجودھیاناتھ کا انتقال ہوا تو سب نے کہا: ''ایشور آدمی کو ایسی ہی موت دے۔'' چار جوان لڑکے یادگار چھوڑے اور ایک لڑکی۔ اثاثہ بھی کافی۔ پختہ مکان، دو باغ، کئی ہزار کے زیور اور بیس ہزار نقد۔ بیوہ پھول متی کو صدمہ ہونا تو لازمی تھا۔ اور وہ کئی دن تک بے حال رہی۔ لیکن جوان بیٹوں کو سامنے دیکھ کر اُسے تشفی ہوئی۔ چاروں لڑکے ایک سے ایک سعادت مند، چاروں بہوئیں ایک سے ایک فرماں بردار۔ جس وقت پھول متی چار پائی پر لیٹتی تو باری باری سے اس کے پانو دباتیں۔ وہ اشنان کر کے اٹھتی تو اس کی ساڑی دھوتیں۔ سارا گھر اس کے اشارے پر چلتا تھا۔ بڑا لڑکا کامتاناتھ ایک دفتر میں پچاس روپے کا نوکر تھا۔ دوسرا اُماناتھ ڈاکٹری پاس کر چکا تھا اور کہیں مطب کھولنے کی فکر میں تھا۔ تیسرا دیاناتھ بی اے میں فیل ہو گیا تھا اور اخباروں میں مضامین لکھ کر اپنا جیب خرچ نکال لیتا تھا۔ سب سے چھوٹا سیتاناتھ چاروں میں ذہین اور ہونہار تھا اور یہ امسال بی اے اول درجے میں پاس کر کے ایم اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ کسی میں لااُبالیاں نہ تھیں، نہ فضول خرچیاں، نہ کم اندیشیاں جو والدین کو جلاتی ہیں۔ اگرچہ کنجیاں بڑی بہو کے پاس رہتی تھیں۔ پھول متی میں وہ حکومت پسندی نہ تھی جو بڑھاپے کو سخت گیر بنا دیا کرتی ہے۔ مگر اس کی مرضی کے بغیر کوئی لڑکا ناشتہ نہیں منگا سکتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ پنڈت جی کو مرے آج بارہواں دن تھا۔ کل تیرہویں ہے۔ برہم بھوج ہوگا۔ برادری کی دعوت ہوگی۔ اسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پھول متی حجرے میں بیٹھ دیکھ رہی تھی کہ پلّے دار بوروں میں آٹا لا کر رکھ رہے ہیں۔ گھی کے ٹین آ رہے ہیں۔ سبزی کے ٹوکرے، شکر کی بوریاں، دہی کی مٹکیاں سب چلی آ رہی ہیں۔ مہا برہمن کے لیے دان کی چیزیں لائی گئیں۔ برتن، پلنگ، بستر، کپڑے وغیرہ۔ مگر پھول متی کو کوئی چیز نہیں دکھائی گئی۔ حسب ضابطہ سب چیزیں اس کے پاس آنی چاہیے تھیں۔ وہ ہر ایک چیز کو دیکھتی، انھیں پسند کرتی، ان کی مقدار میں کمی بیشی کرتی، تب ان چیزوں کو بھنڈارے میں رکھا جاتا۔ مگر اسے دکھانے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی۔ اچھا! اور آٹا تین ہی بوری کیوں آیا۔ اس نے تو پانچ بوریوں کے لیے کہا تھا۔ گھی کے بھی پانچ کنستر آئے۔ اس نے دس کنستر منگوائے تھے۔ شاید سبزی، دہی، شکر وغیرہ میں بھی کمی کی گئی ہوگی۔ کس نے اسکے حکم کی مداخلت کی۔ جب اس نے بات طے کر دی تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس میں کمی بیشی کرے۔ آج چالیس سال سے گھر کے ہر ایک معاملے میں پھول متی کا فیصلہ ناطق تھا۔ اس

نے سو کہا تو سو خرچ کیے گئے۔ایک کہا تو ایک۔کسی نے مین میکھ نہ کی۔یہاں تک کہ پنڈت اجودھیا ناتھ سب کچھ اسی کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے۔پر آج اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی خلاف ورزی کی جارہی ہے۔وہ اسے کیوں کر برداشت کرسکتی تھی۔

وہ کچھ دیر تک تو ضبط کیے بیٹھی رہی۔پر آخر اس سے نہ رہا گیا۔خود پروری اس کی فطرتِ ثانی بن گئی تھی۔غصے میں بھری ہوئی آئی اور کامتاناتھ سے بولی:

''کیا آٹا تین بوروں کے لیے کہا تھا اور گھی بھی پانچ کنستر!تمھیں یاد ہے میں نے دس کنستر کہے تھے۔کفایت کو میں بُرا نہیں کہتی لیےلیکن جس نے یہ کنواں کھودا،اسی کی آتما پانی کو ترسے تو کتنے شرم کی بات ہے۔''

کامتاناتھ نے معذرت نہیں کی۔عذرِ گناہ نہیں کیا۔نادم بھی نہیں ہوا۔فوراً تقصیر کی تلافی کرنے نہیں دوڑا۔ایک منٹ تو باغیانہ انداز میں کھڑا رہا۔پھر بولا:''ہم لوگوں کی صلاح تین ہی بوروں کی ہوئی اور تین بوروں کے لیے پانچ کنستر گھی کافی تھا۔اسی حساب سے اور چیزیں بھی کم کردیں گئیں۔

پھول متی تیز ہوکر بولی،''کس کی رائے سے آٹا کم کیا گیا؟''

''ہم لوگوں کی رائے سے۔''

''تو میری رائے کوئی چیز نہیں ہے؟''

''ہے کیوں نہیں۔لیکن اپنا نفع نقصان تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔''

پھول متی ہکّا بکّا ہوکر اس کا منہ تکنے لگی۔اس جملے کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا،اپنا نفع نقصان۔یہ'اپنا'کیا بلا ہے؟اس کا وجود کب سے ہوا؟اس گھر کے نقصان کی ذمہ داری اس کے سر ہے،دوسروں کو،خواہ وہ اس کے پیٹ کے لڑکے ہی کیوں نہ ہوں،اس کے فیصلے میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟لونڈا اس طرح جواب دے رہا ہے گویا گھر اس کا ہے۔اس نے مرمر کر یہ گرہستی جمع کی ہے۔میں تو غیر ہوں،ذرا اس کی خودسری تو دیکھو۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا،''میرے نفع نقصان کے ذمہ دار تم نہیں ہو۔مجھے اختیار ہے میں جو مناسب سمجھوں وہ کروں۔ابھی جا کر دو بورے آٹا اور پانچ کنستر گھی اور لاؤ اور آئندہ سے خبردار جو کسی نے میری بات کاٹی۔''

اس نے اپنے خیال میں ضرورت سے زیادہ تنبیہہ کردی تھی اور اب وہاں کھڑے ہونے کی ضرورت نہ سمجھ کر وہ اپنے حجرے میں چلی آئی۔حالانکہ کامتاناتھ ابھی وہیں کھڑا تھا اور اسی کے چہرے سے ایسا مترشح ہورہا تھا کہ اسے اس حکم کی تعمیل میں کچھ عذر ہے،مگر پھول متی مطمئن بیٹھی تھی۔اتنی تنبیہہ پر بھی کسی کو اس کی نافرمانی کی جرأت ہو سکتی ہے،یہ اس کے ذہن میں بھی نہ آیا۔مگر رفتہ رفتہ اس پر اب حقیقت کھلنے لگی تھی کہ اس کے گھر میں اس کی وہ

حیثیت نہیں رہی جو دس بارہ روز پہلے تھی۔ رشتہ داروں کے یہاں سے نوید میں گھی، شکر، مٹھائی وغیرہ آ رہی تھی۔ بڑی بہو اِن چیزوں کو خاص انداز سے سنبھال سنبھال کر رکھ رہی تھی۔ تینوں چھوٹی بہوئیں بھی بھنڈارے میں گھسی ہوئی تھیں۔ کوئی پھول متی سے کچھ نہ پوچھنے آتا۔ برادری کے لوگ بھی جو کچھ پوچھتے ہیں وہ کامتا ناتھ سے یا بڑی بہو سے۔ کامتا ناتھ کہاں کا بڑا مہتمم ہے، دن بھر بھنگ پیے پڑا رہتا ہے اور بڑی بہو جیسی پھوہڑ عورت بھلا ان باتوں کو کیا سمجھ سکتی ہے۔ بھد ہوگی، اور کیا۔ سب کے سب خاندان کی ناک کٹوائیں گے۔ وقت پر کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جائے گی، تب ادھر ادھر بھاگے پھریں گے۔ ان کاموں کے لیے بڑا تجربہ اور سلیقہ ہونا چاہیے۔ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ بن جائے گی اور ماری ماری پھرے گی۔ کوئی چیز اتنی کم بنے گی کہ کسی پتّل پر پہنچے گی، کسی پر نہیں۔ آخر ان سبھوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اچھا بڑی بہو سیف کیوں کھول رہی ہے۔ وہ سیف کو میری مرضی کے بغیر کھولنے والی کون ہوتی ہے کنجی اس کے پاس ضرور ہے، لیکن جب تک میں روپے نہ نکلواؤں وہ صندوق نہیں کھول سکتی، آج اس طرح کھول رہی ہے گویا سب کچھ وہی ہے۔ میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ اس نے بڑی بہو کے پاس جا کر تند لہجے میں کہا:

''سیف کیوں کھولتی ہو بہو؟ میں نے تو کھولنے کو نہیں کہا۔''

بڑی بہو نے بے باکانہ انداز میں کہا: ''بازار سے سامان آیا ہے تو دام نہ دیے جائیں گے؟''

''کون چیز کس بھاؤ سے آئی ہے اور کتنی آئی ہے مجھے کچھ معلوم نہیں جب تک حساب کتاب نہ ہو جائے روپے کیسے دیے جائیں؟''

''حساب کتاب سب ہو گیا ہے۔''

''کس نے کیا؟''

''اب میں کیا جانوں جا کر اپنے لڑکوں سے پوچھو۔''

پھول متی پھر آ کر اپنی کوٹھری میں بیٹھ گئی۔ اس وقت بگڑنے کا موقع نہ تھا۔ گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت اس نے لڑکوں کو ڈانٹا تو لوگ یہی کہیں گے کہ پنڈت کے مرتے ہی انکے گھر میں پھوٹ پڑ گئی۔ خون کا گھونٹ پی پی کر رہ جاتی ہے۔ جب مہمان رخصت ہو جائیں تب وہ ایک ایک کی خبر لے گی۔ دیکھے گی اس وقت لڑکے کیا باتیں بناتے ہیں۔ اس عرصے میں وہ کارپردازوں کی بے قاعدگیوں اور فضول کاریوں اور غلطیوں کا مبصرانہ نگاہوں سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ بارہ بجتے بجتے دعوت شروع ہوئی۔ ساری برادری کے لوگ یک بارگی کھانے کے لیے بلا لیے گئے۔ پھول متی کھڑی کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ صحن میں مشکل سے ڈھائی سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ ساری برادری کیسے بیٹھے گی۔ دو پنگتوں میں لوگ بیٹھتے تو کیا برا تھا۔ یہی تو ہوتا کہ دو کی جگہ چار بجے ختم ہوتی۔ مگر یہاں تو

سب کو سونے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔

دفعتاً شور مچا۔ ''ترکاریوں میں نمک نہیں۔''

بڑی بہو جلدی سے نمک پیسنے گئی۔ پھول متی غصے سے ہونٹ چبا رہی تھی مگر اس موقع پر زبان نہ کھول سکتی تھی۔ نمک پیسا اور پتیلیوں میں ڈالا گیا۔

یکا یک پھر شور مچا۔ ''پانی گرم ہے۔''

گھر میں برف نہ تھی۔ آدمی بازار دوڑا گیا۔ بازار میں اتنی رات گئے برف کہاں، آدمی ناکام لوٹ آیا۔ مہمانوں کو وہی نل کا گرم پانی پینا پڑا۔ پھول متی کا بس چلتا تو لڑکوں کا منہ نوچ لیتی۔ ایسی بدانتظامی اس گھر میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس پر سب کو مالک اور منتظم بننے کی دھن ہے۔ برف جیسی ضروری چیز منگوانے کی کسی کو بھی سُدھ نہ رہی۔ سُدھ کہاں سے آئے، جب کسی کو گپ مارنے سے فرصت ملے۔ مہمان اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ دعوت کرنے چلے تھے اور گھر میں برف تک نہیں۔ اچھا پھر کیوں گھر میں ہل چل مچی؟ ارے غضب! کسی کے شوربے میں ایک مری چوہیا نکل آئی یا بھگوان! اب تم آبرو رکھیو۔ چھی! اس پھوہڑ پن کی بھی کوئی حد ہے۔ سارے مہمان اٹھے جا رہے ہیں۔ نہ اٹھیں تو کیا کریں۔ آنکھوں سے دیکھ کر مکھی کون نگلے گا۔ پھول متی کے دل میں ایسا ابال اٹھ رہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرا لے۔ مجنونانہ حالت میں بار بار سر کے بال نوچتی تھی۔ ابھاگے دعوت کا انتظام کرنے چلے تھے۔ سارا کرا دھرا مٹی میں مل گیا۔ سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ بدنامی ہوئی وہ الگ۔ اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ مہمان اُٹھ چکے تھے۔ پتیلیوں میں کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ چاروں لڑکے آنگن میں نادم کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کو الزام دے رہا تھا۔ بڑی بہو دیورانیوں پر بگڑ رہی تھی۔ اسی وقت پھول متی شعلے کی طرح ٹوٹ کر آئی اور بولی: ''منہ میں کالک لگ گئی کہ نہیں؟ یا ابھی کچھ کسر ہے۔ ڈوب مرو سب کے سب جا کر چلّو بھر پانی میں۔ شہر میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ ہفتوں اس دعوت کا چرچا رہے گا۔ مذاق اڑایا جائے گا۔ تم لوگوں کو کچھ شرم و حیا تو ہے نہیں، تمھیں کیا، آتما تو اس کی رو رہی ہے جس نے زندگی کو گھر کی آبرو بنانے میں تباہ کر دیا۔''

کامتا تھ کچھ دیر تو کھڑا سنتا رہا۔ آخر جھنجلا کر بولا، ''اچھا اب رہنے دو اماں۔ غلطی ہوئی۔ ہم سب مانتے ہیں بہت بڑی غلطی ہوئی، لیکن اب کیا اس کے لیے آدمیوں کو حلال کر ڈالوگی؟ سبھی سے غلطیاں ہوتی ہیں، پچھتانے کے سوا آدمی اور کیا کرتا ہے۔ کسی کی جان تو نہیں ماری جاتی۔ آدمی غلطیوں ہی سے سیکھتا بھی تو ہے۔''

بڑی بہو نے فرمایا، ''ہم کیا جانتے تھے کہ بی بی (نند کملا) سے اتنا ذرا سا کام نہ ہوگا۔ چوہیا ترکاری میں بیٹھ ہو گی۔ انھوں نے ٹوکری کو بغیر دیکھے بھالے کڑھاؤ میں ڈال دیا۔''

کامتاناتھ نے بیوی کو ڈانٹا،''اس میں نہ کملا کا قصور ہے، نہ تمھارا، نہ میرا۔ اتفاق ہے۔ اتنے بڑے بھوج میں ایک ایک مٹھی ترکاری کڑھاؤ میں نہیں ڈالی جاتی۔ ٹوکرے کے ٹوکرے انڈیل دیے جاتے ہیں۔ اس میں کیسی جگ ہنسائی اور کیسی نکٹائی۔ تم خواہ مخواہ جلے پر نمک چھڑکتی ہو۔''

پھول متی: ''شرماتے تو نہیں۔ اُلٹے اور بے حیائی کی باتیں کرتے ہو۔''

کامتا: ''شرماؤں کیوں۔ کسی کی چوری کی ہے؟ چینی میں چیونٹے اور آٹے میں گھن یہ سب تو نہیں دیکھے جاتے۔ ہماری نگاہ نہ پڑی۔ بس یہی بات بگڑ گئی۔ ورنہ چپکے سے چوہیا پکڑ کر نکال دیتے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔''

پھول متی اس کفر پر استعجاب سے بولی، کیا سب کو چوہیا کھلا کر ان کا دھرم لے لیتا؟

کامتاناتھ ماں کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر بولا،''کیا پرانے زمانے کی باتیں کر رہی ہو اماں۔ ان بوتوں سے دھرم نہیں جاتا۔ یہ دھرماتما لوگ جو پتّل سے اٹھ اٹھ کر گئے ہیں ان میں ایسا کون ہے جو بھیڑ بکری کا گوشت نہ کھاتا ہو۔ تالاب کے کچھوے اور گھونگے تک تو کسی سے بچتے نہیں۔ کیا وہ ذرا سی چوہیا ان سب سے ناپاک ہے۔''

پھول متی کے پاس ایسی کٹھ حجتوں کا جواب نہ تھا۔ اپنا سامنہ لے کر چلی گئی۔

(۲)

دو مہینے گزر گئے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ چاروں بھائی بھنگ پی کر کمرے میں بیٹھے مشورہ کر رہے ہیں۔ بڑی بہو بھی اس مجلس میں شریک ہے۔ کامتاناتھ نے مسند پر ٹک کر کہا،''میں تو کمد کی شادی میں اپنے حصے کی ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔ آخر میرے بھی تو بال بچے ہیں۔''

اماناتھ: ''تو یہاں کس کے پاس فالتو روپے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار ہی تو ایک ایک کے حصے میں آتے ہیں۔ مجھے اپنا میڈیکل ہال کھولنے کے لیے کم از کم پانچ ہزار کی ضرورت ہے۔''

دیاناتھ: ''مجھے بھی پریس اور اخبار کی فکر ہے۔ پانچ ہزار اپنے ہوں گے تو پانچ ہزار کا کوئی ساتھی اور مل جائے گا۔ میں تو اپنے روپے میں سے ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتا۔

کامتا: ''دادا نے پانچ ہزار جہیز ٹھہرایا تھا۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پنڈت مراری لال کے لڑکے سے شادی ہو۔ لڑکی قسمت والی ہو تو غریب گھر میں بھی رہ سکتی ہے۔ بدنصیب ہو تو راجا کے گھر میں روتی رہے گی۔ یہ تو نصیبوں کا کھیل ہے۔

سیتا نے شرماتے ہوئے کہا:''یہ تو مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ طے کی ہوئی سگائی توڑ دی جائے۔ ان سے کہا

جائے کہ پانچ ہزار کی جگہ تین ہزار لے لیں۔ اس طرح پانچ ہزار میں شادی ہوسکتی ہے۔ میں اپنے حصے کے سب روپے دے دوں گا۔''

کامتاناتھ نے کھسیا کر بھائیوں سے کہا: ''سنتے ہو اس کی باتیں۔''

اُما: ''جب ٹھوکریں کھائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔''

کامتا: ''اتنا یاد رکھو کہ ہم لوگ تمھاری تعلیم کے ذمہ دار نہیں ہیں۔''

سیتا: ''جی ہاں۔ یاد ہے۔''

اُما: ''اور جو کہیں تمھیں ولایت جا کر پڑھنے کے لیے کل وظیفہ مل جائے تو سوٹ بوٹ اور سفر خرچ کے لیے روپیا کہاں سے لاؤ گے؟ اس وقت کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو گے؟''

کامتا: ''اور وظیفہ تمھیں ملے گا۔ کہو میں آج لکھ دوں۔''

اس دلیل سے سیتا ناتھ کو بھی توڑ لیا۔ فی الواقع اگر اسے سرکاری وظیفہ مل گیا تو چار پانچ ہزار تیاریوں کے لیے درکار ہوں گے۔ کمد کے لیے اتنی بڑی قربانی ہرگز نہیں کرسکتا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو پامال کرے۔ بولا ''ہاں ایسی حالت میں تو مجھے بھی روپے کی ضرورت پڑے گی۔''

کامتا: ''تو اس کی ایک صورت یہی ہے کہ کمد کی شادی کم سے کم خرچ میں کردی جائے۔ ایک ہزار سے زیادہ ہم کسی طرح خرچ نہیں کرسکتے۔''

''پنڈت دین دیال کیسے رہیں گے؟ ایم اے، بی اے نہ سہی جسمانی سے ان کی آمدنی پچاس روپے ماہوار سے کم نہیں۔ عمر بھی ابھی چالیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ پچھلے سال ہی تو بیوی مری ہے۔ مجھے یقین ہے وہ بغیر جہیز کے راضی ہو جائیں گے۔''

اما: وہاں جہیز کا کوئی سوال نہیں۔ تیسری شادی ہے۔

کامتا: یہ نہ کہو۔ وہ آج چاہیں تو ہزار دو ہزار پا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ کچھ دب جائیں گے۔ تو یہی صلاح کہ مراری لال کو جواب دے جائے اور دین دیال کے ساتھ سگائی کی جائے۔''

دیا: ''اماں سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔''

کامتا: ''اماں سے پوچھنا بے کار ہے۔ ان کی تو جیسے عقل گھاس کھا گئی ہے۔ وہی پرانے وقتوں کی باتیں! مراری لال کے نام پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ زمانہ نہیں رہا۔''

اُما: ''وہ مانیں گی نہیں۔ اپنے زیور بیچ کر شادی کریں گی۔ دیکھ لیجے گا۔''

کامتا: ''ہاں یہ ممکن ہے۔ زیوروں پر ان کا پورا اختیار ہے۔ یہ ان کا استری دھن ہے۔ وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں۔''

دیاناتھ: ''استری دھن ہے تو کیا اسے لٹا دیں گی؟ آخر وہ بھی تو دادا ہی کی کمائی ہے۔''

کامتا: ''کسی کی کمائی ہو۔ استری دھن عورت کی چیز ہے۔''

اُما: ''وہ سب قانونی گورکھ دھندے ہیں۔ استری دھن کوئی چیز نہیں۔ گہنے دس ہزار سے کم کے نہیں ہیں۔ اتنی بڑی رقم ہم کھو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کسی بہانے سے یہ گہنے اپنے ہاتھ میں کرنے ہوں گے۔ ابھی دین دیال کا ذکر نہ کرو ورنہ تاڑ جائیں گی۔ گہنے اپنے پاس آجائیں تو صاف صاف کہہ دو۔ تب کیا کر لیں گی۔''

دیا: ''ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔''

کامتا: ''مجھے دھوکے کی چال مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ جس پر ہمارا حق ہے اس کے لیے ہم لڑ سکتے ہیں۔ جس پر ہمارا حق نہیں اس کے لیے ہم دھوکا دھڑی نہیں کر سکتے۔''

دیاناتھ: ''تو آپ الگ بیٹھیے۔ میں جا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک اخبار میں مضمون لکھا تھا اس پر سرکار مقدمہ چلا رہی ہے۔ پانچ ہزار کی ضمانت دینی پڑے گی۔ آپ اپنے زیور دے دیں تو میری جان بچ جائے گی۔ آپ لوگ بھی کچھ نمک مرچ ملا دیجیے گا۔''

کامتا: ''نا بھیا، میں اس کام کے قریب نہ جاؤں گا۔''

سیتا: ''میرا بھی استعفیٰ ہے۔''

اُما: ''ان لوگوں کو جانے دو جی۔ ہم اور تم مل کر رنگ جما لیں گے۔ یہ دھرماتما لوگ ہیں۔ بھیا نوکر ہی ہیں۔ سیتا کو وظیفہ ملنے والا ہے۔ ضرورت تو ہمیں اور تمھیں ہے۔''

بڑی بہو نے فرمایا: ''پچاس روپے کے ہی تو نوکر ہیں یا اور کچھ۔ اتنے دن مجھے آئے ہو گئے، پیتل کا ایک چھلّا بھی نہ بنوایا۔ توفیق ہی نہ ہوئی۔ آج دھرماتما بنے ہیں۔''

اُما: ''اماں کے زیور مل جائیں گے تو ان کا ہار تمھیں دے دوں گا۔ بھائی خاطر جمع رکھو۔''

بڑی بہو: ''مل چکے، وہ گڑ نہیں جو چینٹے کھائیں۔''

دیا: ''اچھا تو اسی بات پر ابھی جاتا ہوں۔ زیور لے کر نہ آجاؤں تو منہ نہ دکھاؤں۔''

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیاناتھ کی کوڑی چت پڑی۔ ماں کا مامتا بھرا دل بیٹے کی مصیبت دیکھ کر کیوں نہ پسیجتا۔ پھول متی یہ داستان سنتے ہی باؤلی ہو گئی۔ اس پر اُماناتھ نے اور بھی رڈّا جمایا: ''اگر صبح دس بجے تک روپے داخل نہ

ہوئے تو ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔ بنک سے روپے تو ابھی مل نہیں سکتے۔مہینوں خط و کتابت ہوگی۔ وراثت کا فیصلہ ہو جائے گا، تب کہیں جا کر روپے ملیں گے۔''

پھول متی کو یہ کب برداشت ہوسکتا تھا کہ اس کے زیوروں کے ہوتے اس کے بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔سارے زیور نکال کر دیا ناتھ کو دے دیے۔

اس طرح اپنی ماں کی گردن پر خنجر چلا کر دونوں ناخلف خوش خوش بھائیوں کے پاس لوٹ آئے۔

(۳)

دو تین مہینے گزر گئے۔زیوروں پر تصرف کر کے چاروں بھائی اب ماں کی دلجوئی کرنے لگے۔اپنی بیویوں کو سمجھاتے رہتے کہ اماں کا دل نہ دکھائیں۔اگر اس کی تشفی تھوڑی سی ظاہر داری سے ہوجاتی ہے تو اس میں کیوں کمی کی جائے۔ چاروں کرتے اپنے دل کی مگر ماں سے صلاح لے لیتے یا ایسا جال پھیلاتے کہ وہ ان کی باتوں میں آجاتی اور ہر ایک بات میں رضامند ہوجاتی۔ باغ کا فروخت کرنا اسے بہت ناگوار گزرتا تھا،لیکن چاروں نے ایسی بندشیں باندھیں کہ وہ اسے بیع کرنے پر راضی ہوگئی، ہاں کمد کی شادی کے معاملے میں بیٹیوں سے اس کا اتفاق نہ ہوا۔وہ کہتی تھی کہ شادی مراری لال کے لڑکے سے ہی ہوگی۔ چاروں بھائی پنڈت دین دیال سے کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اس بات پر تکرار کی نوبت آ گئی۔

پھول متی نے کہا: ''ماں باپ کی کمائی میں کیا بیٹی کا حصہ نہیں ہے؟تمہیں دس ہزار کا ایک باغ ملا۔پچیس ہزار کا مکان،بیس ہزار نقد میں سے کیا پانچ ہزار بھی کمد کا حصہ نہیں ہے؟''

کامتاناتھ نے نرمی سے کہا،''اماں! کمد ہماری بہن ہے اور ہم اپنے مقدور بھر کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے اسے نقصان ہو،لیکن حصے کی جو بات تھی، اب تو ہمیں ایک ایک پیسے کی کفایت کرنی پڑے گی۔ جو کام ایک ہزار سے ہوجائے اس کے لیے پانچ ہزار خرچ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟''

اُمانا تھ نے تصحیح کی:''پانچ ہزار کیوں صاحب۔دس ہزار کہیے۔دعوت،ضیافت،رسم،رسوم میں کیا پانچ ہزار بھی خرچ نہ ہوں گے۔''

کامتا: ''ہاں ٹھیک ہے۔دس ہزار ہی سمجھو۔دس ہزار روپے ایک شادی میں خرچ کرنے کی اب ہماری حیثیت نہیں ہے۔''

پھول متی نے ضد پکڑ کر کہا،''شادی تو مراری لال کے لڑکے سے ہی ہوگی۔ چاہے پانچ ہزار خرچ ہوں،

چاہے دس ہزار۔ میرے شوہر کی کمائی ہے۔ میں نے مرمر کر جوڑا ہے۔ اپنی مرضی سے خرچ کروں گی۔تم سے مانگنے جاؤں تو مت دینا۔''

کامتا ناتھ کو اب تلخ حقیقت کے اظہار کے سوا چارہ نہ رہا بولے،''اماں تم خواہ مخواہ بات بڑھاتی ہو۔جس روپے کو اب تم اپنا سمجھتی ہو وہ تمھارا نہیں ہے۔ وہ ہمارا ہے۔ ایک ایک پائی ہماری ہے۔تم ہماری مرضی کے بغیر اس میں سے خرچ نہیں کرسکتیں۔''

پھول متی کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ بولی،'' کیا کہا؟ پھر تو کہنا۔ میں اپنے ہی روپے اپنی مرضی سے خرچ نہیں کرسکتی؟''

کامتا،''وہ روپے تمھارے نہیں ہمارے ہیں۔''

پھول متی،''تمھارے ہوں گے لیکن میرے مرنے کے بعد۔''

کامتا،''نہیں دادا کے مرتے ہی سب کچھ ہمارا ہو گیا۔''

اُما: ''اماں قانون تو جانتی نہیں۔خوامخواہ الجھتی ہیں۔''

پھول متی کی بے نور آنکھیں شعلے کی طرح دہک اُٹھیں۔ چہرہ لال ہو گیا۔ بولی،''تمھارا قانون بھاڑ میں جائے۔ ایسے قانون میں آگ لگے۔ میں ایسے لچر قانون کو نہیں مانتی۔ یہ قانون ہے کہ گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ تمھارے دادا ایسے کوئی دھنّا سیٹھ نہ تھے۔ میں نے پیٹ اور تن کاٹ کاٹ کر یہ روپے جمع کیے ہیں۔نہیں تو آج اس گھر میں دھول اُڑتی ہوتی۔ گھر ہی کہاں ہوتا۔ میرے جیتے جی تم میرے روپے چھو نہیں سکتے۔ میں نے تم چاروں کی شادی میں دس دس ہزار خرچ کیے ہیں۔تمھاری پڑھائی پر بھی پانچ پانچ ہزار سے کم خرچ نہ ہوئے ہوں گے۔ کمد بھی تو میرے ہی پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔اس کی شادی میں بھی دس ہزار خرچ کروں گی۔ جو کچھ بچے گا، وہ تم لے لینا۔''

اُما ناتھ نے جھلّا کر کہا،'' بھائی صاحب! آپ ناحق اماں کے منہ لگتے ہیں۔ چل کر مراری لال کو خط لکھ دیجیے۔تمھارے ہاں شادی نہ ہوگی۔ دین دیال کے پاس آج ہی پیغام بھیج دیجیے۔ اماں کو بکنے دیجیے۔ یہ قاعدہ قانون تو جانتی نہیں۔ بیکار بحث کرتی ہیں۔''

پھول متی نے ضبط کر کے کہا،''اچھا کیا قانون ہے۔ ذرا میں بھی سنوں۔''

اُما :''قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد ساری جائیداد بیٹوں کی ہوجاتی ہے۔ ماں کا حق صرف گزارا لینے کا ہے۔''

پھول متی نے پوچھا،''کس نے بنایا ہے ایسا قانون؟''

اُما : ’’ہمارے رشیوں نے، مہاراج منو نے اور اکس نے؟‘‘

پھول متی ایک لمحہ خاموش کر بولی، ’’تو میں اس گھر میں تمھارے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہوں۔‘‘

اُما، ’’تم جیسا سمجھو۔‘‘

پھول متی، ’’گھر میں نے بنوایا ہے۔روپے میں نے جوڑے، باغ میں نے خریدا، اور آج اسی گھر میں میں غیر ہوں؟ منو نے یہی قانون بنایا ہے؟ اچھی بات ہے اپنا گھر بار لو۔ میری جان چھوڑو۔ اس طرح محتاج بن کر رہنا مجھے منظور نہیں۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ مر جاؤں۔ واہ رے اندھیر! میں نے ہی درخت لگایا اور میں ہی اس کا پتا نہیں توڑ سکتی۔ میں نے گھر بنوایا۔ میں ہی اس میں نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی قانون ہے تو اس میں آگ لگ جائے۔ اگر میں جانتی کہ میری یہ درگت ہونے والی ہے تو ساری جائیداد اپنے نام کرا لیتی۔‘‘

چاروں نو جوان پر ماں کی اس تندی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قانون کا فولادی زرہ ان کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کچے لوہے کا ان کا پر کیا اثر ہوتا۔

شام ہو گئی تھی۔ دروازے پر نیم کا درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے پتوں میں بھی حِس نہ تھی۔ رخصت ہونے والے آفتاب کی ٹھنڈی کرنیں جیسے جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ پھول متی آہستہ سے اٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

(۴)

پھول متی اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ شوہر کے مرتے ہی اپنے پیٹ کے جنے لڑکے اس کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس کا اسے کبھی خواب میں بھی گمان نہ ہوا تھا۔ جن لڑکوں کو اس نے خونِ جگر پلا پلا کر پالا، جن پر اسے اتنا غرور تھا وہی آج اسے یوں آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ واہ رے زمانے کی خوبی! اب اس گھر میں رہنا عذاب معلوم ہوتا تھا۔ جہاں اس کی کچھ قدر نہیں، کچھ گنتی نہیں، وہاں لاوارثوں کی طرح پڑی روٹیاں کھائے۔ یہ اس کی خود دار طبیعت کے لیے حد درجہ گراں تھا مگر چارہ ہی کیا تھا۔ وہ لڑکوں سے الگ ہو کر رہے بھی تو کس کی ناک کٹے گی۔ زمانہ اسے تھوکے تو کیا اور لڑکوں کو تھوکے تو کیا۔ بدنامی تو اس کی ہے۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ چار جوان بیٹوں کے ہوتے ہوئے بڑھیا الگ پڑی ہوئی مزدوری کر کے پیٹ پال رہی ہے۔ جسے اس نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا وہی اب اس پر ہنسیں گے۔ نہیں یہ ذلت اس بے کسی کی ذلت سے کہیں زیادہ دل شکن تھی۔ اب اسے اپنے آپ کو ایک نئے طرزِ عمل کا عادی بنانا پڑے گا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اسے اب نئے ماحول کے

اندر زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اب تک مالکن رہی اب لونڈی بن کر رہنا پڑے گا۔ ایشور کی یہی مرضی ہے۔ اپنے بیٹوں کی لاتیں اور باتیں، غیروں کی لاتوں اور باتوں کے مقالے میں پھر بھی غنیمت ہیں۔ وہ بڑی دیر تک منہ ڈھانپ اپنی اس اس بے کسی پر روتی رہی۔ ساری رات اسی روحانی کوفت میں گزر گئی۔

جاوڑوں کی صبح آہستہ آہستہ ڈرتی ڈرتی تاریکی کے پردے سے نکلی جیسے کوئی قیدی چھپ کر جیل سے نکل آیا ہو۔ پھول متی آج معمول کے خلاف تڑکے ہی اٹھی۔ رات پھر اس کا روحانی تناسخ ہو چکا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا اور وہ آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ رات بھر شبنم میں بھیگی ہوئی پختہ زمین اس کے ننگے پیروں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ پنڈت زندہ تھے تب اسے بہت سویرے نہ اٹھنے دیتے تھے۔ ٹھنڈا اسے بہت مضر تھی مگر اب وہ دن نہیں رہے۔ جھاڑو سے فرصت پا کر اس نے آگ جلائی اور کنکریاں چننے لگی۔ رفتہ رفتہ لڑکے جاگے، بہوئیں اٹھیں۔ سبھوں نے بڑھیا کو سردی سے سکڑے ہوئے کام کرتے دیکھا پر کسی نے یہ نہ کہا کہ اماں کیوں ہلکان ہوتی ہو۔ شاید وہ بڑھیا کی اس بے کسی پر دل میں خوش ہو رہے تھے۔

آج سے پھول متی کا یہی وطیر ہو گیا کہ جو کچھ بن پڑے گھر کا کام کرنا، سارے گھر کی خدمت کرنا اور انتظامی امور سے الگ رہنا۔ اس کے چہرے پر جو ایک خودداری کی جھلک نمایاں تھی اس کی جگہ ایک حسرت ناک بے بسی چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ جہاں بجلی جلتی تھی وہاں اب تیل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ جس کے بجھانے کے لیے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا کافی تھا۔ بھائیوں نے طے شدہ تجویز کے مطابق مراری لال کو انکاری خط لکھ بھیجا۔ دین دیال سے کمد کی شادی ہوگئی۔ دین دیال کی عمر چالیس سے کچھ زیادہ تھی اور خاندانی وجاہت میں ہیٹے تھے لیکن روٹی دال سے خوش تھے۔ بغیر کسی قرار کے شادی منظور کر لی۔ تاریخ مقرر ہوئی۔ بارات آئی۔ شادی ہوئی۔ کمد رخصت ہوگئی۔ پھول متی کے دل پر کیا گزری تھی اسے کون جانتا ہے۔ لیکن چاروں بھائی بے حد خوش تھے۔ گویا ان کے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو۔ شریف خاندان کی لڑکی گھر والوں کی رضا میں راضی تھی۔ تقدیر میں آرام لکھا ہوگا آرام کرے گی، تکلیف لکھی ہوگی تکلیف اٹھائے گی۔ گھر والوں نے جس سے شادی کر دی اس میں ہزار عیب ہوں تو یہی اس کا معبود، اس کا مالک۔ انحراف اس کے وہم گمان سے باہر تھا۔

پھول متی نے کسی کام میں دخل نہ دیا۔ کمد کو کیا دیا گیا، مہمانوں کی کیا خاطر مدارت کی گئی، کسی کے ہاں سے نوید میں کیا آیا، اسے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ اس سے کچھ صلاح بھی لی گئی تو یہی کہا کہ ''بیٹا تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اچھا ہی کرتے ہو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔''

جب کمد کے لیے دروازے پر ڈولی آگئی اور کمد ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی تو وہ اسے اپنی کوٹھری میں لے گئی

اور جو کچھ پچاس روپے اور دو چار زیور اس کے پاس بچ رہے تھے بیٹی کے آنچل میں ڈال کر بولی، ''بیٹی! میری تو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ نہیں تو آج کیا تمھاری شادی اس طرح ہوتی؟ اور تم اس طرح بدا کی جاتیں؟''

کمد نے روپے اور زیور آنچل سے نکال کر ماں کے قدموں پر رکھ دیے اور بولی، ''اماں میرے لیے تمھاری آشیرباد لاکھوں روپوں کے برابر ہے۔ تم ان چیزوں کو اپنے پاس رکھو۔ نہیں معلوم ابھی تمھیں کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔'' پھول متی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اُما ناتھ نے آ کر کہا، ''کیا کر رہی ہو؟ کمد چل جلدی کر۔ ساعت ٹلی جاتی ہے۔ وہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں۔ پھر تو دو چار مہینے میں آئے گی ہی، جو کچھ لینا دینا ہو لے لینا۔'' پھول متی نے دل کو سنبھال کر کہا، ''میرے پاس اب کیا ہے بیٹا جو میں اسے دوں گی۔ جاؤ بیٹی، بھگوان تمھارا سہاگ امر کریں۔''

کمد رخصت ہو گئی۔ پھول متی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔

(۵)

ایک سال گزر گیا۔ پھول متی کا کمرہ گھر میں سب کمروں سے وسیع اور ہوادار تھا۔ اس نے اسے بڑی بہو کے لیے خالی کر دیا اور ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہنے لگی جیسے کوئی بھکارن ہو۔ لڑکوں اور بہوؤں سے اسے اب کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اب گھر کی لونڈی تھی۔ گھر کے کسی فرد سے، کسی معاملے سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ زندہ صرف اس لیے تھی کہ اسے موت نہ آتی تھی۔ خوشی اور رنج کا اس کے اوپر کوئی اثر نہ تھا۔ اُما ناتھ کا مطب کھلا، احباب کی دعوت ہوئی۔ دیا ناتھ نے اخبار جاری کیا، پھر جلسہ ہوا۔ سیتا ناتھ کو وظیفہ ملا۔ وہ ولایت پڑھنے گیا۔ پھر جشن ہوا۔ کامتا ناتھ کے بڑے لڑکے کا یگیوپت ہوا، خوب دھوم دھام ہوئی۔ پھول متی کے چہرے پر مسرت کی خفیف سی جھلک بھی نظر نہ آئی۔ اُما ناتھ ٹائیفائڈ میں مہینہ بھر بیمار رہے۔ دیا ناتھ نے ایک مضمون لکھا اور دفعہ ۱۴۴ میں چھ مہینے کے لیے جیل چلے گئے۔ اما ناتھ نے ایک معاملے میں رشوت لے کر غلط رپورٹ لکھی تھی اور سال بھر کے لیے معطل کر دیے گئے۔ پھر بھی پھول متی کے چہرے پر رنج کی پرچھائیاں تک نہ پڑیں۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کی دلچسپی، کوئی آرزو، کوئی فکر نہ تھی۔ بس چوپایوں کی طرح کام کرنا اور کھانا، یہی اس کی زندگی کے دو کام تھے۔ جانور مارنے سے کام کرتا ہے، مگر کھاتا ہے دل سے۔ وہ بے کہے کام کرتی تھی مگر کھاتی تھی زہر کے نوالوں کی طرح۔ مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا۔ مہینوں کپڑے نہ دھلتے۔ کچھ پروا نہیں۔ اس میں احساس ہی گویا فنا ہو گیا تھا۔

ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ملیریا پھیل رہا تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادل، زمین پر مٹیالا پانی، نم ہوا سینوں میں بلغم اور کف بھرتی پھرتی تھی۔ مہری اور کہارن دونوں بیمار پڑ گئے۔ پھول متی نے گھر کے سارے برتن مانجھے۔

پانی میں بھیگ بھیگ کر سارا کام کیا۔ آگ جلائی، پتیلیاں چڑھا دیں اور گنگا سے پانی لانے چلی۔ کامتا ناتھ روزانہ گنگا جل پیتے تھے۔ نل کا پانی انھیں موافق نہ تھا۔

کامتا ناتھ نے چار پائی پر بیٹھے بیٹھے کہا، ''رہنے دو اماں، میں پانی بھر لاؤں گا۔ مہری اور کہارن آج دونوں غائب ہیں۔''

پھول متی نے مٹیالے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا، ''تم بھیگ جاؤ گے بیٹا، سردی ہو جائے گی۔''

''تم بھیگ رہی ہو، کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ۔''

''میں بیمار نہیں پڑوں گی۔ مجھے بھگوان نے امر کر دیا ہے۔''

اُما ناتھ بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مطب میں کچھ نفع نہ ہوتا تھا، اس لیے بہت پریشان رہتا تھا۔ بولا ''جانے بھی دو بھیا۔ بہت دنوں بہوؤں پر حکومت کر چکی ہے اس کا خمیازہ اٹھانے دو۔''

گنگا بڑھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سمندر ہے۔ افق پانی کے ساحل سے ملا ہوا تھا۔ کنارے کے درختوں کی صرف پھنگیاں پانی کے اوپر نظر آتی تھیں۔ پھول متی کلسا لیے ہوئے سیڑھیوں کے نیچے اتری۔ پاؤں پھسلا، سنبھل نہ سکی، پانی میں گر پڑی۔ پل بھر ہاتھ پانو چلائے، پھر لہریں اسے نیچے کھینچ لے گئیں۔ کنارے پر دو چار پنڈے چلائے، ''ارے بڑھیا ڈوبی جاتی ہے۔'' دو چار آدمی دوڑے بھی لیکن پھول متی لہروں میں سما گئی تھی۔ ان بل کھاتی ہوئی لہروں میں، جنھیں دیکھ کر ہی انسان سہم اٹھتا تھا۔ ایک نے پوچھا ''یہ کون بڑھیا تھی؟''

''ارے وہی پنڈت اجودھیا ناتھ کی بیوہ ہے۔''

''اجودھیا ناتھ تو بہت بڑے آدمی تھے۔''

''ہاں اس کی تقدیر میں ٹھوکر کھانا لکھا تھا۔''

اس کے تو کئی لڑکے بڑے بڑے ہیں اور سب کماتے ہیں۔''

''ہاں سب ہیں بھائی، مگر تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے۔''

☆☆☆

شانتی

مرحوم دیوناتھ میرے دوستوں میں تھے۔آج بھی جب بھی ان کی یاد آجاتی ہےتو وہ رنگ رلیاں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔اور کہیں تنہائی میں جا کر ذرا دیر رو لیتا ہوں۔میرے اور ان کے درمیان دو ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا۔میں لکھنؤ میں تھا اور وہ دہلی میں۔لیکن شاید ہی کوئی ایسا مہینہ جاتا کہ ہم آپس میں نہ مل لیتے ہوں۔وہ نہایت شریف،محبت نواز اور دوستوں پر جان دینے والے آدمی تھے،جنھوں نے اپنے پرائے میں کبھی امتیاز نہیں کیا۔دنیا کیا ہے اور یہاں شرافت ومحبت کا صلہ کیا ملتا ہے،یہ انھوں نے کبھی نہ جانا اور نہ جاننے کی کوشش کی۔ان کی زندگی میں کئی ایسے مواقعے آئے،جب انھیں آئندہ کے لیےکبھی نہ جانا اور نہ جاننے کی کوشش کی۔ان کی زندگی میں کئی ایسے موقعے آئے جب انھیں آئندہ کے لیے ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا۔دوستوں نے ان کی صاف دلی سے نامناسب فائدہ اٹھایا اور کئی مرتبہ انھیں شرمندہ بھی ہونا پڑا۔لیکن اس بھلے آدمی نے زندگی سے سبق نہ لینے کی قسم کھائی تھی۔ان کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔جیسے بھولاناتھ جیے ویسے ہی بھولاناتھ مرے۔

جس دنیا میں وہ رہتے تھے وہ نرالی دنیا تھی،جس میں بدگمانی و چالاکی اور بغض وحسد کے لیے گنجایش نہ تھی۔سب اپنے تھے،کوئی غیر نہ تھا۔میں نے بار بار انھیں متنبہ کرنا چاہا۔لیکن اس کا نتیجہ امید کے خلاف برآمد ہوا۔زندگی کے خوابوں کو پریشان کرتے ہوئے ان کا دل دکھتا تھا۔مجھے کبھی فکر ہوتی تھی کہ انھوں نے ہاتھ بند نہ کیا ہوگا؟ مصیبت یہ تھی کہ ان کی بیوی گوپا بھی کچھ اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ہماری دیویوں میں جو ایک مآل اندیشی ہوتی ہے اور اڑاؤ مردوں کی غیر مآل اندیشیوں کے لیے بینک کا کام کرتی ہے اس سے گوپا محروم تھی۔یہاں تک کہ اسے کپڑوں اور زیوروں کا بھی شوق نہ تھا۔

جب مجھے دیوناتھ کے انتقال کی خبر ملی اور میں بھاگا ہوا دہلی گیا تو گھر میں برتن بھانڈے کے سوا اور کوئی سامان نہ تھا۔ابھی مرحوم کی عمر ہی کیا تھی جو زیادہ فکر کرتے۔پورے چالیس کے بھی تو نہ ہوئے تھے۔یوں تو لڑکپن ان کی سرشت میں داخل تھا۔لیکن اس عمر میں سب ہی لوگ بے فکر ہوتے ہیں۔پہلے ایک لڑکی ہوئی،اس کے بعد دو لڑکے ہوئے۔دونوں لڑکے تو بچپن ہی میں دغا دے گئے۔لڑکی بچ رہی تھی۔

جس طرزِ معاشرت کے وہ عادی تھے،اسے دیکھتے ہوئے اس مختصر کنبے کے لیے دو سو روپے ماہوار کی

ضرورت تھی۔ دو تین سال میں لڑکی کا بیاہ بھی کرنا ہوگا۔ کیسے کیا ہوگا۔ میری عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔

اس موقع پر مجھے یہ بیش قیمت تجربہ ہوا کہ جو لوگ خدمت خلق کرتے ہیں اور ذاتی مفاد کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں سمجھتے ان کے پس ماندوں کو آڑ دینے والوں کو کبھی کمی نہیں رہتی۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے، کیوں کہ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جنھوں نے زندگی میں بہتوں کے ساتھ سلوک کیے لیکن ان کے بعد ان کے بال بچوں کی کسی نے بات نہ پوچھی۔ لیکن چاہے کچھ ہو دیوناتھ کے دوستوں نے شرافت سے کام لیا اور گوپا کی بسا اوقات کے لیے روپیا جمع کرنے کی تجویز کی۔ ایک صاحب جورنڈوے تھے اس سے بیاہ کرنے کو بھی تیار تھے لیکن گوپا نے بھی اس جذبے کا اظہار کی جو ہماری دیویوں کا جوہر ہے اور تجویز کو مسترد کر دیا۔ مکان بہت بڑا تھا۔ اُسی کا ایک حصہ کرایے پر اٹھا دیا۔ اس طرح اس کو پچاس روپے ماہوار ملنے لگے۔ وہ اتنے ہی میں اپنا نباہ کر لے گی، جو کچھ خرچ تھا وہ سنّی کی ذات سے تھا۔

اس کے ایک ہی مہینے بعد مجھے کاروبار کے سلسلے میں غیر ملک جانا پڑا اور وہاں میرے اندازے سے کہیں زیادہ دو سال لگ گئے۔ گوپا کے خطوط برابر آتے رہتے تھے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرام سے ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گوپا نے مجھے غیر سمجھا اور صحیح حالت چھپاتی رہی۔

پردیس سے لوٹ کر میں سیدھا دہلی پہنچا۔ دروازے پر پہنچتے ہی مجھے رونا آ گیا۔ موت کی افسردگی سی طاری تھی۔ جس کمرے میں دوستوں کے جمگھٹ رہتے تھے، اس کے دروازے بند تھے۔ مکڑیوں نے چاروں طرف جالے تان رکھے تھے۔ پہلی نظر میں تو شبہ ہوا کہ دیوناتھ دروازے پر کھڑے میرے طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں تو ہم پرست نہیں ہوں اور اجسام روحانی کا بھی قائل نہیں، لیکن اس وقت میں ایک بار چونک ضرور پڑا۔ دل میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی، لیکن دوسری نظر میں یہ خیالی تصویر مٹ چکی تھی۔ دروازہ کھلا۔ گوپا کے سوا کھولنے والا ہی کون تھا؟

میں نے اسے دیکھ دل تھام لیا۔ اسے میرے آنے کی اطلاع تھی اور اس نے میرے استقبال کے لیے نئی ساری پہن لی تھی اور شاید بال بھی گوندھ لیے تھے۔ پر ان دو برسوں میں وقت نے اس پر جو مظالم کیے تھے انھیں وہ کیا کرتی؟ عورتوں کی زندگی میں یہ وہ عمر ہے جب حسن و شباب اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ جب اس میں الھڑپن، شرم اور بے اعتنائی کی جگہ لگاوٹ، خوش ادائی اور دل آویزی کی جاتی ہے۔ لیکن گوپا کی جوانی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر جھرّیاں تھیں، بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔

میں نے پوچھا، ''کیا تم بیمار تھی گوپا؟''

اس نے آنسو پی کر کہا، ''نہیں تو، میرے تو کبھی سر میں درد بھی نہیں ہوا۔''

''تو اب جوانی لے کر کرنا ہی کیا ہے؟ میری عمر بھی تو بتیس سے اوپر ہو گئی۔''

''یہ عمر تو زیادہ نہیں ہوتی۔''

''ہاں ان کے لیے جو بہت دن جینا چاہتے ہوں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس سنّی کے بیاہ کی فکر ہے۔ اس سے چھٹی پا جاؤں، پھر مجھے زندگی کی پروا نہ رہے گی۔''

اب معلوم ہوا کہ جو صاحب اس مکان میں کرایہ دار تھے وہ تھوڑے دنوں بعد تبدیل ہو کر چلے گئے اور تب سے کوئی دوسرا کرایہ دار نہ آیا۔ میرے دل میں برچھی سی چبھ گئی۔ اتنے دنوں ان بے چاروں نے کس طرح بسر کی۔ یہ خیال ہی دردناک تھا۔

میں نے متاسف ہو کر کہا، ''لیکن تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی کیا میں بالکل غیر ہوں؟

گوپا نے شرمندہ ہو کر کہا، ''نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ تمھیں غیر سمجھوں گی تو اپنا کسے سمجھوں گی؟ میں نے سوچا پردیس میں تم خود اپنے جھمیلے میں پڑے ہو گے تمھیں کیا سناؤں؟ کسی نہ کسی طرح دن کٹ ہی گئے۔ گھر میں اور کچھ نہ تھا تو تھوڑے سے گہنے تھے ہی۔ اب سنیتا کے بیاہ کی فکر ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس مکان کو الگ کر دوں گی۔ بیس بائیس ہزار روپے مل جائیں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ مکان پہلے ہی رہن ہو چکا ہے اور سود ملا کر اس پر بیس بائیس ہزار ہو گئے۔ مہاجن نے اتنی ہی دَیا کیا کم کی کہ مجھے گھر سے نکال نہیں دیا۔ ادھر سے تو اب کوئی امید نہیں۔ بہت ہاتھ پانو جوڑنے پر شاید مہاجن سے دو ڈھائی ہزار روپے مل جائیں۔ اتنے میں کیا ہوگا۔ اسی فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔ لیکن میں بھی کتنی مطلبی ہوں۔ نہ تمھیں ہاتھ منہ دھونے کو پانی دیا، نہ کچھ ناشتہ کو لائی اور اپنا دکھڑا لے بیٹھی۔ اب آپ کپڑے اتاریے اور آرام سے بیٹھیے۔ کچھ کھانے کو لاؤں کھا لیجیے، تب باتیں ہوں۔ گھر میں تو سب خیریت ہے؟''

میں نے کہا، ''میں بمبئی سے سیدھا یہاں آ رہا ہوں۔ گھر کہاں گیا؟''

گوپا نے مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ اس وقت اس کی نگاہوں میں شباب کی جھلک تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے چہرے کی جھریاں مٹ گئی ہیں۔ چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی ہے۔ اس نے کہا، ''اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمھاری دیوی جی تمھیں کبھی یہاں نہ آنے دیں گی۔''

''میں کسی کا غلام ہوں؟''

''کسی کو اپنا غلام بنانے کے لیے پہلے خود بھی اس کا غلام بننا پڑتا ہے۔''

شام ہورہی تھی۔ سنیتا لالٹین لے کر کمرے میں آئی۔ دو سال پیشتر کی معصوم لڑکی اب منزلِ شباب میں قدم رکھ چکی تھی۔ جسے میں گود میں اٹھا کر پیار کرتا تھا، اس کی طرف آج آنکھیں نہ اٹھا سکا اور وہ جو میرے گلے سے لپٹ کر خوش ہوتی تھی آج میرے سامنے کھڑی بھی نہ رہ سکی۔ جیسے مجھ سے کوئی چیز چھپانا چاہتی ہے اور جیسے میں اسے اس چیز کے چھپانے کا موقع دے رہا ہوں۔

میں نے پوچھا، ''سنّی، اب تم کس درجے میں پڑھتی ہو؟''

اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا، ''دسویں میں ہوں۔''

''گھر کا بھی کچھ کام کاج کرتی ہو؟''

''اماں جب کرنے دیں؟''

گوپا نے کہا، ''میں نہیں کرنے دیتی یا خود کسی کام کے قریب نہیں جاتی۔''

سنیتا منہ پھر کر ہنستی ہوئی چلی گئی۔ ماں کی دلاری لڑکی تھی۔ جس دن گرہستی کا کام کرتی اس دن شاید گوپا رو رو کر آنکھیں پھوڑ لیتی۔ وہ خود لڑکی کو کام نہ کرنے دیتی تھی۔ مگر سب سے شکایت کرتی تھی کہ وہ کام نہیں کرتی۔ یہ شکایت بھی اس کے پیار کا ہی کرشمہ تھا۔ میں کھانا کھا کر لیٹا تو گوپا نے پھر سنیتا کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کے سوا اس کے پاس اور بات ہی کیا تھی۔ لڑکے تو بہت ملتے ہیں لیکن کچھ حیثیت بھی تو ہو۔ لڑکی کو یہ سوچنے کو موقعہ کیوں ملے کہ دادا ہوتے تو میرے لیے شاید اس سے اچھا بَر ڈھونڈتے۔ پھر گوپا نے ڈرتے ڈرتے لالہ مداری لال کے لڑکے کا ذکر کیا۔

میں نے متحیر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ لالہ مداری لال پہلے انجینئر تھے۔ اب پنشن پاتے تھے۔ لاکھوں روپے جمع کر لیے تھے۔ پر اب تک ان کی حرص کی پیاس نہ بجھی تھی۔ گوپا نے گھر بھی وہ چھانٹا تھا جہاں اس کی رسائی دشوار تھی۔

میں نے کہا، ''مداری لال تو بہت ہی بڑا آدمی ہے۔''

گوپا نے دانت تلے زبان دبا کر کہا، ''ارے نہیں بھیا تم نے انھیں پہچانا نہ ہوگا۔ میرے اوپر بڑے دیالو ہیں۔ کبھی کبھی آ کر خیریت بھی پوچھ جاتے ہی۔ لڑکا ایسا ہونہار کہ میں تم سے کیا کہوں۔ پھر ان کے ہاں کمی کس بات کی ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے وہ خوب رشوت لیتے تھے۔ لیکن یہاں دھرماتما کون ہے؟ کون موقع پا کر چھوڑ دیتا ہے۔ مداری لال نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ مجھ سے جہیز نہیں چاہتے۔ صرف لڑکی چاہتے ہیں۔ سنّی ان کے من میں بیٹھ گئی ہے۔''

مجھے گوپا کی سادگی پر رحم آیا۔ لیکن میں نے سوچا کہ میں اس کے دل میں کسی کے خلاف شبہات کیوں پیدا کروں۔

شاید مداری لال اب وہ نہ رہے ہوں۔ انسان کی طبیعت بدلتی رہتی ہے۔

میں نے متفق ہو کر کہا،'' مگر یہ تو سوچو کہ تم میں اور ان میں کس قدر فرق ہے۔ تم شاید اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی ان کا منہ سیدھا نہ کر سکو۔''

لیکن گوپا کے من میں یہ بات جم گئی تھی کہ وہ سنّی کو ایسے گھر میں بیاہنا چاہتی تھی جہاں وہ رانی بن کر رہے۔

دوسرے دن میں مداری لال کے پاس گیا اور ان سے جو میری بات چیت ہوئی اس نے مجھے مطمئن کر دیا۔ کسی زمانے میں وہ لالچی رہے ہوں گے لیکن اس وقت تو انھیں بہت ہی بلند اور پاک دل پایا۔

بولے،'' بھائی صاحب! میں دیوناتھ جی سے خوب واقف ہوں۔ وہ آدمیوں میں رتن تھے۔ ان کی لڑکی میرے گھر میں آئے، یہ میری خوش قسمتی ہے۔ آپ اس کی ماں سے کہہ دیجیے مداری لال ان سے کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا۔ خدا کا دیا ہوا میرے گھر میں سب کچھ ہے۔ میں انھیں زیر بار کرنا نہیں چاہتا۔''

میرے دل کا بوجھ اتر گیا۔ ہم سُنی سنائی باتوں سے دوسروں کے متعلق کیسے غلط خیالات قائم کر لیتے ہیں۔ میں نے آ کر گوپا کو مبارک باد دی۔ یہ طے ہوا کہ گرمیوں میں بیاہ کر دیا جائے گا۔

چار مہینے گوپا نے بیاہ کی تیاریوں میں کاٹے۔ میں مہینے میں ایک مرتبہ ضرور اس سے مل جاتا تھا، لیکن ہر مرتبہ مایوس ہو کر لوٹتا تھا۔ گوپا نے اپنے خاندان کی عزت کا نہ جانے کتنا بڑا نصب العین اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔ دیوانی اس بھرم میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کی وہ اولوالعزمی شہر میں اپنی یادگار چھوڑ جائے گی۔ یہ نہ جانتی تھی کہ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے ہیں اور آئے دن بھلا دیے جاتے ہیں۔ شاید وہ دنیا سے کہلوانا چاہتی تھی کہ اس گئی گزری حالت میں بھی لٹا ہوا ہاتھی نو لاکھ کا ہے۔ قدم قدم پر اسے دیوناتھ کی یاد آتی۔ وہ ہوتے تو یہ کام یوں نہ ہوتا یوں ہوتا اور تب وہ روتی۔ مداری لال نیک آدمی ہے۔ سچ ہے لیکن گوپا کا اپنی بیٹی کے تعلق بھی تو کچھ فرض ہے۔ اس کے دس پانچ لڑکیاں تھوڑی ہی ہیں۔ وہ تو دل کھول کر ارمان نکالے گی۔ سنیتا کے لیے اس نے جتنے گہنے اور جوڑے بنوائے تھے انھیں دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا تھا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔ کبھی سُناروں کے دکان پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کبھی مہمانوں کی مدارات کا انتظام کر رہی ہے۔ محلے میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس سے اس نے قرض نہ لیا ہو۔ وہ اسے قرض سمجھتی تھی پر دینے والے دان سمجھ کر دیتے تھے۔ سارا محلّہ اس کا مددگار تھا۔ سنیتا اب محلے کی لڑکی تھی۔ گوپا کی عزت سب کی عزت ہے۔ اور گوپا کے لیے تو نیند اور آرام حرام تھا۔ درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔ آدھی رات ہو گئی ہے مگر وہ بیٹھی کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔

اکیلی عورت اور وہ بھی نیم جان، کیا کیا کرے؟ جو کام دوسروں پر چھوڑ دیتی ہے اسی میں کچھ نہ کچھ خرابی ہو

جاتی ہے لیکن اس کی ہمت ہے کہ کسی طرح نہیں مانتی۔

پچھلی مرتبہ اس کی حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ بولا، ''گوپا دیوی، اگر مرنا ہی چاہتی ہو تو شادی ہو جانے کے بعد مرنا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس کے پہلے ہی کہیں چل نہ دو۔''

گوپا نے جواب دیا، ''بھیا! اس کی فکر نہ کرو۔ بیوہ کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ تم نے سنا نہیں، رانڈ مرے نہ کھنڈر ڈھئے۔ لیکن میری تمنا یہی ہے کہ سنّی کو ٹھکانے لگا کر میں بھی چل دوں۔ اب زندہ رہ کر کیا کروں گی۔ سوچو، کیا کروں۔ اگر کسی طرح کا رخنہ پڑ گیا تو کس کی بدنامی ہوگی؟ ان چار مہینوں میں مشکل سے گھنٹہ بھر سوتی ہوں گی۔ نیند ہی نہیں آتی۔ لیکن میرا دل خوش ہے۔ میں مروں یا جیوں مجھے تسکین تو ہوگی کہ سنیتا کے لیے اس کا باپ جو کر سکتا تھا وہ میں نے کر دیا۔ مداری لال نے اپنی شرافت دکھائی تو مجھے بھی اپنی ناک رکھنی ہے۔''

ایک دیوی نے آ کر کہا، ''بہن! ذرا چل کر دیکھ لو۔ چاشنی ٹھیک ہو گئی ہے یا نہیں؟'' گوپا اس کے ساتھ چاشنی کا امتحان کرنے گئی اور ایک لمحہ بعد آ کر بولی، ''جی چاہتا ہے کہ سر پیٹ لوں۔ تم سے ذرا باتیں کرنے لگی، ادھر چاشنی اتنی کڑی ہو گئی کہ لڈو دانتوں سے لڑیں گے۔ کسی سے کیا کہوں؟''

میں نے چڑ کر کہا، ''تم بیکار کی جھنجھٹ کر رہی ہو۔ کیوں نہیں کسی حلوائی کو بلا کر مٹھائیوں کا ٹھیکہ دے دیتیں؟ پھر تمھارے یہاں مہمان ہی کتنے آئیں گے جن کے لیے طومار باندھ رہی ہو۔ دس پانچ کی مٹھائی ان کے لیے بہت ہوگی۔''

میری یہ بات شاید گوپا کو ناگوار ہوئی۔ ان دنوں اسے بات بات پر غصہ آ جاتا تھا۔

بولی، ''بھیا! تم یہ باتیں نہ سمجھو گے۔ تمھیں نہ ماں بننے کا موقع ملا نہ بیوی بننے کا۔ سنیتا کے باپ کا کتنا نام تھا۔ کتنے آدمی ان کے دم سے پلتے تھے۔ کیا تم نہیں جانتے یہ پگڑی میرے ہی سر تو بندھی ہے۔ تمھیں یقین نہ آئے گا، ناستک ہی جو ٹھہرے! پر میں تو انھیں سدا اپنے اندر بیٹھا ہوا پاتی ہوں۔ جو کچھ کر رہے ہیں وہی کر رہے ہیں۔ میں ناقص العقل بھلا اکیلی کیا کر لیتی؟ وہی میرے مددگار ہیں، وہی میرے رہبر ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ جسم میرا ہے لیکن اس کے اندر جو آتما ہے وہ ان کی ہے۔ تم ان کے دوست ہو۔ تم نے اپنے سیکڑوں روپے خرچ کیے اور اتنے حیران ہو رہے ہو۔ میں تو ان کی شریک زندگی ہوں۔ لوک میں بھی اور پرلوک میں بھی۔''

میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

جون میں شادی ہو گئی۔ گوپا نے بہت کچھ دیا اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ دیا لیکن پھر بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا۔ اگر آج سنیتا کے باپ ہوتے تو نہ جانے کیا کرتے! برابر روتی رہی۔

جاڑوں میں پھر دہلی گیا کہ گوپا اب خوش ہوگی۔لڑکی کا گھر اور بر دونوں اچھے ہیں۔گوپا کو اس کے سوا اور کیا چاہیے۔لیکن سکھ اس کے مقدر میں ہی نہ تھا۔

میں ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ اس نے اپنا دکھڑا شروع کر دیا، ''بھیا! گھر دوار سب کچھ اچھا ہے، ساس سسر بھی اچھے ہیں لیکن داماد نکمّا نکلا۔سنّی بے چاری رو رو کر دن کاٹ رہی ہے۔تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو۔بس اس کا سایہ ہی رہ گیا ہے۔ابھی چند دن ہوئے آئی تھی۔اس کی حالت دیکھ کر چھاتی پھٹتی ہے۔نہ تن بدن کی سدھ ہے، نہ کپڑے لتے کی۔میری سنیتا کی یہ درگت ہوگی، یہ تو میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔بلکل گم صم سی ہوگئی ہے۔کتنا پوچھا، بیٹا تجھ سے وہ کیوں نہیں بولتا۔بس آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ہیں۔میری سنّی تو کنویں میں گر گئی۔''

میں نے کہا، ''تم نے اس کے گھر والوں سے پتا نہیں لگایا؟''

''لگایا کیوں نہیں بھیا۔سب حال معلوم ہوگیا۔لڑکا چاہتا ہے کہ میں چاہے جس راہ جاؤں سنّی میری پوجا کرتی رہے۔سنّی بھلا اسے کیوں سہنے لگی۔اسے تم جانتے ہو کہ کتنی خوددار ہے۔وہ ان عورتوں میں سے نہیں ہے جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں اور اس کی بدسلوکیاں برداشت کرتی رہتی ہیں۔اس نے ہمیشہ دلار پایا ہے۔باپ بھی اس پر جان دیتا تھا۔میں بھی آنکھ کی پتلی سمجھتی تھی۔شوہر ملا چھیلا جو آدھی آدھی رات تک مارا مارا پھرتا ہے۔دونوں میں کیا بات ہوئی یہ کون جان سکتا ہے۔لیکن دونوں میں کوئی گانٹھ پڑ گئی ہے۔نہ وہ سنّی کی پروا کرتا ہے اور نہ سنّی اس کی پروا کرتی ہے۔مگر وہ تو اپنے رنگ میں مست ہے۔سنّی جان دیے دیتی ہے۔''

میں نے کہا، ''لیکن تم نے سنّی کو سمجھایا نہیں۔اس لونڈے کا کیا بگڑے گا۔اس کی زندگی خراب ہوجائے گی۔''

تو گوپا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، بولی، ''بھیا! کس دل سے سمجھاؤں؟ سنّی کو دیکھ کر تو میری چھاتی پھٹتی ہے۔بس یہی جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے کلیجے میں رکھ لوں کہ اسے کوئی کڑی آنکھ سے دیکھ بھی نہ سکے سنّی پھوہڑ ہوتی، آرام طلب ہوتی تو سمجھاتی بھی۔کیا یہ سمجھاؤں کہ تیرا شوہر گلی گلی منہ کالا کرتا پھرے اور تو اس کی پوجا کر۔میں تو خود یہ ذلت برداشت نہ کر سکتی۔مرد اور عورت میں بیاہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں سولہ آنے ایک دوسرے کے ہوجائیں۔ایسے مرد کم ہیں جو عورت کی کج نگاہی بھی برداشت کر سکیں۔لیکن ایسی عورتیں بہت ہیں جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں۔سنّی ان عورتوں میں نہیں ہے۔وہ اگر محبت کرتی ہے تو محبت چاہتی بھی ہے اور اگر شوہر میں یہ بات نہ ہوگی تو اس سے واسطہ نہیں رکھے گی۔چاہے اس کی ساری زندگی روتے کٹ جائے۔''

یہ کہہ کر گوپا اندر گئی اور ایک سنگھاردان لا کر بولی، ''سنّی اسے اب کے یہیں چھوڑ گئی۔اسی لیے آئی تھی۔یہ وہ گہنے ہیں جنھیں میں نے نہ جانے کتنی تکلیفیں برداشت کر کے بنوائے تھے۔ان کے پیچھے مہینوں ماری ماری پھری تھی۔

یوں کہو کہ بھیک مانگ کر جمع کیے تھے۔ سنّی اب ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ پہنے تو کس لیے؟ سنگھار کرے تو کس پر؟ پانچ صندوق کپڑوں کے دیے تھے۔ کپڑے سیتے سیتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔ وہ سب کپڑے اٹھا لائی۔ ان چیزوں سے اسے اب نفرت سی ہو گئی ہے۔ بس کلائی میں کانچ کی دو چوڑیاں اور ایک اجلی سی ساری یہی اس کا سنگھار ہے۔''

میں نے گوپا کو دلاسا دیا کہ میں جا کر ذرا کیدار ناتھ سے ملوں گا۔ دیکھوں تو وہ کس رنگ ڈھنگ کا آدمی ہے۔ گوپا نے ہاتھ جوڑ کر کہا،'' بھیا! بھول کر بھی نہ جانا۔ سنّی سنتے ہی جان دے دے گی۔ غیرت کی پتلی ہی سمجھو اسے۔ رسی سمجھ لو جس کے جل جانے پر بھی بل نہیں جاتے۔ جن پیروں نے اسے ٹھکرا دیا ہے انھیں وہ کبھی نہ سہلائے گی۔ اسے اپنا بنا کر کوئی چاہے تو لونڈی بنا لے لیکن حکومت تو اس نے میری نہ سہی، دوسروں کی کیا سہے گی۔''

میں نے گوپا سے تو اس وقت کچھ نہ کہا۔ لیکن موقع پاتے ہی لالہ مداری لال سے ملا۔ میں راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے باپ بیٹے دونوں ایک ہی جگہ مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی کیدار ناتھ نے اس طرح جھک کر چرن چھوئے کہ میں اس کی سعادت مندی سے متاثر ہوا۔ جلدی سے اندر گیا اور چائے، مربہ اور مٹھائیاں لایا۔ اتنا شائستہ، اتنا شریف اور اتنا خلیق نوجوان میں نے نہ دیکھا تھا۔ یہ گمان ہی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کے اندر اور باہر میں کوئی فرق ہو سکتا ہے۔ جب تک رہا سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب وہ ٹینس کھیلنے چلا گیا تو میں نے مداری لال سے کہا:

'' کیدار بابو تو بہت ہی نیک معلوم ہوتے ہیں۔ پھر میاں بیوی میں اتنی کشیدگی کیوں ہو گئی ہے؟''

مداری لال نے ایک لمحہ غور کر کے جواب دیا،'' اس کا سبب سوائے اس کے اور کیا بتاؤں کہ اپنے ماں باپ کے لاڈلے ہیں اور پیار لڑکوں کو اپنے من کا بنا دیتا ہے۔ میری ساری عمر محنت میں کٹی، اب جا کر ذرا راحت ملی ہے۔ رنگ رلیوں کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔ دن بھر محنت کرتا تھا اور شام کو پڑ کر سو رہتا تھا۔ صحت بھی اچھی نہ تھی۔ اس لیے برابر یہی فکر سوار رہتی تھی کہ کچھ جمع کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پیچھے بال بچے بھیک مانگتے پھریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مہاشے کو مفت کی دولت ملی۔ سنک سوار ہو گئی، شراب اڑنے لگی، پھر ڈراما کھیلنے کا شوق ہوا۔ روپے کی کمی تھی نہیں، اس پر ماں باپ کے اکیلے بیٹے، ان کی ہوا خوشی ہی ہماری زندگی کا ڈراما کھیلنے لگے۔ میں نے یہ رنگ دیکھا تو مجھے فکر ہوئی۔ سوچا بیاہ کر دوں، ٹھیک ہو جائے گا۔ گوپا دیوی کا پیغام آیا تو میں نے منظور کر لیا۔ میں سنّی کو دیکھ چکا تھا۔ سوچا ایسی خوبصورت بیوی پا کر اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن اتفاق سے وہ بھی لاڈلی لڑکی تھی۔ ضدی اور ہٹیلی۔ مفاہمت کا زندگی میں کیا درجہ ہے اس کی اسے خبر ہی نہیں۔ لوہا لوہے سے لڑ گیا۔ یہ ہے سارا بھید اور صاحب میں تو بہو ہی کو زیادہ خطاوار سمجھتا ہوں۔ لڑکے تو سب ہی من چلے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہیں۔ ان کی سیوا،

قربانی اور محبت یہی ان کے وہ ہتھیار ہیں جن سے وہ اپنے شوہر پر فتح حاصل کر لیتی ہیں۔ بہو میں یہ گن نہیں ہیں۔ ناؤ کیسے پار ہوگی، خدا ہی جانے۔''

اتنے میں سنیتا اندر سے آ گئی۔ اپنی تصویر کا بالکل مٹا ہوا خاکہ تھی۔ کندن تپ کر بھسم ہو گیا تھا۔ مٹی ہوئی تمناؤں کی اس سے اچھی تصویر نہیں ہو سکتی۔ مجھ طعن کرتی ہوئی بولی، ''آپ جانے کب سے بیٹھے ہوئے ہیں، مجھے خبر تک نہیں۔ آپ شاید باہر ہی باہر چلے جاتے۔''

میں نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا، ''نہیں سنّی! یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ تمھارے پاس آ ہی رہا تھا کہ تم خود آ گئیں۔''

لالہ مداری لال کمرے سے باہر اپنے موٹر کی صفائی کرنے لگے۔ شاید مجھے سنّی سے بات چیت کا موقع دینا چاہتے تھے۔

سنّی نے پوچھا، ''اماں تو اچھی ہیں؟''

میں نے کہا، ''وہ تو اچھی ہیں۔ لیکن تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے؟''

''میں تو بہت اچھی طرح ہوں۔''

''یہ بات کیا ہے؟ تم لوگوں میں کیا اَن بن ہے؟ گو پا دیوی جان دیے ڈالتی ہیں۔ تم خود مرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ کچھ تو عقل سے کام لو۔''

سنّی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ بولی، ''آپ ناحق یہ گفتگو چھیڑ دی۔ میں نے تو یہ سمجھ کر اپنے دل کو سمجھا لیا کہ میں بدنصیب ہوں۔ بس ان باتوں کا علاج میرے قابو سے باہر ہے۔ میں اس زندگی سے موت کو کہیں بہتر سمجھتی ہوں۔ جہاں اپنی قدر نہ ہو زندگی کی کوئی دوسری شکل میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس معاملے میں کسی طرح کا سمجھوتہ کرنا میرے لیے غیر ممکن ہے۔ نتیجے کی میں پروا نہیں کرتی۔''

''لیکن۔۔۔''

''نہیں چاچا جی۔ اس معاملے میں آپ کچھ نہ کہیے۔ نہیں تو میں چلی جاؤں گی۔''

''آخر سوچو تو۔۔۔۔''

''میں سب سوچ چکی اور طے کر چکی۔ حیوان کو انسان بنانا میری طاقت سے باہر ہے۔''

مئی کا مہینہ تھا۔ میں مسوری گیا تھا کہ گو پا کا تار پہنچا، ''فوراً آؤ بہت ضروری کام ہے۔'' میں گھبرا کر دوسرے ہی دن دہلی پہنچا۔ گو پا دِق کی مریضہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا، ''سنّی تو اچھی ہے؟''

اس نے جواب دیا، ''ہاں۔''

''اور کیدار ناتھ؟''

''وہ بھی اچھی طرح ہے۔''

''تو ماجرا کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''تم نے مجھے تار دے کر بلایا اور پھر کہتی ہو کہ کوئی بات نہیں۔''

''دل گھبرا رہا تھا، اس لیے تم کو بلایا۔ سنّی کو کسی طرح سمجھا کر یہاں لانا ہے۔ میں تو سب کچھ کر کے تھک گئی۔''

''کیا اِدھر کوئی نئی بات ہو گئی ہے؟''

''نئی تو نہیں۔ لیکن ایک طرح سے نئی ہی سمجھو۔ کیدار ایک ایکٹریس کے ساتھ کہیں بھاگ گیا۔ ایک ہفتے سے کچھ پتا نہیں۔ سنّی سے کہہ گیا ہے کہ جب تک تم رہو گی میں گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ سنا ہے کہ کیدار اپنے باپ کے جعلی دستخط بنا کر کئی ہزار روپے بھی بینک سے لے گیا ہے۔''

''تم سنّی سے ملی تھیں؟''

''ہاں، تین دن سے برابر جا رہی ہوں۔''

''اگر سنّی نہیں آنا چاہتی تو تم رہنے کیوں نہیں دیتیں؟''

''وہاں وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔''

میں اسی وقت مداری لال کے پاس گیا۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی بولے، ''بھائی صاحب! میں تو لٹ گیا۔ لڑکا بھی گیا اور بہو بھی گئی۔''

معلوم ہوا کہ جب سے کیدار غائب ہو گیا ہے، سنّی اور بھی اداس رہنے لگی تھی۔ اس نے اسی دن اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور مانگ کا سیندور پونچھ ڈالا تھا۔ کسی سے بات نہ کرتی تھی۔ آج صبح وہ جمنا اشنان کرنے گئی۔ اندھیرا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ کسی کو نہیں جگایا۔ جب دن چڑھ گیا اور بہو نہ ملی تو اس کی تلاش ہونے لگی۔ دوپہر کو پتا چلا کہ جمنا گئی ہے۔ لوگ ادھر بھاگے۔ وہاں اس کی لاش ملی۔ پولیس آئی۔ لاش کا معائنہ ہوا۔ اب لاش واپس ملی ہے۔

میں کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ ارتھی کے ساتھ گیا اور وہاں سے لوٹا تو رات کے دس بج گئے تھے۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ خبر پا کر گوپا کی کیا حالت ہو گی۔ اس ابھاگن کے باغِ تمنا میں یہی ایک پودا تھا۔ اسے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر پال رہی تھی۔ اس کی بسنت کا سنہرا خواب ہی اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ اس میں کونپلیں نکلیں گی، پھول کھلیں گے، پھل آئیں گے، چڑیاں اس کی ڈالیوں میں بیٹھ کر اپنے سہانے راگ گائیں گی۔

لیکن آج موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس پودے کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کی زندگی اب بیکار تھی۔ وہ نقطہ ہی مٹ گیا تھا جس پر زندگی کے تمام خطوط آ کر ملتے تھے۔ دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے میں نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ گوپا ایک لالٹین لیے نکلی۔ میں نے گوپا کے چہرے پر سکون کی ایک نئی جھلک دیکھی۔ اس نے مجھے غمگین دیکھ کر محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی، ''آج تو تمھارا سارا دن روتے ہی کٹا۔ لاش کے ساتھ تو بہت آدمی ہوں گے۔ میرے جی میں بھی آیا تھا کہ چل کر سنّی کا آخری درشن کرلوں۔ لیکن میں نے سوچا کہ جب سنّی ہی نہ رہی تو اس کی لاش میں کیا رکھا ہے۔ نہ گئی۔''

میں حیرت سے گوپا کا منہ دیکھنے لگا۔ اسے اس افسوس ناک حادثے کی اطلاع مل گئی تھی۔ لیکن وہ کس قدر صابر و پُرسکون ہے۔ میں کہا، ''اچھا کیا تم نہیں گئیں۔ رونا ہی تو تھا۔''

گوپا نے کہا، ''ہاں اور کیا۔ روئی تو یہاں بھی۔ لیکن تم سے سچ کہتی ہوں کہ دل سے نہیں روئی۔ نہ جانے آنسو کس طرح نکل آئے۔ مجھے درحقیقت سنّی کی موت سے خوشی ہوئی۔ بدنصیب اپنی عزت و خودداری کے لیے دنیا سے رخصت ہوگئی۔ نہیں تو نہ جانے کیا کیا دیکھنا پڑتا۔ اس لیے اور بھی خوش ہوں کہ اس نے اپنی آن نبھا دی۔ عورت کو زندگی میں محبت نہ ملے تو اس کا مرجانا ہی اچھا ہے۔ تم نے سنّی کی لاش دیکھی تھی؟ لوگ کہتے ہیں ایسا جان پڑتا تھا کہ مسکرا رہی ہے۔ میری سنّی سچ مچ دیوی تھی۔ بھیا! انسان اس لیے تھوڑے ہی جینا چاہتا ہے کہ روتا رہے۔ جب معلوم ہوگیا کہ زندگی میں دکھ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو آدمی جی کر کیا کرے؟ کس لیے جیے؟ کھانے سونے اور مرجانے کے لیے؟ یہ میں نہیں کہتی کہ مجھے سنّی کی یاد نہ آئے گی یا میں اسے یاد کر کے روؤں گی نہیں، لیکن وہ غم کے آنسو نہ ہوں گے خوشی کے آنسو ہوں گے۔ بہادر بیٹے کی ماں اس کی بہادری سے خوش ہوتی ہے۔ سنّی کی موت کیا کم باعث فخر ہے؟ میں آنسو بہا کر اس فخر کو کیوں برباد کروں؟ وہ جانتی ہے کہ ساری دنیا اس کی مذمت کرے، اس کی ماں اس کی تعریف ہی کرے گی۔ اس کی روح سے یہ مسرت بھی چھین لوں؟ لیکن اب رات زیادہ ہوگئی ہے۔ اوپر جا کر سو رہو۔ میں نے تمھاری چارپائی بچھا دی ہے۔ مگر دیکھو! اکیلے پڑے پڑے رونا نہیں۔ سنّی نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس کے پتا ہوتے تو آج سنّی کی مورت بنا کر پوجتے۔''

میں اوپر جا کر لیٹا تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا تھا لیکن بار بار یہ شک ہونے لگتا تھا کہ گوپا کی یہ شانتی اس کے دکھ کا ہی دوسرا روپ تو نہیں؟

☆☆☆

روشنی

آئی ۔سی ۔ایس پاس کر کے ہندوستان آیا تو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔شکار کا بہت سوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی ۔میری دلی مراد بر آئی ۔ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔بنگلے ہی پر کچہری کرلیا کرتا تھا۔اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی ،اس لیے سیر وشکار اوراخبارات ورسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے! سوچتا تھا وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شاندار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا، پھاگن کا مہینہ۔ میں دورے پر نکلا اور لندھوار کے تھانے کا معائنہ کر کے گجن پور کے تھانے کو چلا۔کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی ،مگر منظر نہایت سہانا۔دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوشگوار نہیں۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی ۔آم کے درختوں میں بور آ گئے تھے اور کوئل کو کنے لگی تھی ۔کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں ۔ کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا۔ کیونکہ ان دنوں جا بجا ڈاکے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا۔چلو بیٹا چلو۔ڈھائی گھنٹے کی دوڑ ہے،شام ہوتے ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے اور ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دیئے گئے تھے۔

جا بجا کاشتکار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ربیع کی فصل تیار ہو چکی تھی ۔اوکھ اور خربوزے کے لیے زمین تیار کی جارہی تھی ۔ ذرا ذرا سے مرزعے تھے۔ وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل ،وہی افسوسناک جہالت ،وہی شرم ناک نیم برہنگی ،اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے۔ نئی نئی تحقیقاتیں اور ایجادیں ہوتی ہیں ۔ڈائرکٹر ،انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح ،کوئی تغیر نہیں ۔تعلیم کا طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں ۔جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں ۔ بڑی دوا دوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں ۔جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کرلیا ہو، اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں ، مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی ۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی

زمانے میں آسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا۔لیکن اس سلف پروری سے کیا حاصل ۔آج تو مغرب دنیا کا مشعل ہدایت ہے۔ننھا سا انگلینڈ نصف کرۂ زمین پر حاوی ہے۔اپنی صنعت وحرفت کی بدولت بیشک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے، اس کا مستقبل تاریک ہے۔ جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشین فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں ۔ جہاں آج بھی شجر وحجر کی عبادت ہوتی ہے۔ جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے۔اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

میں انھیں تصورات میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا۔مشرق کی جانب منظر گرد آلود ہو رہا تھا، افق گرد وغبار کے پردے میں چھپ گیا تھا۔ راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔ گویا میں یکہ وتنہا طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جا رہا تھا۔ ہوا اتنی ہو گئی وہ پردۂ غبار سر پر آ پہنچا اور دفعتاً میں گرد کے سمندرے میں ڈوب گیا، ہوا اتنی تند تھی کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سرسراہٹ، اور گرگراہٹ تھی کہ الامان! گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی تھی ۔ دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صانہ پیدا ہوتی ۔ مارے گرد کے کچھ نہ سوجتا تھا، یہاں تک کہ روستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔اُف، قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا تھا۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔سنگریزے گرد کے ساتھ اڑ کر منھ پر اس طرح لگتے تھے، جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کو مار رہا ہو میری آنتیں تک سمٹ جاتیں ، کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں ۔طوفان میں ہی بڑے بڑے تودے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔کوئی ایسا تو دہ لڑھکتا ہوا آ جائے تو بس خاتمہ ہے، ہلنے کی بھی گنجائش نہیں ۔ پہاڑی راستہ کچھ سوجھائی دیتا نہیں ۔ ایک قدم داہنے بائیں ہو جاؤں تو ایک ہزار فیٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں ۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔کہیں شام یک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آ کر صفایا کر دے گا۔ دل پر بے اختیار رقّت کا غلبہ ہوا۔موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتہ نہ چلے۔افواہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ، سینے کے اندر گھس گیا۔ دفعتاً جھن جھن کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔اس ارا راہٹ میں بھی جھن جھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آ رہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی، مگر اسے راستہ کیوں کر سوجھ رہا ہے۔کہیں سانڈنی ایک قدم بھی ادھر ادھر ہو جائے تو بچہ تحت الثری میں پہنچ جائیں۔کوئی زمیندار ہوگا۔ مجھے دیکھ کر شاید پہچانے بھی نہیں، چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے، مگر ہے بلا کا ہمت والا۔

ایک لمحے میں جھن جھن کی آواز قریب آ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم

بڑھاتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی آ رہی ہے، نہ آندھی کا خوف ہے نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ چٹانوں کے گرنے کا غم، گویا یہ بھی کوئی روزمرہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے دل میں غیرت کا حساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا اور اس سے بولا۔ ''او عورت! گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

میں نے پوچھا تو بلند لہجے میں، مگر آواز دس گز نہ پہنچی۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخ کر پکارا۔ ''او عورت! ذرا ٹھہر جا۔ گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

عورت رک گئی۔ اس نے میرے قریب آ کر، مجھے دیکھ کر، ذرا سا جھکا کر کہا۔ ''کہاں جاؤ گے۔''

''گجن پور کتنی دور ہے؟''

''چلے آؤ۔ آگے ہمارا گاؤں ہے۔ اس کے بعد گجن پور ہے۔''

وہ تمھارا گاؤں کتنی دور ہے؟''

''وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے۔''

''تم اس آندھی میں کہیں رک کیوں نہیں گئیں؟''

''چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں۔ کیسے رک جاتی۔ مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا۔'' آنھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا' گرد وغبار رکی ایک دھونکنی سی منہ پر لگی۔ اس عورت کا کیا حشر ہوا مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا، فلسفے نے کہا، اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا م دو تین فاقہ کش بچے۔ بیکسی میں موت کا کیا غم۔ موت تو اسے باعث نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے۔ زندگی اپنی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برادری کر رہی ہے، حوصلے ہیں، ارادے ہیں۔ میں اسے کیوں کر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔ شتر مرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر بالوں میں سر چھپا لیتا ہے۔

وہ آندھی کی آخری سانس تھی۔اس کے بعد بتدریج زور کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہوگیا۔ نہ گرد وغبار کا نشان تھا نہ ہوا کے جھونکوں کا۔۔۔ ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آ گئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے۔سامنے ایک پہاڑی تھی، اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا موضع تھا میں جو ہی اس گان وں میں پہنچا ، وہی عورت ایک بچے کو گود میں لیے میری طرف آ رہی تھی، مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا: ''تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ نہ بھول گئے ہو۔ تمھیں ڈھونڈھنے جا رہی تھی۔''

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا۔'' میں اس کے لیے تمھارا بہت ممنون ہوں۔آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے رستہ نہ سوجھا۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا تھا۔ یہی تمھارا گان وں ہے؟ یہاں سے گجن پور کتنی دور ہوگا؟''

''بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے، کہیں دہنے بائیں مڑیو نہیں۔سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے۔''

''یہی تمھارا بچہ ہے۔''

''نہیں ایک اور اس سے بڑا ہے جب آندھی آئی تو دونوں نمبردار کی چوپال میں جا کر بیٹھے تھے کہ جھونپڑیا کہیں اڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں یہ میری گود سے نہیں اترتا۔ کہتا ہے تو پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ بڑا شیطان ہے۔لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے، اب میرے کون بیٹھا ہوا ہے، جس پر ٹیک کروں۔گھاس لے کر بیچنے گئی تھی۔کہیں جاتی ہوں من ان بچوں میں لگا رہتا ہے۔''

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے، لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث انداز گفتگو، اس کی سادگی اور جذبۂ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا اس کے حالات سے مجھے گونہ دلچسپی ہوگئی۔ پوچھا۔''تمھیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہوگئے۔''

عورت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی، ''ابھی تو کل چھ مہینے ہوئے ہیں بابو جی۔'' بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس۔ بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی۔بس آنکھیں بند ہوگئیں۔نہ کچھ کہا نہ سنا۔ میں سمجھی تھکے ہیں سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے کو اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا۔تب سے بابو جی گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچوں کو کھلاتی ہوں۔کھیتی میرے مان کی نہ تھی۔بیل بدھئے بیچ کر انھیں کے کریا کرم میں لگا دیئے۔بھگوان تمھارے ان دونوں گلاموں کو جلا دے میرے لیے یہی بہت ہیں۔''

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں، اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں، لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی

کہ میں آب دیدہ ہوگیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔''میری طرف سے یہ بچوں کے مٹھائی کھانے کے لیے لو۔ مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے بچے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔

ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔''نہیں بابو جی، یہ رہنے دیجیے۔ میں غریب ہوں، لیکن بھکارن نہیں ہوں۔''

''یہ بھیک نہیں ہے بچوں کو مٹھائی کھانے کے لیے ہے۔''

''نہیں بابو جی'' ۔

''مجھے پنا بھائی سمجھ کر لے لو۔''

''نہیں بابو جی۔ جس سے بیاہ ہوا اس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمھارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ، نہیں دیر ہو جائے گی۔''

میں دل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل، کور باوطن، بے خبر سمجھتا تھا، اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری، یہ فرض شناسی، یہ توکل! اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہوگیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں، تو یہ عورت تعلیم کی معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔ میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا''تمھیں اس آندھی میں ذرا بھی ڈر نہ معلوم ہوتا تھا؟''

عورت مسکرائی۔''ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں، تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو آدمی تو گھر آ کر بیٹھے بیٹھے چل دیا۔ آج وہ ہوتا تو تم اس طرح گجن پورا کیلے نہ جا پاتے۔ جا کر تمھیں پہنچا آتا۔ تمھاری خدمت کرتا۔''

گھوڑا اُڑا۔ میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اُڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پا کر دل میں ایک طرح پرواز کا احساس کرتا ہے وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعد الطبیعات کے دفتروں سے بھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ میں مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا ایک غیر مترقبہ کے غرور سے مسرور، اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے، اُڑا چلا جاتا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس پارۂ زر کو دل کے کسی گوشے میں چھپا لوں، جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

گجن پور پانچ میل سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ، بیہڑ بے برگ و بار۔ گھوڑے کو روکنا پڑا۔ تیزی میں جان کا خطرہ تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھلتا ہوا چلا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر آیا۔ کچھ کچھ تو پہلے ہی چھایا ہوا تھا۔ پر اب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر افق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی ایک نئی تہہ اس مٹیالے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا اولے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی، یکا یک سامنے ایک کفِ دست میدان آ گیا۔ جس کے پرلے سرے پر گجن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آ رہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی۔ لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے، جو مجھے ہر آفت ہر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا، وہ بار بار ہنہناتا تھا، اور اڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے۔ لگام ڈھیلی کر دی۔ گھوڑا اڑا۔ میں اس کی تیزی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

ایک میل نکل گیا ہوں گا کہ ایک رپٹ آ پڑی۔ پہاڑی ندی تھی، جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی رپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار رپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی۔ رپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا۔ میں نے دیکھا ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا رپٹ سے گزر رہا تھا۔ وہ رپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی۔ کیونکہ وہاں پانی گہرا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''بڈھے اور داہنے کو ہو جا۔''

بڈھا چونکا، اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا اور بائیں طرف ہو لیا اور پھسل کر پانی میں گر پڑا۔ اسی وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے گرا۔ دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی۔ میں ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن یہ نیا عقیدہ سامنے آ گیا۔ کیا اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے لیے بھاگوں؟ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا زیادہ پس و پیش کا موقع نہ تھا، میں فوراً گھوڑے سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے۔ میں پانی میں کود پڑا۔ ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔ رپٹ کے لیے جو بنیاد کھودی گئی تھی وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ ٹھیکے دار نے دس فیٹ چوڑی رپٹ تو بنا دی، مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔ بڈھا اسی گڈھے میں گرا تھا۔ میں بھی ایک غوطہ کھا گیا، لیکن تیرنا جانتا تھا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا۔

جسم بے جان ہو رہا تھا۔ میں اس لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا، دیکھا تو گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے۔ اس نیم جان لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔ اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔ کبھی سر پر، کبھی شانے پر، کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔ میں تلملا اٹھا تھا، لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا جاتا تھا۔ میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں تو شاید خیال ہو، میں خواہ مخواہ تعلّی کر رہا ہوں۔ اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرت ہوتی ہے، مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔ وہ فاتحانہ مسرت تھی۔ میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔ آج سے پہلے غالباً میں اس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر، تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں، میں کبھی پانی میں نہ گھستا۔ ہر لحظہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے، مگر میں خوش تھا۔ کیوں کہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا، مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ ہوا میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی، وہ اس وقت کام آئی۔ میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔ مجھے اس کی تیمارداری سے نجات ملی۔ اولے نکل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔ رومال سے ساز کو صاف کیا اور گجن پور چلا۔ بے خوف، بے خطرہ، دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔ اسی وقت اندھے نے پوچھا۔ ''تم کون ہو بھائی، مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''تمھارا خادم ہوں۔''

''تمھارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوا ہے۔''

''ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے۔''

''وہ کون دیوی ہے؟''

''وہ دیوی پیچھے کے گاؤں میں رہتیں ہے۔''

''وہ کیا عورت ہے؟''

''نہیں میرے لیے تو وہ دیوی ہے۔''

☆☆☆

مالکن

شیو داس نے اس بھنڈار کی کنجی اپنی بہو رام پیاری کے سامنے پھینک دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا، ''بہو آج سے گرہستی کی دیکھ بھال تمھارے ذمے ہے۔ میرا سکھ بھگوان سے نہیں دیکھا گیا۔ نہیں تو کیا جوان بیٹے کو یوں چھین لیتے؟ مگر اس کا کام کرنے والا تو کوئی چاہیے۔ اب ہل توڑ دوں تو گزر نہ ہوگی، اس لیے برجو کا ہل اب میں ہی سنبھالوں گا۔ پھر گھر کی دیکھ بھال کرنے والا، رکھنے والا تمھارے سوا دوسرا کون ہے؟ روؤ مت بیٹا! بھگوان کی جو مرضی تھی وہ ہوا اور جو مرضی ہوگی وہ ہوگا۔ ہمارا تمھارا کیا اختیار ہے۔ میرے جیتے جی تمھیں کوئی ٹیڑھی نگاہوں سے بھی نہ دیکھ سکے گا۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ برجو گیا تو میں تو ابھی بیٹھا ہی ہوں۔''

رام پیاری اور رام دلاری دو حقیقی بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی متھرا اور برجو دو حقیقی بھائیوں سے ہوئی۔ دونوں بہنیں میکے کی طرح سسرال میں بھی محبت اور آرام سے رہنے لگیں۔ شیو داس کو فرصت ملی۔ دن بھر دروازے پر بیٹھا گپ شپ کرتا۔ آباد گھر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ دھرم کے کاموں کی طرف طبیعت مائل ہونے لگی۔ لیکن خدا کی مرضی بڑا لڑکا جو بیمار پڑا اور آج اسے مرے ہوئے پندرہ روز ہو گئے۔ آج اس کے آخری مراسم سے فرصت ملی اور شیو داس نے سچ بہادر کی طرح کارزارِ حیات کے لیے کمر باندھ لی۔ دل میں چاہے اسے کتنا ہی صدمہ ہوا ہو، اسے کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آج اپنی بہو کو دیکھ کر اُن کے لیے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں لیکن اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالا اور بھرّائی ہوئی آواز میں اسے دلاسا دینے لگا۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ گھر کی مالکن بن کر بیوہ کے آنسو پچھ جائیں گے۔ کم سے کم اسے محنت تو نہ کرنی پڑے گی۔

رام پیاری نے رقّت آمیز لہجے میں کہا، ''یہ کیسے ہوسکتا ہے دادا! تم محنت مزدوری کرو اور میں مالکن بن بیٹھوں۔ کام دھندے میں لگی رہوں گی تو دل بہلتا رہے گا۔ بیٹھے بیٹھے رونے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔''

شیو داس نے سمجھایا، ''بیٹا! بھگوان کی مرضی سے تو کسی کا بس نہیں۔ رونے دھونے سے ہلکان ہونے کے سوا اور کیا ہاتھ آجائے گا؟ گھر میں بھی تو بیسیوں کام ہیں۔ کوئی سادھو سنت آجائے، کوئی مہمان آپہنچے، اس کی خاطر مدارات کے لیے کسی کو تو گھر پر رہنا ہی پڑے گا۔''

بہو نے حیلے کیے پر شیو داس نے ایک نہ سنی۔

شیو داس کے باہر چلے جانے کے بعد مالکن نے کنجی اٹھالی تو اس کے دل میں اختیار اور ذمہ داری کا زبردست احساس پیدا ہوا۔تھوڑی دیر کے لیےشوہر کی جدائی کا صدمہ اس کے دل سے محو ہوگیا۔اس کی چھوٹی بہن اور دیور دونوں کام کرنے گئے ہوئے تھے۔شیو داس باہر تھا۔گھر بلکل خالی تھا۔اس وقت وہ بےفکر ہوکر بھنڈار کھول سکتی ہے۔ااس میں کیا کیا سامان،کیا کیا چیز ہے، یہ دیکھنے کے لیےاس کا دل بےتاب ہوگیا۔اس کوٹھری میں وہ کبھی نہیں آئی تھی۔جب کسی کو کچھ دینا یا کسی سے کچھ لینا ہوتا تو شیو داس آکر اس کوٹھری کو کھولتا۔پھر اسے بند کر کے کنجی اپنی کمر میں رکھ لیتا تھا۔رام پیاری کبھی کبھی کواڑ کی درازوں سے اندر جھانکتی تھی مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔سارے گھر کے لیے وہ کوٹھری ایک طلسم یا راز تھی،جس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔آج رام پیاری کو وہ راز کھول کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔اس نے باہر کا دروازہ بند کر دیا کہ اسے کوئی بنڈار کھولتے نہ دیکھ لے۔نہیں تو سوچے گا بےضرورے اس نے کیوں کھولا۔اس کا سینہ دھڑک رہا تھا کہ کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹانے لگے۔اندر پاؤں رکھا تو اسے اسی طرح کی لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی جو اسے اپنے کپڑے اور زیور کی پٹاری کے کھولنے میں ہوتی تھی مٹکوں میں گڑ،شکر، گیہوں، جو وغیرہ سب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ایک کنارے بڑے بڑے برتن رکھے ہوئے تھے،جو شادی بیاہ کے موقع پر نکالے جاتے تھے یا مانگے دیے جاتے تھے۔ایک جگہ مال گزاری کی رسیدیں اور لین دین کے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔کوٹھری پر شان وشوکت چھائی ہوئی تھی۔اسی کے سایے میں رام پیاری کوئی آدھ گھنٹے تک اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی رہی۔لمحہ بہ لمحہ اس کے دل پر نشہ طاری ہوتا گیا۔جب وہ اس کوٹھری سے نکلی تو اس کے دل کی حالت بدلی ہوئی تھی، جیسے کسی نے اس پر سحر کر دیا ہو۔

اسی وقت دروازے سے کسی آدمی نے آواز دی۔اس نے فوراً بھنڈارے کا دروازہ بند کیا اور جا کر صدر دروازہ کھول دیا۔دیکھا تو پڑوسن چھنیا کھڑی ایک روپیا قرض مانگ رہی ہے۔رام پیاری نے بےرخی سے کہا،" ابھی تو ایک پیسا بھی گھر میں نہیں ہے بہن،کام کاج میں،سب خرچ ہوگیا۔"

چھنیا حیران رہ گئی۔چودھری کے گھر میں اس وقت ایک روپیا بھی نہیں ہے۔یہ یقین کرنے کی بات نہ تھی۔جس کے یہاں سیکڑوں کا لین دین ہے،اس کا سارا اثاثہ کام کاج میں صرف نہیں ہوسکتا۔اگر شیو داس نے یہ حیلہ کیا ہوتا تو اسے تعجب نہ ہوتا۔رام پیاری تو اپنے سادہ اخلاق کے لیے گاؤں میں مشہور تھی۔اکثر شیو داس کی نگاہیں بچا کر ہمسایوں کو ضرورت کی چیزیں دے دیا کرتی تھی۔ابھی کل ہی اس نے جانکی کو سیر بھر دودھ دے دیا تھا۔یہاں تک

اپنے گہنے تک مانگے دے دیا کرتی تھی۔ بخیل شیوداس کے گھر میں ایسی سخی بہو کا آنا لوگ اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

چھنیا نے متعجب ہو کر کہا،''ایسا نہ کہو بہن، بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔ نہیں تو تم جانتی ہو کہ میری عادت قرض مانگنے کی نہیں ہے۔ لگان کا ایک روپیا دینا ہے۔ پیادہ دروازے پر کھڑا بک جھک رہا ہے۔ روپیا دے دو تو کسی طرح مصیبت ٹلے۔ میں آج کے آٹھویں روز آ کر دے جاؤں گی۔ گانو میں اور کون گھر ہے۔ جہاں مانگنے جاؤں۔''

رام پیاری ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اس کے جاتے ہی رام پیاری شام کے کھانے کا انتظام کرنے لگی۔ پہلے چاول، دال چننا وبال معلوم ہوتا تھا اور رسوئی میں جانا سولی پر چڑھنے سے کم نہ تھا۔ کچھ دیر دونوں بہنوں میں جھوڑ ہوتی، آخر میں شیوداس آ کر کہتا کہ آج کیا کھانا نہ پکے گا؟ اس وقت دونوں میں سے ایک اٹھتی اور موٹے موٹے ٹکڑ پکا کر رکھ دیتی۔ جیسے بیلوں کا راتب ہو۔ آج رام پیاری تن من سے کھانا پکانے کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ اب وہ گھر کی مالکن ہے۔

اس نے باہر نکل کر دیکھا کتنا کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے۔ بڈھے دادا دن بھر مکھی مارا کرتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ذرا جھاڑو ہی دے ڈالیں اب کیا ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ دروازہ ایسا صاف ہونا چاہیے کہ دیکھ کر دل خوش ہو جائے۔ یہ نہیں کہ اُبکائی آنے لگے، ابھی کہہ دوں تو تنک اٹھیں۔ اچھا! یہ منی ناند سے الگ کیوں کھڑی ہے۔

اس نے منی گائے کے پاس جا کر ناند میں جھانکا، بدبو آ رہی تھی۔ ٹھیک ہے۔ معلوم ہوتا ہے مہینوں سے پانی نہیں بدلا گیا ہے۔ اس طرح تو گائے رہ چکی۔ اپنا پیٹ بھر لیا، چھٹی ہوئی اور کسی سے کیا مطلب؟ ہاں دودھ سب کو اچھا لگتا ہے۔ دادا دروازے پر بیٹھے چلم پی رہے ہیں مگر اتنا نہیں ہوتا کہ چار گھڑے پانی ناند میں ڈال دیں۔ مزدور رکھا ہے وہ بھی تین کوڑی ہے۔ کھانے کو ڈیڑھ سیر، کام کرتے نانی مرتی ہے۔ آئے تو پوچھتی ہوں ناند میں پانی کیوں نہیں بدلتا؟ رہنا ہو رہے یا جائے، آدمی بہت ملیں گے۔ چاروں طرف تو لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں۔

آخر اس سے نہ رہا گیا۔ گھڑا اٹھا کر پانی لینے چلی۔

شیوداس نے پکارا،''پانی کیا ہوگا بہو؟ ناند میں پانی بھرا ہوا ہے۔''

پیاری نے کہا،''ناند کا پانی سڑ گیا ہے۔ منی بھوسے میں منہ نہیں ڈالتی۔ دیکھتے ہو کوس بھر کھڑی ہے۔''

شیوداس مسکرایا۔ دوڑ کر بہو کے ہاتھ سے گھڑا لے لیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ پیاری کے اختیار میں آکر جیسے اس گھر میں بہار آ گئی۔ اندر باہر جہاں دیکھیے ایک لائق منتظم کی سلیقہ شعاری، صفائی پسندی اور خوش مذاقی کے آثار نظر آنے لگے۔ پیاری نے گرہستی کی مشین کی ایسی کنجی کس دی کہ سب ہی پرزے ٹھیک ٹھیک چلنے لگے۔ کھانا پہلے سے اچھا ملتا ہے اور وقت پر ملتا ہے۔ دودھ زیادہ ہوتا ہے، گھی زیادہ ہوتا ہے۔ پیاری نہ خود آرام کرتی ہے نہ دوسروں کو آرام کرنے دیتی ہے۔ گھر میں کچھ ایسی برکت آ گئی ہے کہ جو چیز مانگو گھر ہی میں نکل آتی ہے۔ آدمی سے لے کر جانور تک سب ہی تندرست نظر آتے ہیں۔ اب وہ پہلی سی حالت نہیں ہے کہ کوئی چیتھڑے لپیٹے پھر رہا ہے، کسی کو گہنے کی دھن سوار ہے۔ ہاں اگر کوئی متردد وفکر منداور پریشان ہے تو وہ پیاری ہے۔ پھر بھی سارا گھر اس سے جلتا ہے۔ یہاں تک کہ بوڑھے شیو داس بھی کبھی کبھی اس کی بدگوئی کرتے ہیں۔ کسی کو پہر رات گئے اٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ محنت سے سب جی چراتے ہیں، پھر بھی اتنا سب ہی مانتے ہیں کہ پیاری نہ ہوتو گھر کا کام نہ چلے اور تو اور اب دونوں بہنوں میں اتنا میل نہیں ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ دلاری نے ہاتھوں کے کڑے لا کر پیاری کے سامنے پٹک دیے اور بگڑ کر بولی، ''لے کڑے بھی بھنڈار میں بند کر دے۔''

پیارے نے کڑے اٹھا لیے اور نرم لہجے میں کہا، ''کہہ تو دیا، ہاتھ میں روپے آنے دے بنوا دوں گی۔ ابھی تو ایسے گھِس نہیں گئے ہیں کہ آج ہی اتار پھینک دیے جائیں۔''

دلاری لڑنے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ بولی، ''تیرے ہاتھ میں کاہے کو کبھی روپے آئیں گے اور کاہے کو کڑے بنیں گے۔ جوڑ جوڑ رکھنے میں مزہ آتا ہے۔''

پیاری نے ہنس کر کہا، ''جوڑ رکھتی ہوں تو تیرے ہی لیے یا میرے کوئی اور بیٹھا ہوا ہے یا میں سب سے زیادہ کھا پہن لیتی ہوں۔ میرا بازوبند کب کا ٹوٹا پڑا ہے۔''

دلاری، ''تم نہ کھاؤ پہنو، نیک نامی تو ہوتی ہے تمھاری۔ یہاں کھانے اور پہننے کے سوا اور کیا ہے؟ میں تمھارا حساب کتاب نہیں جانتی۔ میرے کڑے آج بننے کو بھیج دو۔''

پیاری نے بالکل مذاق کے انداز میں پوچھا، ''روپے نہ ہوں تو کہاں سے لاؤں؟''

دلاری نے چیخ کر کہا، ''مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ میں تو کڑے چاہتی ہوں۔''

اسی طرح گھر کے سبھی آدمی اپنے اپنے موقع پر پیاری کو دو چار سخت وسست سنا جاتے تھے اور وہ غریب سب کی دھونس ہنس کر برداشت کر لیتی تھی۔ مالکن کا تو یہ فرض ہے کہ سب کی دھونس برداشت کر لے اور کرے وہی جس میں گھر کی

بھلائی ہو۔ مالکانہ ذمہ داری کے احساس پر طعن وطنز اور دھمکی کسی چیز کا اثر نہ ہوتا۔ اس کا مالکانہ احساس ان حملوں سے اور بھی قوی ہو جاتا تھا۔ وہ گھر کی منتظمہ ہے۔ سبھی اپنی اپنی تکلیف اسی کے سامنے پیش کرتے ہیں، جو کچھ وہ کرتی ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا۔ گاؤں میں پیاری کی تعریف ہوتی تھی۔ ابھی عمر ہی کیا ہے۔ لیکن تمام گھر کو سنبھالے ہوئے ہے۔ چاہتی تو دوسرا گھر کر کے چین کرتی۔ اس گھر کے واسطے اپنے کو مٹا رہی ہے۔ کبھی کسی سے ہنستی بولتی بھی نہیں۔ جیسے کایا پلٹ ہوگئی۔

چند روز بعد دلاری کے کڑے بن کر آ گئے۔ پیاری خود سنار کے گھر دوڑ دوڑ گئی۔ شام ہوگئی تھی۔ دلاری اور متھرا دونوں کھیت سے لوٹے۔ پیاری نے نئے کڑے دلاری کو دیے۔ دلاری نہال ہوگئی۔ چٹ پٹ کڑے پہنے اور دوڑی ہوئی جا کر کوٹھری میں متھرا کو کڑے دکھانے لگی۔ پیاری کوٹھری کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر یہ منظر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ دلاری اس سے کل تین ہی سال تو چھوٹی ہے، لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اس کی نظریں گویا اس منظر پر جم گئیں۔ متاہلانہ زندگی کی وہ حقیقی مسرت، ان کی وہ محبت آگیں محویت، ان کی وہ سرخوشی!

پیاری کی ٹکٹکی سی بندھ گئی۔ یہاں تک کہ چراغ کی دھندلی روشنی میں وہ دونوں اس کی نظر سے غائب ہو گئے۔ اسے اپنے گذشتہ زندگی کا ایک ایک واقعہ نگاہوں کے سامنے بار بار نئی صورت میں سامنے آنے لگا۔ ناگہاں شیوداس نے پکارا، ''بڑی بہو ایک پیسا دو، تمبا کو منگاؤں۔''

پیاری کا سلسلہ تصور شکست ہوگیا۔ آنسو پونچھتی ہوئی بھنڈار میں پیسا لینے چلی گئی۔

(۴)

ایک ایک کر کے پیاری کے گہنے اس کے ہاتھ سے نکلتے جاتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا گھر گانو میں سب سے خوش حال سمجھا جائے اور اسی کو اس ہوس کی قیمت دینا پڑتی تھی۔ کبھی مکان کی مرمت کے لیے، کبھی بیلوں کی نئی جوڑی خریدنے کے لیے روپے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور جب بہت توڑ جوڑ کرنے پر بھی کام نہ چلتا تو وہ اپنی کوئی نہ کوئی چیز نکال دیتی اور وہ چیز ایک بار ہاتھ سے نکل کر پھر واپس نہ آتی۔ وہ چاہتی تو ان سے بہت سے خرچوں کو ٹال جاتی لیکن جہاں عزت کی بات آ پڑتی وہ دل کھول کر خرچ کرتی تھی۔ اگر گاؤں میں ہیٹی ہوگئی تو کیا بات رہی، اسی کی تو بدنامی ہوگی! دلاری کے پاس بھی گہنے تھے، ایک دو چیزیں متھرا کے پاس بھی تھیں، لیکن پیاری ان کی چیزیں نہ چھوتی۔ ان کے کھانے پہننے کے دن ہیں، وہ اس جھگڑے میں کیوں پھنسیں۔ دلاری کے لڑکا پیدا ہوا تو

پیاری نے دھوم دھام کے ساتھ خوشی منانے کا ارادہ کیا۔

شیوداس نے مخالفت کی، ''کیا فائدہ؟ جب بھگوان کی کرپا سے بیاہ بارات کا موقع آئے گا تو دھوم دھام کر لینا۔''

پیاری کا حوصلہ مند دل بھلا کیوں مانتا؟ بولی، ''کیسی بات کرتے ہو دادا! پہلونٹی کے لڑکے کے لیے بھی دھوم دھام نہ ہوئی تو کب ہوگی؟ دل تو نہیں مانتا پر دنیا کیا کہے گی؟ نام بڑے درشن تھوڑے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانتی، اپنا تمام سامان کر لوں گی۔''

''گہنے کے سر جائے گی اور کیا؟'' شیوداس نے فکر مند ہو کر، ''اس طرح ایک روز تار بھی نہ بچے گا۔ کتنا سمجھایا بیٹا! بھائی بھاوج کسی کے نہیں ہوتے۔ اپنے پاس دو چیزیں رہیں گی تو سب منہ تکیں گے۔ نہیں تو کوئی سیدھے منہ بات بھی نہ کرے گا۔''

پیاری نے ایسا منہ بنایا گویا وہ ایسی بوڑھی باتیں بہت سن چکی ہے۔ بولی ''جو اپنے ہیں وہ اپنے ہیں۔ وہ بات بھی نہ پوچھیں جب بھی اپنے ہی رہتے ہیں۔ میرا دھرم میرے ساتھ ہے، ان کا دھرم ان کے ساتھ ہے۔ مر جاؤں گی تو کیا سینے پر لاد کے لے جاؤں گی۔''

دھوم دھام سے لڑکا پیدا ہونے کی خوشی منائی گئی۔ برھی کے روز ساری برادری کا کھانا ہوا۔ لوگ کھا پی کر چلے گئے تو پیاری دن بھر کی تھکی ماندی آنگن میں ٹاٹ کا ایک ٹکڑا ڈال کر کمر سیدھی کرنے لگی۔ آنکھ لگ گئی۔ متھرا اسی وقت گھر میں آیا۔ نومولود بچے کو دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ دلاری زچّہ خانے سے نکل چکی تھی۔ حمل کی حالت میں اس کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ چہرہ بھی اتر گیا تھا۔ لیکن آج چہرے پر صحت کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ مادرانہ غرور و ناز نے اعضا میں ایک نئی روح پیدا کر دی تھی۔ زچّہ خانے کی احتیاطی اور مقوی چیزوں کے استعمال نے بدن کو چکنا دیا تھا۔ متھرا اسے آنگن میں دیکھتے ہی قریب آ گیا اور ایک بار پیاری کی طرف دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ وہ سو گئی ہے، بچے کو گود میں لے لیا اور لگا اس کا منہ چومنے۔

آہٹ پا کر پیاری کی آنکھ کھل گئی لیکن نیند کے بہانے وہ نیم باز آنکھوں سے یہ پر لطف تماشا دیکھنے لگی۔ ماں اور باپ دونوں باری باری سے بچے کو چومتے اور گلے لگاتے اور اور اس کے منہ کو تکتے تھے۔ کیسی پُر کیف مسرت تھی۔ پیاری کی تشنہ تمنا ایک آن کے لیے مالکانہ حیثیت کو بھول گئی۔ جس طرح لگام سے منہ بند، بوجھ سے لدا ہوا، ہانکنے والے کے کوڑے سے تکلیف زدہ، دوڑتے دوڑتے بے دم گھوڑا ہنہناہٹ سے اس کا جواب دیتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی پیاری کی حالت ہو گئی۔ اس کی مادریت جو پنجرے میں بند خاموش، بے جان پڑی ہوئی تھی، قریب سے گزرنے والی مادریت کی چہکار سے بیدار ہو گئی اور تفکرات کے اس پنجرے سے نکلنے کے لیے بازو پھڑ پھڑانے لگی۔

متھرا نے کہا، ''یہ میرا لڑکا ہے۔''

دلاری نے بچے کو سینے سے چمٹا کر کہا، ''ہاں، ہے کیوں نہیں۔تم ہی نے تو نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے۔ مصیبت تو میں نے بھگتی ہے، باپ کہلانے کے لیے تم آ گئے۔''

متھرا، ''میرا لڑکا نہ ہوتا تو میری صورت کا کیوں ہوتا؟ صورت وشکل سب میری سی ہے کہ نہیں۔''

دلاری، ''اس سے کیا ہوتا ہے۔بیج بنیے کے گھر سے آتا ہے، کھیت کسان کا ہوتا ہے۔ پیداوار بنیے کی نہیں ہوتی۔کسان کی ہوتی ہے۔''

متھرا، ''باتوں میں تم سے کوئی نہ جیتے گا۔میرا لڑکا بڑا ہو جائے گا تو میں دروازے پر بیٹھ کر مزے سے حقہ پیا کروں گا۔''

دلاری، ''میرا لڑکا پڑھے لکھے گا۔کوئی عہدہ حاصل کرے گا۔تمھاری طرح دن بھر بیل کے پیچھے نہ چلے گا۔ مالکن سے کہنا ہے کل ایک جھولا بنوا دیں۔''

متھرا، ''اب بہت سویرے نہ اٹھا کرنا اور کلیجہ پھاڑ کر کام بھی نہ کرنا۔''

دلاری، ''یہ مہارانی جینے دی گی۔''

متھرا، ''مجھے تو اس بے چاری پر ترس آتا ہے۔اس کے کون بیٹھا ہے۔ہمیں لوگوں کے لیے تو مرتی ہے۔ بھیا ہوتے تو اب تک دو تین لڑکوں کی ماں ہو گئی ہوتی۔''

پیاری کے گلے میں آنسوؤں کا ایک ایسا سیلاب امڈا کہ اس کے روکنے میں اس کا تمام جسم کانپ اٹھا۔ اس کی بیوگی کا سونا پن کسی خوف ناک جانور کی طرح اسے نگلنے لگا۔تصور اس بنجر زمین میں ہرا بھرا باغ لگانے لگا۔ یکا یک شیوداس نے اندر آ کر کہا، ''بڑی بہو، کیا سو گئی۔باجے والوں کو ابھی کھانے کو نہیں ملا۔کیا کہہ دوں؟''

(۵)

کچھ دنوں بعد شیوداس بھی مر گیا۔ادھر دلاری کے دو بچے ہوئے۔وہ بھی زیادہ تر بچوں کی پرورش و پرداخت میں رہنے لگی۔کھیتی کا کام مزدوروں پر آ پڑا۔متھا مزدور تو اچھا تھا مگر منتظم اچھا نہ تھا۔اسے آزادانہ طور پر کام لینے کا موقع نہ ملا تھا۔خود پہلے بھائی کی نگرانی میں کام کرتا رہا۔بعد کو باپ کی نگرانی میں کام کرنے لگا۔کھیتی کا انداز بھی نہیں جانتا تھا۔وہی مزدور اس کے یہاں ٹکتے تھے جو محنتی نہیں۔خوشامد کرنے میں ہوشیار ہوتے تھے، اس لیے اب پیاری کو دو چار چکر کھیت کے بھی لگانے پڑتے تھے۔کہنے کو تو وہ اب بھی مالکن تھی مگر حقیقت میں گھر بھر کی خدمت

گذار تھی۔ مزدور بھی اس سے تیوریاں بدلتے۔ زمین دار کا پیادہ بھی اس پر دھونس جماتا، کھانے میں بھی کفایت کرنی پڑتی۔ لڑکوں کو جتنی بار مانگیں کچھ نہ کچھ چاہیے۔ دلاری بچوں والی تھی، اسے بھی پوری خوراک چاہیے۔ متھرا گھر کا سردار تھا۔ اس حق کو اس سے کون چھین سکتا۔ مزدور بھلا کیوں رعایت کرنے لگے۔ ساری کسر بیچاری پیاری پر نکلتی تھی۔ اس کی ایک ذات فاضل تھی۔ آدھا ہی پیٹ کھائے جب بھی کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوسکتا تھا۔ تیس برس کی عمر میں اس کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر جھک گئی، آنکھوں کی روشنی کم ہوگئی۔ مگر وہ خوش تھی۔ مالک ہونے کا احساس ان تمام زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔

ایک روز متھرا نے کہا، ''بھابی، اب تو کہیں پردیس جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں تو کمائی میں کوئی برکت نہیں۔ کسی طرح پیٹ کی روٹیاں چلی جاتی ہی، وہ بھی رو دھو کر۔ کئی آدمی پورب سے آئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہاں دو تین روپے روز کی مزدوری ہوتی ہے۔ چار پانچ سال بھی رہ گیا تو مالا مال ہو جاؤں گا۔ اب لڑکے بالے ہوئے، ان کے لیے تو کچھ کرنا ہی چاہیے۔''

دلاری نے تائید کی، ''ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے، لڑکوں کو پڑھائیں گے لکھائیں گے۔ ہماری تو کسی طرح کٹ گئی، لڑکوں کو تو آدمی بنانا ہے۔''

پیاری یہ سن کر حیران رہ گئی۔ ان کا منہ تکنے لگی۔ اس سے پہلے اس طرح کی بات چیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ انھیں یہ دھن کیسے سوار ہوگئی۔ اسے شک ہوا کہ شاید میری وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔

بولی، ''تو میں تو جانے کو نہ کہوں گی۔ آگے تمھاری جیسی خوشی ہو۔ لڑکوں کے پڑھانے لکھانے کے لیے یہاں بھی اسکول ہیں۔ پھر کیا ہمیشہ ہی ایسا وقت رہے گا۔ دو تین سال میں کھیتی بن گئی تو سب کچھ ہو جائے گا۔''

متھرا، ''اتنے روز کھیتی کرتے ہو گئے۔ جب اب تک نہ بنی تو اب کیا بن جائے گی۔ اسی طرح ایک روز چل دیں گے۔ دل کی دل میں رہ جائے گی۔ پھر اب ہاتھ پانو بھی تو تھک رہے ہیں۔ یہ کھیتی کون سنبھالے گا۔ لڑکوں کو اس چکی میں جوت کر ان کی زندگی خراب کرنی نہیں چاہتا۔

پیاری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا، ''بھیا، گھر پر جب تک آدھی ملے ساری کے لیے نہ دوڑنا چاہیے۔ اگر میری طرف سے کوئی بات ہو تو اپنا گھر بار اپنے ہاتھ میں لے لو۔ مجھے ایک ٹکڑا دے دینا۔ پڑی رہوں گی۔''

متھرا گلو گیر آواز سے بولا، ''بھابی، یہ تم کیا کہتی ہو۔ تمھارے ہی سنبھالے یہ گھر اب تک سنبھالا ہے نہیں تو ختم ہو چکا ہوتا۔ اس گرہستی کے پیچھے تم نے اپنے کو مٹی میں ملا دیا۔ اپنا جسم تک گھلا ڈالا۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں۔ ہم لوگوں کو جانے دو۔ بھگوان نے چاہا تو گھر پھر سنبھل جائے گا۔ تمھارے لیے ہم برابر خرچ بھیجتے

رہیں گے۔''

پیاری نے کہا،''اگر ایسا ہی ہے تو تم چلے جاؤ۔ہاں بچوں کو کہاں کہاں باندھے پھرو گے؟''

دلاری بولی،''یہ کیسے ہوسکتا ہے بہن۔یہاں دیہات میں لڑکے کیا پڑھیں لکھیں گے۔بچوں کے بغیر وہاں ان کا جی بھی نہ لگے گا۔دوڑ دوڑ کر گھر آئیں گے اور ساری کمائی ریل کھا جائے گی۔پردیس میں اکیلے جتنا خرچ ہوگا اتنے میں سارا گھر آرام سے رہے گا۔''

پیاری بولی،''تو میں ہی یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ مجھے بھی لیتے چلو۔''

دلاری اسے ساتھ لے چلنے کو تیار نہ تھی۔کچھ روز زندگی کا لطف اٹھانا چاہتی تھی۔اگر پردیس میں بھی یہی ضابطہ رہا تو جانے سے فائدہ ہی کیا؟ بولی،''بہن،تو چلتی تو کیا بات تھی۔پھر یہاں تو سارا کاروبار چوپٹ ہوجائے گا۔تم تو کچھ نہ کچھ دیکھ بھال کرتی ہی رہو گی۔''

روانگی کی تاریخ سے ایک روز پہلے ہی رام پیاری نے رات بھر جاگ کر حلوا پوری پکائی۔جب سے اس گھر میں آئی کبھی تو ایک روز کے لیے بھی تنہا رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔دونوں بہنیں ہمیشہ ساتھ رہیں۔آج اس ہولناک موقع کو سامنے آتے دیکھ کر پیاری کا دل بیٹھا جاتا تھا۔وہ دیکھتی تھی کہ متھرا خوش ہے۔لڑکے باہر جانے کی خوشی میں کھانا پینا بھولے ہوئے ہیں،تو اس کے جی میں آتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح بے غم رہے،محبت و ہمدردی کو پیروں سے کچل ڈالے،لیکن وہ محبت جس غذا کو کھا کر پلی تھی اسے سامنے سے ہٹتے جاتے دیکھ کر بے قرار ہونے سے نہ روک سکی۔دلاری تو اس طرح بے فکر بیٹھی تھی جیسے کوئی میلا دکھانے جارہی تھی۔نئی چیزوں کے دیکھنے،نئی دنیا کی سیر کرنے کے شوق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔پیاری کے سر انتظام کا بار تھا۔دھوبی کے گھر سے سب کپڑے آئے ہیں یا نہیں۔کون کون سے برتن ساتھ جائیں گے۔سفر خرچ کے لیے کتنے روپے کی ضرورت ہوگی۔ایک بچے کو کھانسی آرہی تھی، دوسرے کو کئی روز سے دست آرہے تھے۔ان دونوں کی دوؤاں کوکوٹنا پیسنا وغیرہ سیکڑوں کام اسے مصروف کیے ہوئے تھے۔لاولد ہوکر بھی وہ بچوں کی دات و پرداخت میں دلاری سے ہوشیار تھی۔''دیکھو،بچوں کو زیادہ مارنا پیٹنا مت۔مارنے سے بچے ضدی اور بے حیا ہوجاتے ہیں۔بچوں کے ساتھ آدمی کو بچہ بن جانا پڑتا ہے۔کبھی ان کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے،کبھی ہنسنا پڑتا ہے۔اگر تم چاہو کہ ہم آرام سے پڑے رہیں اور بچے چپ بیٹھے رہیں، ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں تو یہ نہیں ہوسکتا۔بچے تو طبیعت کے تیز ہوتے ہیں۔انھیں کسی نہ کسی کام میں پھنسائے رکھو۔دھیلے کا ایک کھلونا ہزار گھڑکیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔''

دلاری ان ہدایتوں کو اس بے توجہی سے سن رہی تھی گویا کوئی پاگل بک رہا ہو۔

رخصت کا روز پیاری کے لیے امتحان کا دن تھا۔ اس کے جی میں آتا تھا کہ کہیں چلی جائے تا کہ وہ منظر نہ دیکھنا پڑے۔ ہائے گھڑی بھر میں یہ گھر سونا ہو جائے گا۔ وہ دن بھر گھر میں تنہا پڑی رہے گی۔ کس سے ہنسے گی، کس سے بولے گی؟ یہ سوچ کر اس کا دل لرز جاتا۔ جوں جوں وقت قریب آتا تھا اس کے ضواس معطل ہوتے جاتے تھے۔ وہ کام کرتے کرتے جیسے کھو جاتی تھی اور ٹکٹکی باندھ کر کسی چیز کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ کبھی موقع پا کر تنہائی میں جا کر تھوڑا سا رو لیتی تھی۔ دل کو سمجھا رہی تھی کہ یہ لوگ اپنے ہوتے تو کیا اس طرح جاتے۔ یہ مانا کہ ناتا ہے مگر کسی پر کوئی زور تو نہیں۔ دوسروں کے لیے کتنا ہی مرو پھر بھی اپنے نہیں ہوتے۔ پانی تیل میں کتنا ہی ملے، پھر بھی الگ ہی رہے گا۔ بچے نئے نئے کپڑے پہنے نواب بنے گھوم رہے تھے۔ پیاری انھیں پیار کرنے کے لیے گود میں لینا چاہتی تھی تو رونے کا سا منہ بنا کر ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتے۔ وہ کیا جانتی تھی کہ ایسے موقع پر اکثر بچے بھی ایسے ہی بے مروّت ہو جاتے ہیں۔ دس بجتے بجتے دروازے پر بیل گاڑی آ گئی۔ لڑکے پہلے ہی سے اس پر جا بیٹھے۔ گانو کے کتنے ہی مرد عورتیں ملنے آئیں۔ پیاری کو اس وقت ان کا آنا برا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دلاری سے تھوڑی دیر تنہائی میں گلے مل رونا چاہتی تھی۔ متھرا سے ہاتھ جوڑ کر کہنا چاہتی تھی کہ میری کھوج خبر لیتے رہنا، تمھارے سوا اب دنیا میں میرا کون ہے؟ لیکن گڑ بڑ میں اسے ان باتوں کا موقع نہ ملا۔ متھرا اور دلاری دونوں گاڑیوں میں جا بیٹھے اور پیاری دروازے پر کھڑی روتی رہ گئی۔ وہ اتنی حواس باختہ تھی کہ گانو کے باہر تک پہنچانے کا بھی ہوش نہ رہا۔

(٦)

کئی روز تک پیاری بے ہوش سی پڑی رہی۔ نہ گھر سے نکلی، نہ چولھا جلایا، نہ ہاتھ منہ دھویا۔ اس کا ہلوایا جوکھو بار بار آ کر کہتا، ''مالکن اٹھو، منہ ہاتھ دھوؤ۔ کچھ کھاؤ پیو۔ کب تک اس طرح پڑی رہو گی؟''

اس طرح کی تسلی گاؤں کی اور عورتیں بھی دیتی تھیں لیکن ان کی تسلی میں ایک قسم کے بغض کا انداز پایا جاتا تھا اور جوکھو کی آواز میں سچی ہمدردی جھلکتی تھی۔ جوکھو کام چور، باتونی اور نشہ باز تھا۔ پیاری اسے برابر ڈانٹتی رہتی تھی۔ دو ایک بار اسے نکال بھی چکی تھی مگر متھرا کی سفارش سے پھر رکھ لیا تھا۔ آج بھی جوکھو کی ہمدردی بھری باتیں سن کر جھنجلائی۔ یہ کام کرنے کیوں نہیں جاتا۔ یہاں میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔ مگر اسے جھڑکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت اسے ہمدردی کی ضرورت تھی۔ پھل کانٹے دار درخت میں بھی ملیں تو کیا انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ طبیعت بہلنے لگی۔ زندگی کا کاروبار جاری ہوا۔ اب کھیتی کا سارا بار پیاری پر تھا۔ لوگوں نے رائے دی کہ ایک ہل توڑ دو اور کھیتوں کو اٹھا دو۔ لیکن پیاری کی وضع داری یوں ڈھول پیٹ کر اپنی شکست قبول نہ کر سکتی تھی۔

تمام کام سابق کی طرح چلنے لگے۔ ادھر متھرا کے خط و کتابت نہ کرنے سے اس کے جذبات کو اور اشتعال ہوا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے بھروسے بیٹھی ہوں۔ یہاں اس کے کھلانے کا بھی دعوا رکھتی ہوں۔ اس کے بھیجنے سے مجھے کوئی خزانہ مل جاتا۔ اسے اگر میری فکر نہیں ہے تو میں اسکی کب پروا کرتی ہوں۔ گھر میں تو اب کوئی زیادہ کام رہا نہیں۔ پیاری تمام دن کھیتی باڑی کے کاموں میں لگی رہتی۔ خربوزے بوئے تھے۔ وہ خوب پھلے اور خوب بکے۔ پہلے سب دودھ گھر میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اب بکنے لگا۔ پیاری کے خیالات میں بھی ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ اب صاف ستھرے کپڑے پہنتی، مانگ چوٹی کی طرف سے بھی اتنی بے توجہ نہ تھی۔ زیوروں کا بھی شوق ہوا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی اس نے اپنے گروی گہنے چھڑائے اور کھانے میں بھی احتیاط کرنے لگی۔ تالاب پہلے کھیتوں کو سیراب کر کے خود خالی ہو جاتا تھا۔ اب نکاس کی نالیاں بند ہو گئی تھیں۔ تالاب میں پانی جمع ہونے لگا۔ اس میں ہلکی ہلکی لہریں بھی تھیں، کھلے ہوئے کمل بھی تھے۔ ایک روز جوکھو کنویں سے لوٹا تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ پیاری نے پوچھا: ''اب تک وہاں کیا کرتا رہا؟''

جوکھو نے کہا، ''چار کیاریاں بچ رہی تھیں، میں نے سوچا دس موٹ اور کھینچ دوں۔ کل کا جھنجھٹ کون رکھے۔''

جوکھو اب کچھ دنوں سے کام میں جی لگانے لگا تھا۔ جب تک مالک اس کے سر پر سوار رہتے تھے وہ حیلے بہانے کرتا تھا۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ پیاری سارے دن کنویں پر تھوڑے ہی رہ سکتی تھی، اس لیے اب اس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا۔ پیاری نے پانی کا لوٹا رکھتے ہوئے کہا: ''اچھا ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ آدمی جان رکھ کر کام کرتا ہے۔ ہائے ہائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کھیت آج نہ ہوتے کل ہوتے۔ کیا جلدی تھی؟''

جوکھو نے سمجھا پیاری بگڑ رہی ہے۔ اس نے تو اپنی سمجھ میں کارگذاری کی تھی اور وہ سمجھا تھا تعریف ہوگی۔ یہاں اعتراض ہوا۔ چڑ کر بولا، ''مالکن تم داہنے بائیں دونوں طرف چلتی ہو۔ جو بات نہیں سمجھتی ہو اس میں کیوں کودتی ہو؟ کل کے لیے تو اونچے کے کھیت پڑے سوکھ رہے ہیں۔ آج بڑی مشکل سے کنواں خالی ہوا ہے۔ سویرے میں نہیں پہنچتا تو کوئی اور آ کر ڈٹ جاتا۔ پھر ہفتہ بھر تک راہ دیکھنی پڑتی۔ تب تک تو سب اوکھ بدا ہو جاتی۔''

پیاری اس کی سادگی پر ہنس کر بولی، ''ارے تو میں تجھے کچھ کہہ تھوڑی ہی رہی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں کہ جان رکھ کر کام کر کہیں بیمار پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

جوکھو: ''کون بیمار پڑ جائے گا؟ بیس برس سے کبھی سر تک تو نہیں دکھا۔ آئندہ کی نہیں جانتا۔ کہو رات بھر کام کرتا رہوں۔''

پیاری: ''میں کیا جانوں۔ تمھیں آئے دن بیٹھے رہتے تھے اور پوچھا جاتا تو کہتے تھے کہ بخار آ گیا تھا۔ پیٹ میں

درد تھا۔‘‘

جوکھو جھینپتا ہوا بولا،’’ وہ باتیں جب تھیں جب مالک لوگ چاہتے تھے اسے پیس ڈالیں۔ اب تو جانتا ہوں میرے ہی سر ہے۔ میں نہ کروں گا تو چوپٹ ہو جائے گا۔‘‘

پیاری،’’میں کیا دیکھ بھال نہیں کرتی؟‘‘

جوکھو،’’تم بہت کروگی تو دو وقت چلی جاؤ گی۔ تمام دن تم وہاں بیٹھی تو نہیں رہ سکتیں۔‘‘

پیاری کو اس کی اخلاص بھری باتوں نے فریفتہ کر لیا۔ بولی،’’اتنی رات گئے چولھا جلاؤ گے۔ بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟‘‘

جوکھو نے منہ دھوتے ہوئے کہا،’’تم بھی خوب کہتی ہو مالکن! اپنے پیٹ بھر کو تو ہوتا نہیں، بیاہ کر لوں۔ سوا سیر کھاتا ہوں۔ ایک وقت پورا سوا سیر دونوں وقت کے لیے ڈھائی سیر چاہیے۔‘‘

پیاری،’’اچھا آج میری رسوئی میں کھاؤ۔ دیکھوں کتنا کھاتے ہو؟‘‘

جوکھو نے گلوگیر آواز میں کہا،’’نہیں مالکن! تم پکاتے پکاتے تھک جاؤ گی۔ ہاں آدھ سیر کی دو روٹیاں پکا دو تو کھا لوں۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ بس آٹا گوندھ کر دو روٹ بنا لیتا ہوں اور اوپر سے سینک لیتا ہوں۔ کبھی پیٹھے سے، کبھی پیاز سے کھا لیتا ہوں اور آکر پڑ رہتا ہوں۔‘‘

پیاری،’’میں تمھیں آج پھلکے کھلاؤں گی۔‘‘

جوکھو،’’تب تو ساری رات کھاتے ہی گزر جائے گی۔‘‘

پیاری،’’بکو مت، جلد آکر بیٹھ جاؤ۔‘‘

جوکھو،’’ذرا بیلوں کو چارہ پانی دیتا آؤں تو بیٹھوں۔‘‘

(۷)

جوکھو اور پیاری میں ٹھنی ہوئی تھی۔

پیاری نے کہا،’’میں کہتی ہوں کہ دھان روپے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جھڑی لگ جائے تو کھیت ڈوب جائے۔ بارش رک جائے تو کھیت سوکھ جائے۔ جوار، باجرا، ارہر تو ہیں، دھان نہ سہی۔‘‘

جوکھو نے اپنے کندھے پر پھاوڑا رکھتے ہوئے کہا،’’جب سب کا ہوگا تو میرا بھی ہوگا، سب کا ڈوب جائے گا تو میرا بھی ڈوب جائے گا۔ میں کیوں کسی سے پیچھے رہوں؟ بابا کے زمانے میں پانچ بیگھے سے کم نہیں روپا جاتا تھا۔ برجو بھیا

نے اس میں ایک دو بیگھے اور بڑھا دیے۔ متھرا نے بھی ہر سال تھوڑے بہت روپے۔ تو کیا میں سب سے گیا گزرا ہوں۔ میں پانچ بیگھے سے کم نہ لگاؤں گا۔''

''تب گھر کے دو جوان کام کرنے والے تھے۔''

''میں تنہا ان دونوں کے برابر کھاتا ہوں۔ دونوں کے برابر کام کیوں نہ کروں گا؟''

''چل جھوٹا کہیں کا۔ کہتا تھا دو سیر کھاتا ہوں۔ چار سیر کھاتا ہوں۔ آدھ سیر میں ہی رہ گیا۔''

''کسی روز تولو تو معلوم ہو۔''

''تولا ہے، بڑے کھانے والے! میں کہے دیتی ہوں دھان نہ روپو، مزدور ملیں گے نہیں، تمھیں ہلکان ہونا پڑے گا۔''

''تمھاری بلا سے میں ہلکان ہوں گا نا! یہ بدن کا روز کام آئے گا؟''

پیاری نے اس کے کندھے سے پھاوڑا لے لیا اور بولی، ''پہر رات سے پہر رات تک تال میں رہو گے نہ، میرا دل گھبرائے گا۔''

جوکھو کو دل کے گھبرانے کا تجربہ نہ تھا۔ کوئی کام نہ ہو تو آدمی پڑ کر سو رہے، دل کیوں گھبرائے گا۔ بولا، ''جی گھبرائے تو سو رہنا۔ میں گھر رہوں گا تب تو اور جی گھبرائے گا۔ میں بیکار بیٹھتا ہوں تب مجھے بار بار کھانے کی سوجھتی ہے۔ باتوں میں دیر ہو رہی ہے۔ اور بادل گھرے آتے ہیں۔''

پیاری نے کہا، ''اچھا کل جانا۔ آج بیٹھو۔''

جوکھو نے گویا مجبور ہو کر کہا، ''اچھا بیٹھ گیا۔ کہو کیا کہتی ہو؟''

پیاری نے تمسخر کے انداز سے پوچھا، ''کہنا کیا ہے، میں تم سے پوچھتی ہوں اپنا بیاہ کیوں نہیں کر ڈالتے۔ میں اکیلی مرا کرتی ہوں۔ تب ایک سے دو تو ہو جائیں گے۔''

جوکھو شرماتا ہوا بولا، ''تم نے پھر وہی بات چھیڑ دی مالکن! کس سے بیاہ کروں؟ میں ایسی جورو لے کر کیا کروں جو گہنے کے لیے جان کھاتی رہے۔''

پیاری، ''یہ تو تم نے بڑی کڑی شرط لگائی۔ ایسی عورت کہاں ملیں گی جو گہنا نہ چاہتی ہو۔''

جوکھو، ''یہ میں تھوڑا ہی کہتا ہوں کہ گہنا نہ مانگے۔ ہاں میری جان نہ کھائے۔ تم نے تو کبھی گہنے کے لیے ضد نہیں کی، بلکہ اپنے گہنے دوسروں کو دے دیے۔''

پیاری کے رخسار پر ہلکا سا رنگ آ گیا، بولی، ''اچھا اور کیا چاہتے ہو؟''

جوکھو، ’’میں کہنے لگوں گا تو بگڑ جاؤ گی۔‘‘

پیاری کی آنکھوں میں شرم کی ایک لہر دوڑ گئی، بولی، ’’بگڑنے کی بات ہو گی تو ضرور بگڑوں گی۔‘‘

جوکھو، ’’تو میں نہ کہوں گا۔‘‘

پیاری نے پیچھے کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا، ’’کہو گے کیسے نہیں۔ میں کہلا کر چھوڑوں گی۔‘‘

جوکھو، ’’اچھا تو سنو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمھاری طرح ہو۔ ایسی ہی لجانے والی ہو، ایسی ہی بات چیت میں ہشیار ہو، ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو، ایسی ہی کفایت شعار ہو، ایسی ہی ہنس مکھ ہو۔ بس ایسی مورت ملے گی تو بیاہ کروں گا۔ نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا۔‘‘

پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا، پیچھے ہٹ کر بولی، ’’تم بڑے دل لگی باج ہو۔‘‘

☆☆☆

گلّی ڈنڈا

ہمارے انگریزی خواں دوست مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہوں گا کہ گلّی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجا ہے۔ اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلّی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں۔ نہ لان (میدان) کی ضرورت ہے، نہ کورٹ کی، نہ بیٹ کی، نہ بلے کی۔ مزے سے کسی ایک درخت کی ایک شاخ کاٹ لی، گلّی بنائی اور دو آدمی بھی آ گئے تو کھیل شروع ہو گیا۔ ولایتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے سامان بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ جب تک کم از کم ایک سو خرچ نہ کیجیے، کھلاڑیوں میں شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں گلّی ڈنڈا ہے کہ بغیر ہینگ پھٹکری لگے چوکھا رنگ دیتا ہے۔ لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر ایسے دیوانے ہو رہے ہیں کہ اپنی سب چیزوں سے ہمیں نفرت سی ہو گئی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں ہر لڑکے سے تین چار روپے سالانہ صرف کھیلنے کی فیس لی جاتی ہے۔ کسی کو یہ نہیں سوجھتا کہ ہندوستانی کھیل کھلائیں جو بغیر روپے پیسے کوڑی کے کھیلے جاتے ہیں۔ انگریزی کھیل ان کے لیے ہیں جن کے پاس روپے ہیں۔ بے چارے غریب لڑکوں کے سر پر یہ فضول خرچیاں کیوں منڈھتے ہو۔ ٹھیک ہے، گلّی سے آنکھ پھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے تو کیا کرکٹ سے سر پھوٹ جانے، تلی پھٹ جانے، ٹانگ ٹوٹ جانے کا خدشہ نہیں رہتا؟ اگر ہمارے ماتھے میں گلّی کا داغ لگا ہوا ہے تو ہمارے کئی ایسے دوست بھی ہیں جو بلّے سے گھائل ہونے کا سرٹی فیکٹ رکھتے ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ مجھے گلّی ڈنڈا سب کھیلوں سے زیادہ پسند ہے اور بچپن کی یادوں میں گلّی ڈنڈا ہی سب سے زیادہ شیریں یاد ہے۔ وہ علی الصباح گھر سے نکل جانا، وہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنا اور گلّی ڈنڈے بنانا، وہ جوش و خروش، وہ لگن، وہ کھلاڑیوں کے جمگھٹے، وہ پدنا اور پدانا، وہ لڑائی جھگڑے، وہ بے تکلف سادگی جس میں چھوت چھات اور غریب و امیر کی کوئی تمیز نہ تھی، جس میں امیرانہ چونچلوں کا غرور اور خودنمائی کی گنجائش ہی نہ تھی، اسی وقت بھولے گا۔۔۔ جب گھر والے بگڑ رہے ہیں، والد صاحب چوکے پر بیٹھے روٹیوں پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں، اماں کی دوڑ صرف دروازے تک ہے لیکن ان کے خیال میں میرا تاریک مستقبل ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا رہا ہے اور میں ہوں کہ پدانے میں مست ہوں۔ نہ نہانے کا خیال ہے، نہ کھانے کا۔ گلّی ہے تو ذرا سی مگر اس میں دنیا بھر کی مٹھائیوں کی مٹھاس اور تماشوں کا لطف بھرا ہوا ہے۔

میرے ہم جولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا۔ دبلا، لمبا، بندروں کی سی پھرتی، بندروں کی سی لمبی لمبی انگلیاں، بندروں کی سی جھپٹ۔ گلّی کیسی ہو اس پر اس طرح لپکتا تھا جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ کون تھے، کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا۔ پر تھا ہمارے گلّی کلب کا چمپئن۔ جس کی طرف وہ آ جائے اس کی جیت یقینی تھی۔ ہم سب اسے دور سے آتا دیکھ کر اس کا استقبال کرتے تھے۔ اور اسے اپنا گوئیاں بنا لیتے تھے۔

ایک دن ہم اور گیا دو ہی کھیل رہے تھے۔ وہ پدا رہا تھا، میں پد رہا تھا لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں، پدنا ایک منٹ کا بھی سہا نہیں جاتا۔ میں نے گلا چھڑانے کے لیے وہ سب چالیں چلیں جو ایسے مواقع پر خلافِ قانون ہوتے ہوئے بھی قابل معافی ہیں، لیکن گیا اپنا داؤں لیے بغیر میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگا۔ منت سماجت اور خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا اور ڈنڈا تان کر بولا، ''میرا داؤں دے کر جاؤ۔ پدایا تو بہادر بن کر، پدنے کے وقت کیوں بھاگے جاتے ہو؟''

''تم دن بھر پداؤ تو میں دن بھر پدتا رہوں؟''

''ہاں تمھیں دن بھر پدنا پڑے گا؟''

''نہ کھانے جاؤں نہ پینے جاؤں؟''

''ہاں میرا داؤں دیے بغیر کہیں نہیں جا سکتے۔''

''میں تمھارا غلام ہوں؟''

''ہاں تم میرے غلام ہو۔''

''میں گھر جاتا ہوں۔ دیکھوں تم میرا کیا کر لیتے ہو؟''

''گھر کیسے جاؤ گے؟ کوئی دل لگی ہے۔ داؤں دیا ہے۔ داؤں لیں گے۔''

''اچھا کل میں تمھیں امرود کھلایا تھا، وہ رکھ دو۔''

''وہ پیٹ میں چلا گیا۔''

''نکالو پیٹ سے۔ تم نے کیوں کھایا میرا امرود؟''

''امرود تم نے دیا تب میں نے کھایا۔ میں تم سے مانگنے نہ گیا تھا۔''

''جب تک میرا امرود نہ دو گے میں داؤں نہ دوں گا۔''

میں سمجھتا تھا انصاف میری طرف ہے۔ آخر میں نے کسی غرض کے لیے ہی اسے امرود کھلایا ہوگا۔ کون کسی

کے ساتھ بے غرضانہ سلوک کرتا ہے۔ بھیک تک تو غرض کے لیے ہی دیتے ہیں۔ جب گیا نے میرا امرود کھایا تو پھر اسے مجھ سے داؤں لینے کا کیا حق حاصل ہے۔ رشوت دے کر تو لوگ خون چھپا جاتے ہیں۔ وہ میرا امرود یوں ہی ہضم کر جائے گا۔ امرود پیسے کے پانچ والے تھے جو گیا کے باپ کو بھی نصیب نہ ہوں گے۔ یہ سراسر بے انصافی ہے۔

گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا، ''میرا داؤں دے کر جاؤ۔ امرود وسمرود میں نہیں جانتا۔''

مجھے انصاف کا زور تھا۔ میں ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا۔ میں نے گالی دی۔ اس نے اس بھی سخت گالی دی ہی نہیں دی ایک چانٹا جما دیا۔ میں نے اسے دانت سے کاٹ لیا۔ اس نے میری پیٹھ پر ڈنڈا جما دیا۔ میں رونے لگا۔ گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا، بھاگا۔ میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا اور ہنستا ہوا گھر پہنچا۔ میں تھانے دار کا لڑکا ایک نیچ ذات کے لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا۔ یہ مجھے اس وقت بھی بے عزتی کا باعث معلوم ہوا۔ لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہ کی۔

ان ہی دنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہو گا۔ نئی دنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہم جولیوں سے جدا ہونے کا بلکل افسوس نہ ہوا۔ والد صاحب افسوس کرتے تھے۔ یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی۔ اماں جی بھی بہت افسوس کرتی تھیں۔ یہاں پر سب چیزیں سستی تھیں اور محلے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ لیکن میں مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ لڑکوں سے شیخی بگھارتا تھا۔ وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہیں، ایسے ایسے اونچے مکان ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ وہاں کے انگریزی اسکول میں کوئی ماسٹر لڑکوں کو پیٹے تو قید ہو جائے۔ میرے دوستوں کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور متعجب چہرے صاف بتا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہ میں کتنا اونچا اٹھ گیا ہوں۔ بچوں میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے جسے ہم، جو سچ بنا دیتے ہیں نہیں سمجھ سکتے۔ دوست کہہ رہے تھے، ''تم خوش قسمت ہو۔ بھائی جاؤ ہمیں تو اسی گاؤں میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی۔''

بیس سال گزر گئے۔ میں نے انجینئری پاس کی اور کسی ضلع کا دورہ کرتا ہوا اسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی اس قدر دل کش اور شیریں یاد تازہ ہو اٹھی کہ میں نے چھڑی اٹھائی اور قصبے کی سیر کو نکلا۔ آنکھیں کسی پیاسے مسافر کی طرح بچپن کے ان مقامات کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں جن کے ساتھ کتنی ہی یادگاریں وابستہ تھیں۔ لیکن اس مانوس نام کے علاوہ وہاں کوئی شناسا نہ ملا۔ جہاں کھنڈر تھے وہاں پکے مکانات کھڑے تھے۔ جہاں برگد کا پرانا درخت تھا وہاں اب ایک خوبصورت باغیچہ تھا۔ اس جگہ کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اگر اس کے نام ونشان کا علم نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکتا۔ وہ پرانی یادگاریں باہیں پھیلا پھیلا کر اپنے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھیں۔ مگر وہ دنیا بدل گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس زمین سے لپٹ کر روؤں اور کہوں

''تم مجھے بھول گئیں لیکن میرے دل میں تمھاری یاد تازہ ہے۔''

اچانک ایک کھلی جگہ میں نے دو تین لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے میں اپنے آپ کو بلکل بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں، صاحبی ٹھاٹ میں، رعب اور احتیاط کے لباس میں، جا کر ایک لڑکے سے پوچھا، ''کیوں بیٹے! یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟''

ایک لڑکے نے گلی ڈنڈا سمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا، ''کون گیا؟ گیا چمار؟''

میں نے یوں ہی کہا، ''ہاں ہاں وہی۔ گیا نام کا کوئی آدمی ہے تو شاید وہی ہے۔''

''ہاں ہے تو۔''

''ذرا اسے بلا سکتے ہو؟''

لڑکا دوڑا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لیے آتا دکھائی دیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ اس کی طرف لپکنا چاہتا تھا کہ اس کے گلے لپٹ جاؤں مگر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

بولا، ''کہو مجھے پہچانتے ہو؟''

گیا نے جھک کر سلام کیا، ہاں مالک! بھلا پہچانوں گا نہیں۔ آپ مزے میں رہے۔''

''بہت مزے میں۔ تم اپنی کہو۔''

''ڈپٹی صاحب کا سائیس ہوں۔''

''مانا، موہن، درگا یہ سب کہاں ہیں۔ کچھ خبر ہے؟''

''مانا تو مر گیا۔ موہن اور درگا دونوں ڈاکیے ہو گئے ہیں۔ آپ؟''

''میں ضلع کا انجینئر ہوں۔''

''سرکار تو پہلے ہی بڑے جہین تھے''

''اب کبھی گلی ڈنڈا کھیلتے ہو؟''

گیا نے میری طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا۔ ''گلّی ڈنڈا کیا کھیلوں گا سرکار۔ اب تو پیٹ کے دھندے سے ہی چھٹی نہیں ملتی۔''

''آؤ آج ہم تم کھیلیں۔ تم پدانا ہم پدیں گے۔ تمھارا ایک دانو ہمارے اوپر ہے، وہ آج لے لو۔''

گیا بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ وہ ٹھہرا ٹکے کا مزدور، میں ایک بڑا افسر۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ۔ بیچارہ جھینپ رہا تھا لیکن مجھے بھی کم جھینپ نہ تھی۔ اس لیے نہیں کہ میں گیا سے کھیلنے جا رہا تھا بلکہ لوگ اس کھیل کو عجوبہ سمجھ کر

اس کا تماشا بنالیں گے اور اچھی خاصی بھیڑ لگ جائے گی۔ اس بھیڑ میں وہ لطف کہاں رہے گا، لیکن کھیلے بغیر تو رہا نہیں جاتا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ دونوں بستی سے بہت دور تنہائی میں جا کر کھیلیں۔ وہاں کون دیکھنے والا بیٹھا ہوگا۔ مزے سے کھیلیں گے اور بچپن کی اس مٹھائی کو خوب مزے لے لے کر کھائیں گے۔ میں گیا کو لے کر ڈاک بنگلے پر آیا اور موٹر میں بیٹھ کر دونوں میدان کی طرف چلے۔ ساتھ ایک کلہاڑی لے لی۔ میں متانت کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا مگر گیا ابھی تک مذاق سمجھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور ولولے کا کوئی نشان نہ تھا۔ شاید ہم دونوں میں جو فرق ہو گیا تھا وہ اسے سوچنے میں محو تھا۔

میں نے پوچھا، ''تمھیں کبھی ہماری یاد آتی تھی گیا؟ سچ کہنا!''

گیا جھینپتا ہوا بولا، میں آپ کو کیا یاد کرتا حضور، کس لائق ہوں۔ قسمت میں کچھ دن آپ کے ساتھ کھیلنا لکھا تھا۔ نہیں تو میری کیا گنتی۔''

میں نے کچھ اداس ہو کر کہا، ''لیکن مجھے تو تمھاری یاد برابر آتی تھی۔ تمھارا وہ ڈنڈا جو تم نے تان کر جمایا تھا، یاد ہے نا۔''

گیا شرماتے ہوئے کہا، ''وہ لڑکپن تھا سرکار، اس کی یاد نہ دلاؤ۔''

''واہ، وہ میرے ان دنوں کی سب سے رسیلی یاد ہے۔ تمھارے اس ڈنڈے میں جو رس تھا وہ اب عزت اور بڑائی میں پاتا ہوں نہ دولت میں۔ کچھ ایسی مٹھاس تھی اس میں کہ آج تک اس سے من میٹھا ہوتا رہتا ہے۔''

اتنی دیر میں ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ مغرب کی طرف کوسوں تک بھیم تال پھیلا ہوا تھا جہاں آ کر کسی وقت ہم کنول کے پھول توڑ لے جاتے تھے اور اس کے جھمکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آ رہی ہے۔ میں لپک کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ کاٹ لایا جھٹ پٹ گلی ڈنڈا بن گیا۔ کھیل شروع ہوا۔ میں نے راب میں گلی رکھ کر اچھالی، گیا کے سامنے سے نکل گئی۔ اس نے ہاتھ لپکایا جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو۔ گلی اس کے پیچھے جا گری۔ یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گلی جیسے آپ جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ اپنے دائیں بائیں کہیں ہو، گلی اس کی ہتھیلی میں ہی پہنچتی تھی جیسے گلیوں پر اس نے جادو کر کے انھیں بس میں کر لیا ہو۔ نئی گلی، پرانی گلی، چھوٹی گلی، بڑی گلی، نوک دار گلی سب ہی اس سے ہل جاتی تھیں۔ گویا اس کے ہاتھوں میں کوئی مقناطیسی طاقت ہے جو گلیوں کو کھینچ لیتی ہو۔ لیکن آج گلی کو اس سے وہ محبت نہیں رہی۔ پھر تو میں نے پدانا شروع کیا۔ میں طرح طرح کے فریب کر رہا تھا۔ مشق کی کمی بے ایمانی سے پوری کر رہا تھا۔ داؤں پورا ہونے پر بھی میں کھیلے جاتا تھا حالاں کہ قاعدہ کے مطابق گیا کی باری آنی چاہیے تھی۔ گلی پر ہلکی چوٹ پڑتی اور وہ ذرا ہی دور پر گر

پڑتی تو میں لپک کر اسے خود ہی اٹھالاتا اور دوبارہ ٹل لگاتا۔ گیا یہ ساری بے قاعدگیاں دیکھ رہا تھا، مگر نہ بولتا تھا، گویا اسے وہ تمام قاعدے قانون بھول گئے ہوں۔ اس کا نشانہ کتنا بے خطا تھا۔ گلی اس کے ہاتھ سے نکل کر ٹن سے ڈنڈے میں آ کر لگتی تھی، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر۔ اس کا کام تھا ڈنڈے سے ٹکرا جانا۔ لیکن آج وہ گلی ڈنڈے میں لگتی ہی نہیں۔ کبھی داہنے جاتی ہے کبھی بائیں۔ کبھی آگے کبھی پیچھے۔

آدھ گھنٹہ پدانے کے بعد ایک گلی ڈنڈے میں آ لگی۔ میں نے دھاندلی کی، ''گلی ڈنڈے میں نہیں لگی۔ پاس سے گئی۔ لیکن لگی نہیں۔''

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ ''نہ لگی ہوگی۔''

''ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا!''

''نہیں بھیا، تم بھلا بے ایمانی کرو گے!''

بچپن میں مجال تھی کہ میں ایسا گھپلا کر کے جیتا بچتا۔ یہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا۔ لیکن آج میں اسے کتنی آسانی سے دھوکا دیے چلا جاتا تھا۔ ''گدھا ہے۔ ساری باتیں بھول گیا۔''

اچانک گلی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو۔ اس ثبوت کے مقابل اب کسی طرح کا فریب چلنے کا مجھے اس وقت حوصلہ نہ ہو سکا۔ لیکن کیوں نہ ایک بار سچ کو جھوٹ بنانے کی کوشش کروں۔ ہرج ہی کیا ہے۔ مان گیا۔ واہ وا، ورنہ دو چار ہاتھ پدنا ہی تو پڑے گا۔ اندھیرے کا بہانہ کرے کا تو گلا چھڑا لوں گا۔ پھر کون داؤں دینے آتا ہے۔

گیا نے فاتحانہ انداز سے کہا، ''لگ گئی، لگ گئی۔ ٹن سے بولی۔''

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''تم نے لگتے دیکھا، میں نے تو نہیں دیکھا۔''

''ٹن سے بولی ہے سرکار!''

''اور جو کسی اینٹ میں لگ گئی ہو؟''

میرے منہ سے یہ فقرہ اس وقت کیسے نکل گیا اس پر مجھے خود حیرے ہے۔ اس سچائی کا جھٹلانا ایسا ہی تھا جیسے دن کو رات بتانا۔ ہم دونوں نے گلی ڈنڈے میں زور سے لگتے دیکھا۔ لیکن گیا نے میرا کہنا مان لیا۔

''ہاں سرکار کسی اینٹ سے لگی ہوگی۔ ڈنڈے میں لگتی تو اتنی آواز نہ آتی۔''

میں نے پھر پدانا شروع کیا، لیکن اس قدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد گیا کی سادگی پر مجھے رحم آنے لگا۔ اس لیے جب تیسری بار گلی ڈنڈے میں لگی تو میں بڑی فراخ دلی سے داؤں دینا طے کر لیا۔

گیا نے کہا، ''اب اندھیرا ہو گیا ہے بھیا۔ کل پر رکھو۔''

میں نے سوچا کل بہت سا وقت ہو گا۔ یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے۔ اس لیے اسی وقت معاملہ صاف کر لینا چاہیے۔

''نہیں نہیں، ابھی بہت اجالا ہے۔ تم اپنا داؤں لے لو۔''

''گلی سوجھے گی نہیں۔''

''کچھ پروا نہیں۔''

گیا نے پدانا شروع کیا۔ لیکن اب اسے بالکل مشق نہ تھی۔ اس نے دوبارہ ٹل لگانے کا ارادہ کیا لیکن دونوں ہی بار چوک گیا۔ ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا داؤں پورا کر چکا۔ بے چارہ گھنٹہ بھر پدا لیکن ایک منٹ میں ہی اپنا داؤں کھو بیٹھا۔ میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا۔ ''ایک داؤں اور لے لو۔ تم تو پہلے ہی ہاتھ میں ہچ گئے۔''

''نہیں بھیا، اب اندھیرا ہو گیا ہے۔''

''تمھاری مشق چھوٹ گئی۔ کیا کبھی کھیلتے نہیں ہو؟''

''کھیلنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے بھیا۔''

ہم دونوں موٹر پر جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاؤ پر پہنچ گئے۔

گیا چلتے چلتے بولا، ''کل یہاں گلی ڈنڈا ہو گا۔ سب ہی پرانے کھلاڑی کھیلیں گے۔ تم بھی آؤ گے؟ جب تمھیں فرصت ہو سب کھلاڑیوں کو بلاؤں گا۔''

میں نے شام کا وقت دیا اور دوسرے دن میچ دیکھنے گیا۔ کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی۔ کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے۔ مگر بیشتر نوجوان تھے جنھیں میں پہچان نہ سکا۔ کھیل شروع ہوا۔ میں موٹر میں بیٹھا تماشا دیکھنے لگا۔ آج گیا کا کھیل اور اس کی کرامات دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ ٹل لگاتا تو گلی آسمان سے باتیں کرتی۔ کل کی سی وہ جھجک، وہ ہچکچاہٹ، وہ بے دلی آج نہ تھی۔ لڑکپن کی جو بات تھی آج اس نے اسے کمال معراج تک پنچا دیا۔ کہیں کل اس نے مجھے اس طرح پدایا ہوتا تو میں ضرور ہی رونے لگتا۔ اس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔

پدانے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بدعنوانی کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے گلی دبوچ لی ہے۔ گیا کا کہنا تھا گلی زمین سے لگ کر اچھلی ہے۔ اس پر دونوں میں تال ٹھونکنے کی نوبت آئی۔ نوجوان دب گیا۔ گیا کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ میں کھیل میں نہ تھا مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہی لڑکپن کا لطف آ رہا تھا جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ گیا کل میرے ساتھ کھیلا نہیں صرف کھیلنے کا بہانہ کیا۔ اس نے مجھے قابل رحم سمجھا۔ میں نے دھاندلی کی، بے ایمانیاں کی، اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا، اس لیے کہ وہ کھیل نہ رہا

تھا مجھے کھلا رہا تھا۔ میرا جی رکھ رہا تھا۔ وہ پد کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اب افسر ہوں۔ یہ افسری میرے اور اس کے درمیان اب دیوار بن گئی ہے۔ میں اب کا لحاظ پا سکتا ہوں، ادب پا سکتا ہوں لیکن اس کا ہم جولی نہیں بن سکتا۔ لڑکپن تھا تب میں اس کا ساتھی تھا۔ ہم میں کوئی بھید نہ تھا۔ یہ عہدہ پا کر اب میں اس کے رحم کے قابل ہوں۔ وہ اب مجھے اپنا جوڑ نہیں سمجھتا۔ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔

☆☆☆

انصاف کی پولیس

سیٹھ نانک چند نے آج پھر وہی لفافہ پایا اور وہی تحریر دیکھی تو ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ خط کھولتے ہی ہاتھ اور دل کانپنے لگے۔ خط میں کیا لکھا ہے۔ ساتھیوں نے قیافے سے معلوم کر لیا تھا۔ اسی لفافے اور اسی تحریر کے کئی خط یکے بعد دیگرے انھیں مل چکے تھے۔ اس خط کا بھی وہی مضمون ہوگا، اس میں مطلق شبہ نہ تھا۔ وہ خط کو کانپتے ہاتھوں میں لئے آسمان کی طرف تاکنے لگے، گویا اس میں اپنا نوشتۂ تقدیر پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ دل کے مضبوط آدمی تھے۔ مردوں سے بھی اپنی رقم وصول کر لیتے تھے۔ رحم یا رعایت یا دوسری کمزوریاں نھیں چھو بھی نہیں گئی تھیں۔ ورنہ مہاجن ہی کیسے بنتے؟ وہ ہر پورنماشی کو ستیہ نارائن کی کتھا سنتے تھے۔ پچھلے پندرہ سال میں اس معمول میں ایک ناغہ بھی نہ ہوا تھا۔ منگل یا کسی خاص دن مہابیر جی کو لڈو چڑھاتے تھے۔ روزانہ جمنا میں اشنان کرتے اور شیو جی کو جل چڑھاتے تھے۔ مہینے میں دوبارہ برہمنوں کو بھوجن بھی کراتے تھے اور جب سے گھی کے کاروبار میں نفع کثیر ہونے لگا تھا۔ ایک دھرم شالہ بنوانے کی فکر میں تھے زمین طے کر لی تھی اور کسی اچھی مہورت کے منتظر تھے۔ انھوں نے خوب حساب کر کے دیکھ لیا تھا۔ اس کارِ خیر میں ان کی جیب سے ایک کوڑی بھی خرچ نہ ہوگی۔ زمین ایک بیوہ کی تھی۔ جس پر انھوں نے پہلے نے پہلے اپنی گائے بھینسوں کے لئے ایک مختصر سا چھپر ڈال لیا تھا اور جب بیوہ ایک نابالغ لڑکا چھوڑ کر مرگئی تو وقف زمین اس کے قبضے میں آ گئی۔ لڑکا اپنے ننہال میں تھا اور ننہال والوں کو توفیق نہ تھی نہ اتنی فرصت کہ سیٹھ جی سے مقدمہ بازی کرتے۔ معمار سب ان کے اسامی تھے اور مزدوری کر کے سودا ادا کرنا چاہتے تھے۔ اینٹ والا بھی ان سے کئی سال پہلے قرض لے گیا تھا، اور اصل کی دو چند رقم ادا کر چکنے کے بعد بھی اس پر ان کے ہزاروں روپے نکلتے تھے۔ اس لئے یہ مرحلہ بھی طے تھا۔ صرف سیمنٹ اور چونے والے بیوپاری کے پھنسنے کا انتظار تھا۔ وہ دس بیس ہزار کی دستاویز لکھا لے، بس دھرم شالہ تیار ہے۔ ہر ایک کامیاب آدمی کی طرح دیوتاؤں پر ان کا پکا اعتقاد تھا۔ جن کی دُعا اور برکت سے انھیں کسی کاروبار میں گھاٹا نہیں ہوا۔ مگر جب سے یہ خطوط سنے لگے تھے انھیں ایک وہم آمیز تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ رات کو ان کے دروازے پر محض ایک چوکیدار رہتا ہے۔ اگر دس پانچ مسلح آدمی آ جائیں تو وہ اکیلا کیا کر سکتا ہے۔ شاید انھیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہو۔ ہمسایوں میں ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ جو خطرے کے وقت کام آئے۔ حالانکہ سبھی ان کے آسامی تھے یا رہ چکے تھے۔ لیکن یہ فرقہ احسان فراموشوں کا ہے۔ جس کے دروازے پر

ضرورت کے وقت ناک اور پیشانی رگڑتا ہے۔ اُسی کے درپے آزار ہوجاتا ہے۔ احسان ماننا تو دور رہا۔ اُلٹا بدخواہ ہوجاتا ہے۔ انھوں نے سوچا اگر رات کو دس پانچ آدمی آجائیں تو واقعی بڑی مشکل کا سامنے ہو بے شک دروازہ مضبوط ہے اور اسے توڑنا آسان نہیں۔ جوڑیاں بھی جرمن ساخت کی ہیں جن پر کوئی حربہ اثر نہیں کرسکتا اور دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ ان پر کوئی کیا کھا کے چڑھے گا۔ نقب تو امر محال ہے۔ بیرونی دیوار خالص پتھر کی ہے۔ ایک ایک پتھر دس من کا ہے۔

اس خیال سے انھیں قدرے تشفی ہوئی۔ اپنی رائفل نکال کر انھوں نے اس کا خوب معائنہ کیا۔ موقع پڑنے پر اس سے بھی دس پانچ آدمیوں کو منٹوں میں بھون سکتے ہیں۔ پھر بھی ان پر ایک دہشت سی طاری ہوگئی۔ کون جانے یہ چوکیدار بھی انھیں میں مل گیا ہو۔ خدمت گار بھی تھوڑے سے لالچ سے آستین کے سانپ ہوسکتے ہیں۔

آخر کئی نٹ کے روحانی انتشار کے بعد انھوں نے خط کھولا اور ان کا چہرہ زرد ہوگیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ سانس تیز ہوگئی۔ فوراً دروازہ بند کردیا اور خط لیے اندر آ کر کیسر سے بولے۔

''دیکھتی ہو آج پھر وہی خط آیا۔ آج تو تاریخ بھی مقرر کردی۔ پرسوں ان کا دھاوا ہوگا۔ لکھا ہے اگر اپنی جان عزیز ہے تو پچیس ہزار روپے نقد رامیشور کے مندر کے سامنے درخت کے کے نیچے آٹھ بجے رات کو رکھ دو۔ یہ سب سمجھتے ہوں گے کہ ان گیڈر بھبکیوں سے ڈر جاؤں گا۔''

کیسر پڑھنا نہ جانتی تھی پھر بھی اس نے ان کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اُس پر ایک نظر ڈال کر بولی :

''میں تو سوچتی ہوں مہینے دو مہینے کے لئے یہاں سے کہیں چلے چلیں۔ کاشی، پریاگ، ہردوار، کہیں بھی۔ تیرتھ کا تیرتھ ہوجائے گا اور ذرا چین بھی نصیب ہوگا۔ مجھے تو مارے خوف کے رات کو نیند نہیں آتی۔''

سیٹھ جی دلیرانہ انداز سے بولے۔

''اس طرح ایک ایک دھمکی میں بھاگنے لگوں تو مہاجنی کر چکا۔ یہ سب میرے ہی آسامی ہیں۔ جن کی جائدادیں میں نے نیلام کرائی ہیں۔ رائفل کی جہاں ایک آواز کی۔ ہرن ہوجائیں گے۔ پولیس کو بھی اطلاع کیے دیتا ہوں۔ میں نے ابھی تک پولیس کو خبر نہیں دی۔ وہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑا بنا دیں گے اور دو چار ہزار روپے میری حفاظت کے بہانے سے وصول کرلیں گے اور حفاظت جیسی وہ کریں گے وہ میں جانتا ہوں۔ لیکن اب اطلاع دے دوں گا۔ دو چار سو رپوں کا منہ دیکھوں گا۔ اپنی طرف سے ہوشیار رہنا اچھا ہے۔''

کیسر دوہرے بدن کی عورت تھی۔ نخلِ بے ثمر جو پت جھڑ میں بھی ہری ہری پتیوں سے لدا رہتا ہے۔ اولاد کی ناکام آرزو میں زندگی کا بڑا حصہ گزار چکنے کے بعد اب اس پر ہمیشہ ایک پرخوف مایوسی طوری رہتی تھی۔ معلوم نہیں

کب آنکھیں بند ہوجائیں۔ پھر یہ زرومال کس کے ہاتھ لگے گا۔ سب سے زیادخوف اسے بیماری کا کا۔ اسے وہ موت کا پیش خیمہ سمجھتی تھی اور اس جامۂ ہستی کو اسوقت تک اُتارنا نہ چاہتی تھی جب تک ایک باقی رہے۔ بال بچے ہوتے تو وہ خوشی سے مرتی اور موت کو بلاتی، لیکن اب تو اس کی زندگی ہی اس کا خاتمہ تھا۔ پھر کیوں نہ وہ زیادہ سے زیادہ زندہ رہے۔ اب تک تو صرف بیماری کا خوف تھا۔ اسے وہ دواؤاور دُعاؤں سے دور کرتی رہتی تھی اور گویا ایشور پر اپنی بے نیازی کا اظہار کرنے کے لئے ہمیشہ بنی ٹھنی رہتی تھی۔ لیکن جب سے یہ خطوط آنے لگے تو اس کا خوف بھوت کی طرح اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ منت آمیز لہجے میں بولی۔

''پولیس کو اطلاع کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ میری بات مانو، یہاں سے بھاگ چلو۔ میری بات کیوں نہیں مانتے۔ کیا کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ چور کوئی گھر کو تو اُٹھا نہ لے جائے گا۔''

سیٹھ جی نے کیسر کی بدحواسی پر ترس کھا کر کہا۔

''تم ناحق ڈرتی ہو کیسر! پولیس کو جب ضابطے کے ساتھ اطلاع دی جائے گی۔ تو اس کا فرض ہوجائے گا کہ ہماری حفاظت کرے۔ ہم پانچ ہزار سالانہ ٹیکس دیتے ہیں۔ اگر پولیس نے ساعت نہ کی تو میں لاٹ صاحب سے کہوں گا۔ جب سرکار ہم سے ٹیکس لیتی ہے۔ تو ہماری جان و مال کی حفاظت کرنا اُس کا قانونی فرض ہے۔''

سیاسیات کا یہ مسئلہ کیسر کی سمجھ میں کیا آیا۔ وہ کسی طرح اس خوف سے نجات پانا چاہتی تھی جو اس کے دل میں سانپ کی طرح بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ پولیس کا اسے اب تک جو تجربہ تھا اس سے دل کو تقویت نہ ہوتی تھی۔ بولی:

''پولیس والے واردات کے وقت تو نظر نہیں آتے۔ جب واردات ہوجاتی ہے تب البتہ شان جتانے کے لئے آپہنچتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ پولیس اور دھنش طوفان ختم ہوجانے کے بعد دکھائی دیتی ہے۔''

سیٹھ جی نے پولیس کی حمایت کی۔ ''پولیس والے تو سرکار کا راج چلا رہے ہیں۔ تم کیا جانو۔''

کیسر نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''اور میں کہتی ہوں کہ اگر واردات کل ہونے والی ہے تو پولیس کو خبر دینے سے آج ہوجائے گی۔ لوٹ کے مال میں ان کا ساجھا ہوتا ہے۔

''جانتا ہوں۔ دیکھ چکا ہوں اور روز دیکھتا ہوں سرکار کو پانچ ہزار ٹیکس نہیں دیتے اس پر داروغہ جی کو برابر پاپڑ اور اچار وغیرہ پہنچاتا رہتا ہوں۔ ابھی جاڑوں میں سپرنٹنڈنٹ صاحب شکار کھیلنے آئے تھے تو میں نے کتنی رسد پہنچائی رہی۔ ایک کنستر گھی، ایک بوری شکر تو ایک ہی دن بھیجی تھی۔ یہ سب کھلانا پلانا کس دن کام آئے گا۔ ہاں یہ مانتا ہوں کہ آدمی کو بالکل دوسروں کے بھروسے نہ بیٹھے رہنا چاہیئے۔ اپنی قوتِ بازو سے بھی کام لینا چاہیئے۔ میرا نشانہ تو بے خطا ہوتا ہی ہے، آؤ تمھیں بھی بندوق چلانا سکھادوں۔''

یہ ایک مضحکہ خیز تجویز تھی کیسر ہنس کر بولی۔

''ہاں اور کیا۔ اب آج میں بندوق چلانا سیکھوں گی۔ تم جب دیکھو ہنسی ہی سوجھتی ہے۔''

سیٹھ جی نے کہا۔''اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ آج کل تو عورتیں فوج میں بھرتی ہو رہی ہیں۔ سپاہیوں کی طرح عورتیں بھی قواعد کرتی ہیں۔ بندوق چلاتی ہیں۔''

کیسر نے اعتراض کیا۔''ولایت کی عورتیں چلاتی ہوں گی۔ یہاں کی عورتیں کیا چلائیں گی۔ ہاں انگل بھر کی زبان چاہے چلالیں۔''

سیٹھ جی نے اس فاسد خیال کی تصحیح کی۔''اب یہاں کی عورتیں بھی چلاتی ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے ہم تم دونوں بندوق لے کر کھڑے ہو جائیں گے تو پچاس آدمی بھی اندر گھسنے کی ہمت نہ کر سکیں گے۔ عورت کے ہاتھ میں بندوق توپ سے بھی زیادہ قاتل ہو جاتی ہے۔''

کیسر نے آخری فیصلہ کیا۔''نابابا میں تو چور کی آواز سنتے ہی چکر کھا کر گر پڑوں گی۔''

اس وقت چوکیدار نے آ کر کہا۔''داروغہ جی نے کئی کانسٹبل بھیجے ہیں۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔''

(۲)

سیٹھ جی باہر آئے تو کانسٹبلوں نے انھیں ادب سے سلام کیا اور ان میں سے ایک نے کہا۔''ہمیں داروغہ جی نے آپ کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا ہے کہ آپ کے پاس دھمکی کی چٹھیاں تو نہیں آ رہی ہیں؟ آج کل باہر سے ڈاکو اس علاقے میں آ گئے ہیں اور لوٹ مار کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔''

سیٹھ جی نے کانسٹبلوں کو کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا۔''داروغہ کو کیسے معلوم ہو گیا۔ میرے پاس تو ایسے کئی خط آ چکے ہیں۔ ایک آج بھی آیا ہے۔ میں خود داروغہ جی کو اطلاع دینے آ رہا تھا۔''

ہیڈ کانسٹبل نے جواب دیا۔''حضور یہ نہ پوچھیں کہ داروغہ جی کو کیسے معلوم ہو گیا۔ علاقے سب سے بڑے سیٹھ کے پاس ایسے خط آئیں اور پولیس کو خبر نہ ہو۔ بھلا کوئی بات ہے۔ حکام کی برابر تاکید ہوتی رہتی ہے کہ سیٹھ جی کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا جائے۔ حضور پانچ ہزار روپے سالانہ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ہوتے مجال ہے کہ آپ کا بال بھی بیکا ہو جائے۔ آج داروغہ جی بڑی دیر تک اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہے یہ ڈاکو اتنے دلیر اور تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ تھانے کے باہر ان سے مقابلہ کرنا دشوار ہے۔ داروغہ جی نے سوچا تھا گارڈ منگا لیں گے مگر ڈاکو کہیں ایک جگہ تو رہتے نہیں۔ آج یہاں تو کل یہاں سے دو سو کوس پر پہنچ گئے۔ گارڈ منگا کر ہی کیا کر سکتے تھے۔ رعایا

کی تو ہمیں فکر نہیں کس کے پاس اتنا مال اسباب رکھا ہے کہ ڈاکوؤں کا اندیشہ ہو اور اگر کسی کے پاس دو چار سو نکل ہی آئے تو اس کے لیے پولیس ڈاکوؤں کے پیچھے اپنی جاں ہتھیلی پر لیے نہ پھرے گی۔ ڈاکوؤں پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ وہ تو بے دریغ گولی چلاتے ہیں اور اکثر چھپ کر۔ ہمارے لئے تو ہزار بندشیں اور قیدیں ہیں۔ کوئی بات بگڑ جائے تو اُلٹی اپنی جان آفت میں پھنس جائے۔ اس لئے داروغہ جی نے ہمیں یہ پیغام دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ کو جس مال و اسباب کے بارے میں خطرہ ہو اسے لا کر تھانے کے خزانے میں جمع کر دیجیے۔ آپ کو رسید دے دی جائے گی۔ آپ کا قفل لگا دیا جائے گا۔ صندوق پر آپ اپنی مہر لگا دیجیے گا۔ جب یہ ہنگامہ ٹھنڈا ہو جائے تو آپ اپنی چیزیں واپس لے لیجئے گا۔ اس کے لئے سرکار آپ سے کسی قسم کی فیس نہیں لینا چاہتی۔ محض آپ کی حفاظت کے خیال سے یہ تجویز کی گئی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ کے دفتر سے اس قسم کا کوئی حکم آیا ہے کہ جو لوگ ایک ہزار یا اسے زیادہ ٹیکس دیتے ہوں ان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ ورنہ سخت جواب طلب کیا جائے گا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں۔ پولیس اتنا بڑا جوکھم کیوں اپنے سر لیتی۔ اس سے آپ کو بھی بے فکری ہو جائیگی اور ہم بھی ذمہ داری سے بچ جائیں گے۔ ورنہ خدانخواستہ کوئی واردات ہو جائے تو حضور کا جو نقصان ہو وہ تو ہو ہی۔ ہمارے اوپر بھی جواب دہی آ جائے۔ یہ ڈاکو اتنے ظالم ہیں کہ محض مال و اسباب لے کر ہی جان نہیں چھوڑتے بلکہ خون بھی کر ڈالتے ہیں۔ اس لئے داروغہ جی نے بہت زور دے کر کہا ہے کہ آپ آج ہی خطرے والی چیزیں لے کر تھانے میں تشریف لے آئیں اور انھیں خزانے میں داخل کر کے رسید لے لیں۔ مزید اطمینان کے لئے آپ چاہیں تو اپنا ایک آدمی وہاں تعینات کر سکتے ہیں۔ حضور کے پاس موٹر تو ہے ہی۔ ہم چار آدمی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ تحقیقی خبر ملی ہے کہ ڈاکوؤں کا غول اس علاقے میں کل آ گیا ہے۔ بیس آدمی ہیں اور اب کے سب مسلح۔ دو سادھو بنے ہوئے ہیں۔ دو پنجابیوں کے بھیس میں ہیں اور الوان اور دھسّے بیچتے پھرتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ دو بہنگی بردار بھی ہیں۔ دو ڈاکو بلوچیوں کے بھیس میں چھریاں اور تالے بیچتے ہیں اور کہاں تک گناؤں۔ ہمارے یہاں تو ان کا پورا حلیہ آ گیا ہے۔''

خطرے میں انسان کا دل کمزور ہو جاتا ہے اور ایسی باتوں کا بھی یقین کر لیتا ہے۔ جو شاید ہوش و حواس کی حالت میں وہ نہ کرتا۔ یہاں تو شبہے کا موقع ہی نہ تھا۔ ممکن ہے اس میں داروغہ جی کی کوئی غرض شامل ہو اور وہ اس خدمت کا کچھ صلہ بھی چاہتے ہوں۔ اس کے لئے سیٹھ جی تیار تھے کہ اگر دو چار سو روپے دینے پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسے واقعے تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ موجودہ حالت میں اس سے بہتر کوئی انتظام خیال میں نہیں آتا تھا۔ بلکہ اسے امدادِ غیب سمجھنا چاہیے انھیں کانسٹبلوں کو کچھ دے دلا کر ساری چیزیں نکلوا لیں گے۔ دوسروں کا کیا

بھروسہ کہیں ڈاکوؤں سے مل جائیں تو غضب ہی ہوجائے۔ راستے ہی میں گھیر لیے جائیں۔ بیس کے مقابلے میں چار آدمی کر ہی کیا سکتے ہیں اور کون جانے کہ ڈاکوؤں کے پاس کار نہ ہوگی۔''

پھر بھی اس انداز سے بولے گویا داروغہ جی نے ان پر کوئی خاص عنایت نہیں کی ہے۔ یہ تو ان کا فرض ہی تھا۔ میں اس عنایت کے لئے داروغہ جی کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ مگر میں نے یہاں ایسا انتظام کرلیا تھا کہ اگر ڈاکو یہاں آتے تو ان کے دانت کھٹے کر دیئے جاتے۔ سارا محلہ مقابلے کے لئے تیار تھا۔ سب ہی سے تو اپنا یارانہ ہے۔ مگر داروغہ جی کی تجویز مجھے پسند ہے۔ اس سے وہ بھی اپنی ذمہ داری سے بری ہوجاتے ہیں اور میرے سر سے بھی فکر کا بوجھ اُتر جاتا ہے۔ جیسا آپ نے خود کہا لیکن اندر سے چیزوں کو نکال نکال کر باہر لانا اور کار میں رکھنا میرے بوتے کی بات نہیں۔ آپ کی دُعا سے آدمی تو کافی ہیں مگر کس کی نیت کیسی ہے۔ یہ کون جانتا ہے۔ آپ لوگ کچھ مدد کریں تو کام آسان ہوجائے۔ (مسکرا کر) آپ کی محنت رائیگاں نہ جائے گی۔''

کیسر نے اس تجویز کو لبیک کہا۔ کانسٹبلوں نے بھی اپنی خدمات خوشی سے پیش کیں۔ ہیڈ کانسٹبل نے کہا۔

''ہم حضور کے تابعدار ہیں۔ اس میں مدد کی کون سی بات ہے۔ تنخواہ سرکار سے ضرور پاتے ہیں۔ مگر دیتے تو حضور ہی ہیں۔ آپ صرف بتاتے جایئے۔ ہم لوگ آن کی آن میں سارا سامان نکال کر رکھ دیں گے۔''

کیسر نے خوش ہوکر کہا۔

''بھگوان نے مدد کر دی۔ نہیں میں تو بہت گھبرا رہی تھی۔ جان نکلی جاتی تھی۔''

سیٹھ جی نے ہمہ دانی کے انداز سے کہا۔''اسی کو کہتے ہیں سرکار کا انتظام! اسی مستعدی کی ہی بدولت سرکاری راج تھما ہوا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کوئی قیمتی چیز یہاں نہ چھوڑی جائے تاکہ وہ آئیں تو اپنا سا منہ لے کر چلے جائیں۔''

کیسر نے جھک کر کہا۔''کنجی ان سبھوں کے سامنے پھینک دینا کہ جو چیز چاہو نکال لے جاؤ۔''

دو کانسٹبلوں نے اندر جا کر صندوقچے اور پٹارے نکالنے شروع کیے ایک باہر سامان کار پر لاد رہا تھا اور ہیڈ کانسٹبل نوٹ بک پر ہر ایک چیز کا اندراج کر رہا تھا۔ زیورات، اشرفیاں، نوٹ، بیش قیمت کپڑے، شال دوشالے، نقرئی ظروف سب کار میں رکھ دیئے گئے۔ معمولی فرنیچر، برتن، فرش فروش اور غلہ وغیرہ کے سوا گھر میں اور کچھ نہ بچا۔ اور یہ چیزیں ڈاکوؤں کے لئے بالکل بے مصرف ہیں۔ کیسر کا سنگاردان سیٹھ جی خود لائے اور ہیڈ کانسٹبل کو دے کر بولے۔

''بھئی اسے بڑی حفاظت سے رکھنا۔''

ہیڈ کانسٹبل نے سنگاردان لے کر کہا۔

''میرے لئے ہر ایک تنکا اتنا ہی بیش قیمت ہے۔''

سیٹھ جی کے دل میں ایک شبہ پیدا ہوا کہا

''اس فہرست کی ایک نقل مجھے بھی دے دیجیے گا۔''

ہیڈ کانسٹبل نے کہا۔''وہ آپ کو تھانے میں باضابطہ دی جائے گی۔''

''کیوں نہ یہیں دے دیجئے ؟''

''یہاں لکھنے میں دیر ہوگی اور پھر جب تک داروغہ جی کے دستخط نہ ہوں، اس رسید کی وقعت ہی کیا؟ مگر آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہوا؟''

سیٹھ جی نے نادم ہو کر کہا۔

''شبہ نہیں تھا۔ میں نے سمجھا ایک رسید میرے پاس بھی ہوتی تو اچھا تھا۔''

ہیڈ کانسٹبل نے بے رخی سے کہا۔''اگر آپ کے دل میں کسی قسم کا شبہ ہو تو آپ چیزیں اپنے گھر ہی میں رکھیں۔ ہم یہاں بھی آپ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ مگر ہاں! اس حالت میں ذمہ داری آپ کی رہے گی۔''

سیٹھ جی اور نادم ہوئے۔''نہیں نہیں صاحب! شبے کی بات نہیں تھی۔ یوں ہی ایک خیال آ گیا تھا۔ آپ کہتے ہیں رسید تھانے میں مل جائے گی۔ میں بھی مانتا ہوں۔''

کار پر سامان رکھ دیا گیا۔ محلے کے سینکڑوں آدمی تماشا دیکھ رہے تھے۔ کار بہت بڑی تھی مگر بالکل بھر گئی۔ پانچ آدمیوں کے لئے بڑی مشکل سے جگہ نکلی۔ سیٹھ جی تو پیچھے والی جگہ پر بیٹھے باقی چاروں آدمی اگلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ کیسر دروازے پر اس انداز سے کھڑی تھی گویا اس کی لڑکی رُخصت ہو رہی ہو۔

(۳)

پانچ میل کا سفر تھا۔ قصبے سے باہر نکلتے ہی پہاڑوں کی خاموشی اور اودی بلندیاں نظر آئیں جن کے دامن میں ہرا بھرا سبزہ زار تھا اور اس میدان کے بیچ سے سُرخ بجری کی سڑک سندور بھری مانگ کی طرح نکل گئی تھی۔ ایک میل جانے کے بعد ہیڈ کانسٹبل نے سیٹھ جی سے پوچھا۔

''یہ کہاں تک صحیح ہے سیٹھ جی کہ پچیس سال پہلے آپ یہاں بالکل خالی ہاتھ آئے تھے؟''

نانک چند تفاخر کے انداز سے بولے۔

''بالکل صحیح ہے خاں صاحب! میرے پاس کُل تین روپے تھے۔ لُٹیا ڈور کندھے پر تھی اور چھڑی ہاتھ میں۔ بس بھگوان کا بھروسہ تھا۔ بالکل تقدیر کا کھیل ہے اور بھگوان کی مرضی چاہیئے۔ آدمی کے بنتے بگڑتے دیر نہیں لگتی۔''

''میں نے سُنا ہے آپ دوسرے سیٹھ ساہوکاروں کی طرح بخیل نہیں ہیں۔''

''میرا اصول ہے کہ اصلی بچت وہی ہے جو آرام سے زندگی بسر کرنے کے بعد بچ رہے جب بہت تھوڑی آمدنی تھی تب بھی میرا یہی اصول تھا۔''

''آخر یہ دولت آپ کو ملی کہاں سے؟''

''آڑھت، لین دین، رہن، بیع سب ہی کچھ تو ہے۔ خاں صاحب! یہ سمجھ لیجیے کہ صبح سے آدھی رات تک سر اُٹھانیکی فرصت نہیں ملتی۔ صرف کھانا کھانے اندر جاتا ہوں۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں۔ محنت کے بغیر کسی کام میں کامیابی نہیں ہوتی۔ آپ کو اپنے ہاتھ سے بھی بہت سا کام کرنا پڑتا ہوگا۔''

''کچھ نہیں صاحب نوکر چاکر سب کچھ کر لیتے ہیں۔ میں تو بیٹھا نگرانی کرتا ہوں۔''

''آپ نے کئی لاکھ پیدا کئے ہوں گے۔''

''دوسوا دو لاکھ کی جائداد ہے خاں صاحب! بیس ہزار کا تو مکان ہی کھڑا ہے۔ آج بیچوں تو پچاس ہزار سے کم نہ ملے۔''

''لیکن اصلی سرمایہ وہی آپ کے تین روپے تھے؟''

''سرمایہ تو آدمی کی ساکھ ہے خاں صاحب! آج چاہوں تو کہیں سے لاکھوں کا مال منگا،سکتا ہوں۔''

''آپ کی زندگی واقعی ہمارے لئے نمونہ ہے۔''

''آپ لوگوں کی دعا سے اب تک تو آرام سے کٹ گئی۔ آگے بھگوان جانے۔''

''اب تو آرام سے کٹے گی کیوں کہ آپ کی ساکھ بہت بڑھ گئی ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے خان صاحب! اپنی ساکھ تو بنانے سے بنتی ہے۔''

''یہ مال واسباب اور جائداد آپ کے لئے فضول ہے۔ آپ اپنی ساکھ سے اپنا روزگار کر سکتے ہیں۔''

''بہت اچھی طرح خاں صاحب! یہ سب تو مایا جال ہے جس میں پھنس جانے کے بعد پھر نجات نہیں ملتی۔ مر کر ہی گلا چھوٹتا ہے۔ اب دھرم شالہ بنونے کا ارادہ ہے۔ سامان کر لیا ہے۔ کوئی اچھی مہورت دیکھ کر ہاتھ لگا دینا ہے۔ ایک لڑکا بھی گود لینا چاہتا ہوں۔ بس پھر بھگوان کا بھجن کرونگا۔''

''آپ کے کوئی اولاد ہوئی ہی نہیں''

''تقدیر میں نہ تھی خاں صاحب! اور کیا کہوں، جن کے گھر میں بھونی بھانگ نہیں۔ ان کے ہاں تو گھاس

پھوس کی طرح بچے نکلتے آتے ہیں۔ جنھیں بھگوان نے کھانے کو دیا ہے وہ اولاد لئے ترس کر رہ جاتے ہیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں، سیٹھ جی! آپ کی باتیں بڑی پُرمغز ہوتی ہیں۔ اگر ہم آپ کو اس مایا جال سے چھڑا دیں تو یقیناً آپ ہمارے احسان مند ہوں گے۔''

سیٹھ جی ہنسے اور بولے۔ ''بھگوان کے سوا اس مایا جال سے کون چھڑا سکتا ہے خاں صاحب!''

ہیڈ کانسٹبل نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ ''بھگوان کیوں چھڑانے لگے۔ آپ خود کیوں نہیں چھوٹ جاتے۔ جس دولت سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں اُسے کیوں نہ غریبوں میں تقسیم کر دیجئے بے فائدہ سینے پر بوجھ لادنے سے کیا مطلب۔''

''بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے خاں صاحب! مایا جال کہیں ٹوٹ سکتا ہے؟''

''میں تو توڑنے کے لیے تیار ہوں اسی وقت۔''

''اس دولت کے لئے آدمی اپنا خون پسینہ ایک کر دیتا ہے خاں صاحب! دغا، فریب، بے ایمانی اور ظلم سب کچھ اسی کے لئے کرتا ہے۔ بغیر اپنا ضمیر بیچنے دولت نہیں ملتی۔ ایسی بیش قیمت چیز کون چھوڑ سکتا ہے۔''

لیکن آپ نے فرمایا ہے کہ صرف آپ کے اقبال کا ظہور ہے۔ آپ نے کوئی خاص محنت نہیں کی''

''نگرانی میں کچھ کم محنت ہے خاں صاحب!''

''آپ دن بھر دھوپ میں ٹھیلہ کھینچنا پسند کریں گے یا گدی پر بیٹھے نگرانی کرنا۔''

''مگر سب آدمی سب ہی کام تو نہیں کر سکتے۔''

''آخر یہ روپیہ آپ کے پاس آیا کہاں سے؟ آپ نے کسی آسامی کو سو روپے قرض دیے۔ یقیناً اُس سے کچھ نہ کچھ سود لیا ہی ہوگا۔ کبھی کبھی تو سو کے دو سو، تین سو، چار سو تک وصول کئے ہوں گے۔ آپ کے روپے نے تو بچے دیئے نہیں۔ آسامی کی محنت کے روپے آپ کے ہاتھ لگے۔ بسا اوقات دو چار سو روپے قرض دے کر آپ نے پورے خاندان کو غلام بنا لیا ہوگا اور ان کی شبانہ روز کی مشقت کی کمائی آپ کے ہاتھ لگی ہوگی۔''

سیٹھ جی نے حیرت کی نگاہ سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ تو کوئی بڑا عجیب آدمی ہے۔ خواہ مخواہ بحث کر رہا ہے، مانا میں نے دوسروں کی محنت سے ہی دولت پیدا کی تو پھر؟ جو سب کرتے ہیں وہی میں نے کیا۔ کوئی نئی بات نہیں کی۔ بولے۔ ''اس طرح تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے سب ہی دولت مند مفت خور ہیں۔''

خاں صاحب نے اس کی تائید کی۔ ''بے شک، میں بڑے زور سے یہ دعویٰ کرتا ہوں، یہاں تک کہ سب ہی سلطنتیں اسی ذیل میں آجاتی ہیں۔ فرق یہی ہے کہ آپ آسامیوں سے روپے وصول کر کے جمع رکھ چھوڑتے ہیں۔ سرکار اس سے ملک کا انتظام کرتی ہے۔ عدالتیں اور پولیس قائم کرتی ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی بہ اطمینان غرباء کا

خون چوس سکیں اگر کوئی غریب سرکشی کرے اور آپ کا منہ اپنی رگ سے ہٹا دینا چاہے تو سرکار کی پولیس اور عدالت اور فوج آپ کی مدد کرے۔ دراصل آپ ے سود یا نفع یا مال گزاری کی شکل میں جو کچھ بھی پایا ہے وہ غریبوں کی کمائی ہے جو آپ نے اُن سے جبراً چھین لی ہے اور جو آپ ہی کے لفظوں میں آپ کے پاس بے کار پڑی ہوئی ہے۔ آپ کو مسروقہ مال گھر میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ ان چیزوں کو پولیس کے حوالے کر کے گھر کی راہ لیجئے۔ ہم سرکاری پولیس کے سپاہی نہیں، انصاف کی پولیس کے سپاہی ہیں۔ ہم نے متواتر خطوط سے آپ کو آگاہ کیا۔ یہاں تک کہا کہ آپ ہمیں صرف پچیس ہزار روپے دے دیجیے لیکن آپ سرکاری امداد کے زعم میں بیٹھے رہے۔ مجبوراً ہمیں یہ چال چلنی پڑی۔''

سیٹھ جی کا خون خشک ہو گیا۔ لیکن نہیں یہ پولیس والے مجھے ڈرا رہے ہیں اور اب میری بزدلانہ بدحواسی کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ بولے۔

''خاں صاحب! آپ بڑے دل لگی باز ہیں، لیکن سچ مچ ڈاکوؤں نے یہ چال چلی ہوتی تو اس وقت میں دھوکے میں آچکا ہوتا۔''

''تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ڈاکوؤں نے سچ مچ آپ کے ساتھ چال چلی ہے اور آپ دھوکے میں آگئے ہیں۔ اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔''

گاڑی رُک گئی۔ سیٹھ جی ڈھکیل کر نیچے گرا دیئے گئے اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلی۔ سیٹھ جی چلاتے ہوئے موٹر کے پیچھے دوڑے۔ ''حضور، سرکار، بھائیو! بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ رحم کیجئے میں خوشی سے آپکو ۲۵ ہزار دیدونگا۔ آپ نے کہا ہے آپ انصاف کی پولیس ہیں۔ یہ بے انصافی نہ کیجیے۔''

خاں صاحب نے دروازے سے سر نکال کر کہا :

''کاش! یہ ۲۵ ہزار آپ نے پہلے دے دیے ہوتے۔ اب تو معیاد گزر گئی۔ اپنے کو کتنے خطرے میں ڈال کر ہم نے یہ دولت پائی ہے اسکا خیال کیجئے۔ آپ کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو اسوقت ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں اور بے بھاؤ کی پڑ رہی ہوتی۔ اب آپ آرام سے تشریف لے جائیے۔ یہ وہ تین روپے ہیں جو آپ ساتھ لے کر یہاں آئے تھے۔ اب جا کر پھر دولت جمع کیجئے۔ دس پانچ برس میں ہم پھر آپ کو مایا جال سے نکال لیں گے۔''

موٹر تیز ہو گئی اور سیٹھ جی چیختے رہ گئے۔

''دوڑو، دوڑو! ڈاکو مجھے لوٹے لئے جا رہے ہیں'' لیکن وہ ساری فریاد، فریادِ صحرا تھی۔

☆☆☆

قاتل کی ماں

رات کو رامیشوری سوئی تو کیا خواب دیکھتی ہے کہ ونود نے کسی افسر کو مار ڈالا ہے اور کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں بے گناہوں کو زدوکوب کر رہی ہے اور تمام شہر میں شوروشر بپا ہے۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو ونود سو رہا تھا۔ اٹھ کے ونود کے پاس گئی، پیار سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور سوچنے لگی میں نے کیا بے سر پیر کا خواب دیکھا ہے، اس کے ساتھ کچھ متفکر بھی ہو گئی۔ پھر لیٹی مگر نیند نہ آئی۔ دل میں ایک خوف سا سما گیا تھا۔

صبح کو ونود نے ماں کو متفکر دیکھ کر پوچھا، ''اماں! آج اداس کیوں ہو؟''

ماں ونود کو محبت سے لبریز آنکھوں سے دیکھ کر بولی، ''بیٹا! تم سے کیا کہوں رات کو میں نے ایک بہت بُرا خواب دیکھا ہے جیسے تم کسی افسر کو مار کر بھاگ گئے ہو اور بے گناہوں پر مار پڑ رہی ہے۔''

ونود نے ہنس کر کہا، ''کیا تم چاہتی تھیں کہ میں پکڑ لیا جاتا؟''

ماں نے کہا، ''میں تو چاہتی ہوں کہ تم ایسے کاموں کے نزدیک ہی نہ آؤ۔ پکڑے جانے کا سوال ہی کیوں اٹھے۔ ہمارا دھرم ہے کہ خود جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں، دوسروں کو مار کر خود جینا میرے دھرم کے خلاف ہے۔''

ونود، ''یہ دھرم اور نیتی کا زمانہ نہیں ہے۔''

ماں، ''دھرم اور نیتی کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی ہے اور آیندہ بھی ہوگی۔ سوراجیہ قتل اور خون سے نہیں ملتا۔ تیاگ، تپ اور آتم شدھی سے ملتا ہے۔ لالچ چھوڑتے نہیں، بری خواہشات چھوڑتے نہیں، اپنی برائیاں دیکھتے نہیں، اس پر دعوا ہے سوراجیہ لینے کا! یہ سمجھ لو کہ جو سوراجیہ قتل وخون سے ملے گا وہ قتل وخون پر ہی قائم رہے گا۔ عوام کی کوشش سے جو سوراجیہ ملے گا، وہ ملک کی چیز ہوگی۔ افراد کی کوشش سے جو سوراجیہ ملے گا وہ افراد کی چیز ہوگی اور تھوڑے سے آدمیوں کا ایک گروہ تلوار کے زور سے انتظام کرے گا۔ ہم عوام کا سوراجیہ پر

کھڑی ہوکر بولتی ہو۔ یہاں کون سننے والا ہے۔''

ماں نے کہا،''بیٹا! تم ہنستے ہواور میرا جی دکھی ہے۔کئی دن سے دائیں آنکھ برابر پھڑک رہی ہے۔ یقیناً کوئی مصیبت آنے والی ہے۔''

ونود نے کہا،''مصیبت سے نہیں ڈرتا۔ ابھی کون سا سکھ بھوگ رہے ہیں، جو مصیبتوں سے ڈریں۔'' یہ کہتا ہوا ونود باہر چلا گیا۔

(۲)

آج صبح ہی سے ونود کا پتا نہ تھا۔ معلوم نہیں کہاں گیا۔ رامیشوری نے پہلے تو سمجھا کہ کانگریس کے دفتر میں ہوگا۔ لیکن جب ایک بج گیا اور وہ لوٹ کر نہ آیا تو اسے فکر ہوئی۔ دس بجے کے بعد وہ کہیں نہ رکتا تھا۔ پھر سوچا شاید کسی کام سے چلا گیا ہو۔ رات کا خواب اسے بے چین و پریشان کرنے لگا اور وقت کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی بڑھنے لگی۔ جب شام ہوگئی تو اس سے نہ رہا گیا۔ کانگریس کے دفتر گئی۔

وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج ونود صبح سے ایک بار بھی نہیں آیا۔ رامیشوری کا دل کسی نامعلوم خوف سے پریشان ہوگیا اور وہ خواب مجسّم بن کر اسے ڈرانے لگا۔ کچھ دیر تک وہ حواس باختہ چُپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر خیال آیا، شاید گھر گیا ہو۔ فوراً گھر لوٹی لیکن یہاں ونود کا اب تک پتا نہ تھا۔

جوں جوں اندھیرا ہوتا جاتا اس کی جان خشک ہوتی جاتی تھی۔ اس پر دائیں آنکھ بھی پھڑکنے لگی۔ خیالات اور بھی خوف ناک صورت اختیار کرنے لگے۔کوئی دیوی یا دیوتا نہ بچا جس کی اس نے منت نہ مانی ہو۔ کبھی صحن میں آکر بیٹھ جاتی، کبھی دروازے پر جاکر کھڑی ہوتی۔ اس کا دل کسی خوف زدہ طائر کی مانند کبھی نشیمن میں آ بیٹھتا اور کبھی شاخ پر۔ کھانا پکانے کا خیال کسے تھا۔ بار بار یہی سوچتی، بھگوان میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے جس کی سزا دے رہے ہو۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دو۔ میں تو خود ہی مصیبت زدہ ہوں۔ اب اور برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔

رامیشوری سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیکس کے ساتھ کوئی رونے والا نہ دیکھ کر اس کے ساتھ دیتی ہوں۔

نصب شب گزر چکی تھی۔ رامیشوری ابھی تک دروازے پر کھڑی ونود کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کوئی شخص نہایت تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم پر ایک سیاہ کمبل تھا جسے اس نے اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ منہ کا بڑا حصہ چھپ گیا تھا۔

رامیشوری نے ڈر کر پوچھا، ''کون ہے؟''

وہ ونود تھا۔ جلدی سے اندر صاخل ہو کر ماں سے دروازہ بند کرنے کو کہا، پھر آنگن میں آکر کمبل کو رکھ دیا اور کھانے کو مانگا۔

رامیشوری نے خائف ہو کر پوچھا، ''تم آج دن بھر کہاں تھے؟ میں تمام دن تمھیں ڈھونڈتی رہی۔''

ونود نے قریب آکر کہا، ''میں ایک نہایت ضروری کام سے گیا تھا اور ابھی پھر لوٹ جانا ہے۔ صرف تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اب دو چار مہینے میں یہاں نہ رہ سکوں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے وہی کیا جو میں اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ حفاظتِ جان کی خاطر مجھے یہاں سے بھاگ جانا ضروری ہے۔''

رامیشوری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بولی، ''بیٹا! تم نے وہی کیا جس کا مجھے خوف تھا۔ ایشور نے تمھاری بُدھی کیوں ہر لی؟''

ونود نے کہا، ''نہ ایشور نے میری بُدھی ہری ہے نہ مجھ پر کوئی آفت آئی ہے۔ میں نے آج چھاؤنی میں ایک آفیسر کو مار ڈالا ہے۔ ایسا نشانہ مارا کہ ایک ہی گولی میں ٹھنڈا ہو گیا۔ ہلا تک نہیں۔''

''کیا وہاں اور کوئی نہ تھا؟''

''کوئی نہیں، بلکل سناٹا تھا۔''

''پولیس کو خبر تو ہوئی ہوگی؟''

''ہاں! کئی شخص پکڑے گئے ہیں۔ میں تو صاف بچ نکلا۔''

رامیشوری کی حالت بدل گئی۔ بیٹے کی محبت میں اشکبار آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ بولی، ''میں اسے بچنا نہیں کہتی کہ مجرم تو منہ چھپا کر بھاگ جائے اور بے گناہوں کو سزا ملے۔ تم خونی ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری کوکھ سے ایسا سپوت پیدا ہوگا، ورنہ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ اگر مرد ہے تو جا کر عدالت میں اپنا قصور

تسلیم کرلے ورنہ بے گناہوں کا خون بھی تیرے سر پر ہوگا۔''

یہ پھٹکار سن کر ونود کو غصہ آ گیا۔ بولا، ''تمھارے کہنے سے میں خونی نہیں ہوا جاتا۔ اور لوگ یہی کام کرتے ہیں تو لیڈر ہو جاتے ہیں۔ ان کی جے جے کار ہوتی ہے۔ لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ میں نے کیا تو ہتیارا ہو گیا۔''

رامیشوری، ''ہتیارا تو تُو ہے ہی اور جو دوسروں کی ہتیا کرتے ہیں وہ تمام کے تمام ہتیارے ہیں۔ تیری ماں ہو کر میں بھی پاپ کی حصہ دار ہو گئی۔ میرے منہ میں بھی سیاہی لگ گئی۔ لیڈر وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے مرتے ہیں۔ جو دوسروں کی حفاظت کرے وہی بہادر اور سورما ہے، انھیں کا جنم مبارک ہے۔ انھیں کی مائیں خوش نصیب ہیں۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو خون کر کے اپنی بڑائی کر رہا ہے۔''

ونود نے پھر کمبل اٹھایا اور بولا، ''تم میری ماں نہ ہوتیں تو اسی وقت لگے ہاتھ تمھارا کام بھی تمام کر دیتا۔ جیتے جی پھر تمھارا منہ نہ دیکھوں گا۔'' یہ کہتا ہوا وہ جوش میں گھر سے نکل پڑا۔

(۴)

دم بھر بعد رامیشوری بھی اس جوش میں گھر سے نکلی۔ بیٹا ہے تو کیا، وہ یہ ناانصافی گوارا نہیں کر سکتی۔ وہ اسی وقت کوتوالی میں جا کر اس خون کی خبر دے دے گی۔ ونود کو پھانسی پر چڑھنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بے گناہوں کو پھانسی ہو۔

لیکن کچھ دور چلنے کے بعد ماں کا دل بے چین ہو گیا۔ وہ لوٹ پڑی اور گھر آ کر خوب روئی۔ جس بیٹے کو اس نے ایسی ایسی مصیبتیں جھیل کر پالا، کیا اسے پھانسی دلا دے گی۔

لیکن پھر خیال آیا ان بے چاروں کی مائیں بھی تو ہوں گی جو بے گناہ پھانسی پائیں گے، انھیں بھی تو اپنے بیٹے اتنے ہی پیارے ہوں گے۔۔۔ نہیں نہیں، وہ یہ ظلم نہیں کر سکتی، اسے بغیر بیٹے کے ہونا منظور ہے مگر اس کے دیکھتے بے گناہوں کا خون نہ ہوگا۔

رامیشوری اسی الجھن میں پڑی ہوئی تھی۔ جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو وہ رونے لگ جاتی تھی، پھر سوچتی تھی کیوں نہ خودکشی کر لوں کہ تمام دکھوں سے نجات مل جائے۔ لیکن اس کی موت سے ان بے گناہوں کی جان تو نہ بچے گی۔ ان ماتاؤں کا کلیجہ تو ٹھنڈا نہ ہوگا۔ وہ اس باپ سے تو نہ آزاد ہوں گے۔ وہ اپنے آپ ہی بول اٹھی خواہ کچھ ہو میں بے گناہوں کا خون نہ ہونے دوں گی۔ اجلاس میں جا کر صاف صاف کہہ دوں گی کہ

گنہگار میں ہوں، کیونکہ میرے بیٹے نے یہ خون کیا ہے۔ہم دونوں ہی قصوروار ہیں۔ دونوں کو پھانسی دیجیے۔ میں اپنے دھرم سے منحرف نہ ہوں گی۔خواہ میری آنکھوں کے سامنے ہی ونود کی بوٹی بوٹی کیوں نہ کر ڈالی جائے۔ ہاں! میں اپنی آنکھوں سے اس کو پھانسی پر چڑھتا ہوا دیکھوں گی کیونکہ میں نے اس کو جنم دیا ہے۔

بھگوان! مجھے طاقت دو کہ اپنے فرض پر ڈٹی رہوں۔ میں پاپن ہوں ہتیاری ہوں۔

رامیشوری بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

(۵)

جب رامیشوری کو ہوش آیا تو اس کا ارادہ مستحکم ہو چکا تھا، مگر دلی تکلیف ہو رہی تھی۔ کیا اس لیے بیٹے کو جنم دیا تھا، اسی لیے پالا پوسا تھا کہ ایک دن اسے پھانسی پر چڑھتے دیکھوں گی۔ ونود اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ آج اسی ونود سے اس کا ناتا ٹوٹ رہا ہے۔ ونود کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ ایک دن یہ ہے کہ اسے پھانسی دلانے جا رہی ہے۔ ونود کی کتابیں اور کپڑے کمرے میں رکھے تھے۔ اس نے ایک ایک چیز کو چھاتی سے لگایا۔ آہ! فرض کا راستہ کس قدر دشوار گزار ہے۔ ونود کو آخری بار گلے لگانے اور اس کا آخری بوسہ لینے کے لیے اس کا دل بے چین ہو گیا۔ کیا لڑکے کو سزا دیتے ہوئے ماں محبت چھوڑ دیتی ہے؟

رامیشوری، ونود کو سزا دینے جا رہی تھی، جوش محبت سے بھری ہوئی۔

(۶)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ پولیس نے سازش کا پتا لگا لیا۔ شہر کے دس نوجوان گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں میں سے ایک سرکاری گواہ بھی بن گیا اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ دائر ہو گیا۔

ونود کا اسی دن سے پتا نہ تھا۔ رامیشوری محبت اور فرض کے درمیان اس کشتی کی مانند ڈانو ڈول ہو رہی تھی جس کے اوپر طوفانی آسمان ہو اور نیچے طوفانی سمندر! کبھی فرض کلیجے کو مظبوط کر دیتا، کبھی محبت دل کو کمزور کر دیتی۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے تھے، فرض پسپا ہوتا جاتا تھا۔ نئی نئی دلیلیں اس کے احساسِ فرض کو کمزور کرتی جاتی تھیں۔ جب تمام کام ایشور کی مرضی سے ہوتا ہے تو اس میں بھی اس کی مرضی ہوگی۔ یہی سب سے زبردست دلیل تھی۔ اس سات دنوں میں اس نے صرف پانی پی کر دن کاٹے تھے اور وہ پانی بھی آنکھوں کے

راستے نکل جاتا تھا۔ ایسی ہوگئی تھی جیسے برسوں کی مریضہ۔

دس بجے کا وقت تھا۔ وہ کانگریس کے دفتر کی طرف چلی۔ اسی وقت وہ روزانہ ایک بار ونود کا پتا لینے کے لیے یہاں آیا کرتی تھی۔

ناگہاں اس نے نو دس نوجوانوں کو ہتھکڑیاں پہنے ایک درجن مسلح پولیس کے سپاہیوں کے پنجے میں گرفتار دیکھا۔ پیچھے تھوڑی دور پر کچھ مرد عورت سر جھکائے رنج و یاس کی تصویر بنے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔

رامیشوری نے دوڑ کر ایک سپاہی سے پوچھا، ''کیا یہ کانگریس کے آدمی ہیں؟''

سپاہی نے کہا، ''کانگریس کے سوا انگریزوں کو کون مارے گا؟''

''کون مارا گیا ہے؟''

''ایک پولیس کے سارجنٹ کو ان سب نے قتل کر دیا۔ آج آٹھواں دن ہے۔''

''کانگریس کے آدمی ہتھیا نہیں کرتے۔''

''قصور نہ ثابت ہوگا تو آپ چھوٹ جائیں گے۔''

رامیشوری دم بھر وہیں کھڑی رہی۔ پھر انھیں لوگوں کے پیچھے پیچھے کچہری کی طرف چلی۔ فرض یہ نئی طاقت پا کر سنبھل گیا۔ نہیں! وہ اتنے بے قصور نوجوانوں کو موت کے منہ میں نہ جانے دے گی۔ اپنے خونی بیٹے کی حفاظت کے لیے اتنے بے گناہوں کا خون نہ ہونے دے گی۔

(۷)

کچہری میں بہت بڑا مجمع تھا۔ رامیشوری نے ایک اردلی سے پوچھا، ''کیا صاحب آگئے؟''

اس نے جواب دیا، ''ابھی نہیں آئے۔ آتے ہی ہوں گے۔''

''بہت دیر سے آتے ہیں، بارہ تو بجے ہوں گے۔''

اردلی نے جھنجلا کر کہا، ''تو کیا وہ تمھارے نوکر ہیں کہ جب تمھاری مرضی ہو، آکر بیٹھ جائیں، بادشاہ ہیں جب مرضی ہوگی آئیں گے۔''

رامیشوری چپ ہوگئی۔ اس کے پاس ہی کئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک نے پوچھا، ''کیوں بہن! تمھارے گھر کا بھی کوئی لڑکا پکڑا گیا ہے؟''

رامیشوری اپنی فکروں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ نہ بولی۔ اس عورت نے پھر کہا، ''کیا کہوں نہ جانے کس پاپی نے خون کیا۔ آپ تو منہ میں سیاہی لگا کر چھپ رہا اور ہم لوگوں کے متھے گئی۔''

کئی عورتیں رو رہی تھیں۔ رامیشوری بھی رونے لگی۔

ایک ضعیف عورت اسے سمجھانے لگی، ''بہن چپ ہو جاؤ۔ جو ہماری قسمت میں لکھا ہے وہی ہوگا۔ میرا بیٹا بلکل بے قصور پکڑا گیا ہے۔ کانگریس میں کام کرتا تھا۔ تمھارا کون گرفتار ہے؟''

رامیشوری نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ بار بار لوگوں سے پوچھتی تھی، ''صاحب کب تک آئیں گے؟'' دو بجے صاحب کی موٹر آئی۔ اجلاس میں ہلچل مچ گئی۔

جوں ہی صاحب کرسی پر بیٹھے سرکاری وکیل نے یہ خون کا مقدمہ پیش کر دیا۔ پولیس کے افسر آ گئے۔ ملزم بھی سامنے کھڑے کر دیے گئے۔

عین اسی وقت رامیشوری نے اجلاس کے روبرو آ کر سلام کیا اور صاف لفظوں میں بولی، ''حضور! اس مقدمے کو پیش ہونے سے پہلے میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔''

سب کے سب اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

صاحب نے اس کی طرف تیز نگاروں سے دیکھ کر کہا، ''کیا بات ہے؟''

رامیشوری، ''میں اس لیے آپ کے سامنے آئی ہوں کہ اس مقدمے کا سچا حال بیان کروں، سارجنٹ کا خون کرنے والا میرا بیٹا ہے۔ یہ تمام ملزم بے گناہ ہیں۔

صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا، ''تم اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟''

رامیشوری نے کہا، ''میں اپنے ہوش میں ہوں اور بلکل سچ کہتی ہوں، سارجنٹ کو میرے بیٹے نے مارا ہے۔ اسکا نام ونود بہادری ہے میرے گھر میں اس کا فوٹو رکھا ہوا ہے۔ وہ اسی دن سے لاپتا ہو گیا ہے۔ میں اپنے ہوش میں ہوں، اپنے بیٹے سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں اسے اسی طرح پیار کرتی ہوں جیسے ہر ایک بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے کو۔ ایک ہفتے پیشتر وہی میرا سب کچھ تھا لیکن جب میرے ہر چند منع کرنے پر بھی اس نے یہ خون کیا تو میں نے سمجھ لیا میرے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس کی جان بچانے کے لیے میں اتنے گھر برباد نہ ہونے دوں گی۔ میری ان بہنوں کو بھی تو اپنی اولاد اتنی ہی پیاری ہے۔ انھیں بے اولاد والی نہیں بنانا چاہتی۔ میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا۔ انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

کمرے میں ہلچل مچ گئی۔ مرد عورد سب نے رامیشوری کو چاروں طرف سے گھر لیا۔ کئی عورتیں اس کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ اپنی خوشی میں کسی کو اس بات کا خیال نہ رہا کہ اس بدنصیب کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ بے حس و حرکت درمیان میں کھڑی تھی۔ نہ کچھ سوجھتا تھا نہ کچھ سنائی دیتا تھا۔ بس ونود کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔

یکا یک مجمع میں سے ایک آدمی نکل کر رامیشوری کے سامنے آیا اور اس کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ رامیشوری چیخ مار کر گر پڑی اور حملہ آور کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ارے تو ہے ونود!''

اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکلے اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

☆☆☆

راجندر سنگھ بیدی

بھولا

میں نے مایا کو پتھر کے ایک کوزے میں مکھن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹاس کو دُور کرنے کے لئے مایا نے کوزے میں پڑے ہوئے مکھن کو کنوئیں کے صاف پانی سے کئی بار دھویا۔ اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی بات عموماً مایا کے کسی عزیز کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ ہاں! اب مجھے یاد آیا۔ دو دن کے بعد مایا کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لئے آنے والا تھا۔ یوں تو اکثر بہنیں بھائیوں کے ہاں جا کر انھیں راکھی باندھتی ہیں۔ مگر مایا کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لئے خود ہی آجایا کرتا تھا اور راکھی بندھوالیا کرتا تھا۔ راکھی بندھوا کر وہ اپنی بیوہ بہن کو یہی یقین دلاتا تھا کہ اگر چہ اس کا سُہاگ لُٹ گیا ہے مگر جب تک اس کا بھائی زندہ ہے، اس کی رکھشا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے۔

ننھے بھولے نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ گنا چوستے ہوئے اس نے کہا:

''بابا! پرسوں ماموں جی آئیں گے نا؟

میں نے اپنے پوتے کو پیار سے گود میں اُٹھالیا۔ بھولے کا جسم بہت نرم و نازک تھا اور اس کی آواز بہت سُریلی تھی۔ جیسے کنول کی پتیوں کی نزاکت اور سپیدی، گلاب کی سرخی اور بلبل کی خوش الحانی کو اکٹھا کر دیا گیا ہو۔ اگر چہ بھولا میری لمبی اور گھنی داڑھی سے گھبرا کر مجھے اپنا منہ چومنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ تاہم میں نے زبردستی اس کے سُرخ گالوں پر پیار کی مہر ثبت کر دی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا:

''بھولے، تیرے ماموں جی...... تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں؟

بھولے نے تامل کے بعد جواب دیا ''ماموں جی!''

مایا نے استوتر پڑھنا چھوڑ دیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ میں اپنی بہو کے اس طرح کھل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ مایا بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتا تھا۔ میں بارہا مایا کو اچھے کپڑے پہننے، ہنسنے کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پروانہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ مگر مایا نے از خود

اپنے سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کر لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے ارز یورات کی پٹاری ایک صندوق میں منتقل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی تھی۔

مایا نے ہنستے ہوئے اپنا پاٹھ جاری رکھا۔

ہری ہر، ہری ہر، ہری ہر، ہری
میری بار کیوں دیر اتنی کری

پھر اس نے اپنے لال کو پیار سے بلاتے ہوئے کہا:

''بھولے......تم ننھی کے کیا ہوتے ہو؟''

''بھائی!'' بھولے نے جواب دیا۔

''اسی طرح تیرے ماموں جی میرے بھائی ہیں۔''

بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ایک ہی شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماموں ہو سکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ اس کے ماموں جان اس کے بابا جی کے بھی ماموں جی ہیں۔ بھولے نے اس مخمصے پر پڑنے کی کوشش نہ کی اور اُچک کر ماں کی گود میں جا بیٹھا اور اپنی ماں سے گیتا سننے کے لئے اصرار کرنے لگا۔ وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا اور گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سن کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اور پھر جوہڑ کے کنارے اُگی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں ان مہاتموں پر غور کیا کرتا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھ میل دور اپنے مزارعوں کو ہل پہنچانے تھے۔ بوڑھا جسم، اس پر مصیبتوں کا مارا ہوا، جوانی کے عالم میں تین تین من، بوجھ اٹھا کر دوڑا کیا۔ مگر اب بیس سیر بوجھ کے نیچے گردن چٹخنے لگتی ہے۔ بیٹے کی موت نے امید کو یاس میں تبدیل کر کے کمر توڑ دی تھی۔ اب میں بھولے کے سہارے ہی جیتا تھا۔ ورنہ دراصل تو مر چکا تھا۔

رات کو میں تکان کی وجہ سے بستر پر لیٹے ہی اونگھنے لگا۔ ذرا توقف کے بعد مایا نے مجھے دودھ پینے کے لئے آواز دی۔ میں اپنی بہو کی سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا، اور اُسے سینکڑوں دُعائیں دیتے ہوئے میں نے کہا:

''مجھ بوڑھے کی اتنی پروانہ کیا کرو بیٹا۔''

............بھولا ابھی تک نہ سویا تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میرے پیٹ پر چڑھ گیا۔ بولا:

''بابا جی! آپ آج کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟''

''نہیں بیٹا'......میں نے آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہا:''میں آج بہت تھک گیا ہوں......کل دوپہر کو تمھیں سُناؤں گا۔''

بھولے نے روٹھتے ہوئے جواب دیا۔''میں تمھارا بھولا نہیں بابا۔میں ماتاجی کا بھولا ہوں۔''

بھولا بھی جانتا تھا کہ میں نے اس کی ایسی بات کبھی برداشت نہیں کی۔میں ہمیشہ اس سے یہی سننے کا عادی تھا کہ''بھولا باباجی کا ہے اور ماتاجی کا نہیں۔'' مگر اس دن ہلوں کو کندھے پر اُٹھا کر چھے میل تک لے جانے اور پیدل ہی واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔شاید میں اتنا نہ تھکتا۔اگر میرا نیا جوتا ایڑی کو نہ دباتا اور اس کی وجہ سے میرے پاؤں میں ٹیسیں نہ اُٹھتیں۔اس غیر معمولی تھکن کے باعث میں نے بھولے کی وہ بات بھی برداشت کی۔میں آسمان پر ستاروں کو دیکھنے لگا۔آسمان کے جنوبی گوشے میں ایک ستارہ مشعل کی طرح روشن تھا۔غور سے دیکھنے پر وہ مدھم سا ہونے لگا۔میں اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

صبح ہوتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ بھولا سوچتا ہوگا کہ کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کی؟ میں اس خیال سے لرز گیا کہ بھولے کے دل میں کہیں خیال نہ آیا ہو کہ اب بابا میری پروا نہیں کرتے شاید یہی وجہ تھی کہ صبح کے وقت اس نے میری گود میں آنے سے انکار کر دیا اور بولا:

''میں نہیں آؤں گا......تیرے پاس بابا!''

''کیوں بھولے؟''

''بھولا باباجی کا نہیں......بھولا ماتاجی کا ہے۔''

میں نے بھولے کو مٹھائی کے لالچ سے منایا اور چند ہی لمحات میں بھولا باب جی کا بن گیا اور میری گود میں آ گیا۔اور اپنی ننھی ٹانگوں کے گرد میرے جسم سے لپٹے ہوئے کمبل کو لپیٹنے لگا۔مایا ہری ہر استوتر پڑھ رہی تھی۔پھر اس نے پاؤ بھر مکھن نکالا اور اسے کوزے میں ڈال کر کنوئیں کے صاف پانی سے چھاچھ کی کھٹاس کو دھو ڈالا۔اب مایا نے اپنے بھائی کے لئے سیر کے قریب مکھن تیار کرلیا۔میں بہن بھائی کے اس پیار کے جذبے پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔اتنا خوش کہ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔میں نے دل میں کہا:عورت کا دل محبت کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ماں،باپ،بھائی بہن،خاوند بچے،سب سے وہ بہت پیار کرتی ہے اور اتنا کرنے پر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ایک دل کے ہوتے ہوئے بھی وہ سب کو اپنا دل دے دیتی ہے۔بھولے نے دونوں ہاتھ میرے گالوں کی جھریوں پر رکھے،مایا کی طرف سے چہرے کو ہٹا کر اپنی طرف کرلیا اور بولا:

''باباتمھیں اپنا وعدہ یاد ہے نا......؟''

''کس بات کا...... بیٹا؟''

''تمھیں آج دوپہر کو مجھے کہانی سنانی ہے۔''

''ہاں بیٹا......!''میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

یہ تو بھولا ہی جانتا ہوگا کہ اس نے دوپہر کے آنے کا کتنا انتظار کیا۔ بھولے کو اس بات کا علم تھا کہ بابا جی کے جہانی سنانے کا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ کھانا کھا کر اس پلنگ پر جا لیٹتے ہیں جس پر وہ بابا جی یا ماتا جی کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ وقت سے آدھ گھنٹہ بیشتر ہی اس نے کھانا نکلوانے پر اصرار شروع کر دیا۔ میرے کھانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے کہانی سننے کے چاؤ سے۔

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے کھانا کھایا۔ ابھی آخری نوالہ میں نے توڑا ہی تھا کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہلکی سی جریب تھی۔ اس نے کہا کہ خانقاہ والے کنوئیں پر آپ کی زمین کو ناپنے کے لئے مجھے آج ہی فرصت مل سکتی ہے، پھر نہیں۔

دالان کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا، بھولا چارپائی کے چاروں طرف گھوم کر بستر بچھا رہا تھا۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے ایک بڑا سا تکیہ بھی ایک طرف رکھ دیا اور خود پائینتی میں پاؤں اڑا کر چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ بھولے کا مجھے اصرار سے جلد روٹی کھلانا اور بستر بچھا کر میری تواضع کرنا اپنی خودغرضی پر مبنی تھا تاہم میرے خیال میں آیا۔۔۔

''آخر مایا ہی کا بیٹا ہے نا......ایشور اس کی عمر دراز کرے۔''

میں نے پٹواری سے کہا کہ تم خانقاہ والے کنوئیں کو چلو اور میں تمھارے پیچھے پیچھے آ جاؤں گا۔ جب بھولے نے دیکھا کہ میں باہر جانے کے لئے تیار ہوں تو اس کا چہرہ اس طرح مدھم پڑ گیا۔ جس طرح شب کو آسمان کے ایک کونے میں مشعل کی مانند روشن ستارہ مسلسل دیکھتے رہنے کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا۔ مایا نے کہا:

''بابا جی، اتنی بھی کیا جلدی ہے؟......خانقاہ والا کنواں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا......آپ کم سے کم آرام تو کر لیں۔''

''اوہوں۔''میں نے زیرِ لب کہا''پٹواری چلا گیا تو پھر یہ کام ایک ماہ سے ادھر نہ ہو سکے گا۔''

مایا خاموش ہوگئی۔ بھولا منہ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ اس نے کہا:

''بابا میری کہانی......میری کہانی......''

''بھولے......میرے بچے۔''میں نے بھولے کو ٹالتے ہوئے کہا''دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ

بھول جاتے ہیں۔''

''راستہ بھول جاتے ہیں؟'' بھولے نے سوچتے ہوئے کہا'' بابا تم جھوٹ بولتے ہو......میں نے بابا جی کا بھولا نہیں بننا۔''

اب جب کہ میں تھکا ہوا بھی نہیں اور پندرہ بیس منٹ آرام کے لئے نکال سکتا تھا۔ بھلا بھولے کی اس بات کو آسانی سے کس طرح برداشت کر لیتا۔ میں نے اپنے شانے سے چادر اُتار کر چار پائی کی پائینتی پر رکھی اور اپنی دبتی ہوئی ایڑی کو جوتی کی قید با مشقت سے نجات دلاتے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ بھولا پھر اپنے بابا کا بن گیا۔ لیٹتے ہوئے میں نے بھولے سے کہا:

''اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے......تو اس کے تم ذمے دار ہو۔''

اور میں نے بھولے کو دوپہر کے وقت سات شہزادوں اور سات شہزادیوں کی ایک لمبی کہانی سُنائی۔ کہانی میں ان کی باہمی شادی کو میں نے معمول سے زیادہ دل کش انداز میں بیان کیا۔ بھولا ہمیشہ اس کہانی کو پسند کرتا تھا۔ جس کے آخر میں شہزادہ اور شہزادی کی شادی ہو جائے۔ مگر میں نے اس روز بھولے کے منہ پر خوشی کی کوئی علامت نہ دیکھی بلکہ وہ ایک افسر سا منہ بنائے خفیف طور پر کانپتا رہا۔

اس خیال سے کہ پٹواری خانقاہ والے کنوئیں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گاؤں کا رُخ نہ کر لے۔ میں جلدی جلدی مگر اپنے نئے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ گو مایا نے جوتی کو سرسوں کا تیل لگایا تھا۔ تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی تھی۔

شام کو جب میں واپس آیا تو میں نے بھولے کو خوشی سے دالان سے صحن میں اور صحن سے دالان میں کودتے پھاندتے دیکھا۔ وہ لکڑی کے ایک ڈنڈے کو گھوڑا بنا کر اسے بھگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''چل ماموں جی کے دیس......رے گھوڑے، ماموں جی کے دیس۔

ماموں جی کے دیس، ہاں ہاں! ماموں جی کے دیس۔ گھوڑے......''

جوں ہی میں نے دہلیز میں قدم رکھا۔ بھولے نے اپنا گانا ختم کر دیا اور بولا۔

''بابا......آج ماموں جی آئیں گے نا......؟''

''پھر کیا ہوگا بھولے......؟'' میں نے پوچھا۔

''ماموں جی اگن بوٹ لائیں گے۔ ماموں جی کلّو (کتا) لائیں گے۔ ماموں جی کے سر پر مکی کے بھُٹوں کا ڈھیر ہوگا نا بابا......ہمارے یہاں تو مکی ہوتی ہی نہیں بابا۔ اور تو اور ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ

دیکھی ہوگی۔''

میں حیران تھااور سوچ رہا تھا کہ کس خوبی سے ''خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی'' کے الفاظ سات شہزادوں اور سات شہزادیوں والی کہانی کے بیان میں سے اس نے یاد رکھے تھے۔ ''جیتا رہے'' میں نے دعا دیتے ہوئے کہا'' بہت ذہین لڑکا ہوگا اور ہمارے نام کو روشن کرے گا۔''

شام ہوتے ہی بھولا دروازے میں جا بیٹھا تا کہ ماموں جی کی شکل دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑے اور پہلے پہل اپنی ماتا جی کو اور پھر مجھے اپنے ماموں جی کے آنے کی خبر سنائے۔

دئیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا، دیئوں کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔ متفکرانہ لہجے میں مایا نے کہا۔

''بابا جی بھیا ابھی تک نہیں آئے۔''

''کسی کام کی وجہ سے ٹھہر گئے ہوں گے۔''

''ممکن ہے کوئی ضروری کام آ پڑا ہو۔ راکھی کے روپے ڈاک میں بھیج دیں گے۔''

''مگر راکھی؟''

''ہاں راکھی کی کہو۔۔۔انھیں اب تک تو آ جانا چاہئے تھا۔''

میں نے بھولے کو زبردستی دروازے کی دہلیز پر سے اٹھایا۔ بھولے نے اپنی ماتا سے بھی زیادہ متفرانہ لہجے میں کہا:'' ماتا جی...... ماموں جی کیوں نہیں آئے؟''

مایا نے بھولے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے کہا'' شاید صبح کو آ جائیں تیرے ماموں جی میرے بھولے!''

پھر بھولے نے اپنے نرم و نازک بازوؤں کو اپنی ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا:

''میرے ماموں جی تمھارے کیا ہوتے ہیں؟''

''جو تم ننھی کے ہو۔''

''بھائی؟''

''تم جانو......''

''اور بنسی (بھولے کا دوست) کے کیا ہوتے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں......''

’’بھائی بھی نہیں؟‘‘

’’نہیں......‘‘

اور بھولا اس عجیب بات کو سوچتا ہوا سو گیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو پھر وہ مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں میرے گھورنے کی وجہ سے ماند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے پھر بھولے کا چہرہ یاد آ گیا جو میرے خانقاہ والے کنوئیں کو جانے پر تیار ہونے کی وجہ سے یوں ہی ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے بھولے کو کہانیاں سننے کا۔ وہ اپنی ماں کو استوتر بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ اتنا بچہ بھلا گیتا کو کیا سمجھے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس کے ادھیائے کا مہاتم ایک دل چسپ کہانی ہوتا ہے۔ وہ نہایت صبر سے ادھیائے کے ختم ہونے اور مہاتم کے شروع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہے۔

’’مایا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ شاید نہ آئے۔‘‘ میں نے دل میں کہا۔ ’’اسے اپنی بہن کا پیار سے جمع کیا ہوا مکھن کھانے کے لئے تو آ جانا چاہئے تھا۔‘‘ میں ستاروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا۔ یکا یک مایا کی آواز سے میری نیند کھلی۔ وہ دودھ کا کٹورا لئے کھڑی تھی۔

’’میں نے کئی بار کہا ہے، تم میرے لئے اتنی تکلیف نہ کیا کرو‘‘ میں نے کہا۔

دودھ پینے کے بعد فرطِ شفقت سے میرے آنسو نکل آئے۔ حد سے زیادہ خوش ہو کر میں مایا کو یہی دعا دے سکتا تھا کہ وہ سُہاگ وتی رہے۔ کچھ ایسا ہی میں نے کہنا چاہا۔ مگر اس خیال کے آنے سے کہ اس کا سہاگ تو برس ہوئے لُٹ گیا تھا۔ میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے اپنی رقت کو دباتے ہوئے کہا۔

’’بیٹی...... تمھیں اس سیوا کا پھل ملے بغیر نہ رہے گا۔‘‘

پھر میرے پہلو میں بچھی ہوئی چار پائی پر سے بھولا ننھی کو جو کہ اس کے ساتھ ہی سو رہی تھی، پرے دھکیلتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھا۔ اُٹھتے ہی اس نے کہا۔

’’بابا۔۔ ماموں جی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟‘‘

’’آ جائیں گے...... بیٹا۔ سو جاؤ۔ وہ سویرے آ جائیں گے۔‘‘

اپنے بیٹے کو اپنے ماموں کے لئے اس قدر بے تاب دیکھ کر مایا بھی کچھ بے تاب سی ہو گئی۔ عین اس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھولے کو لٹا کر تھپکنے لگی۔

مایا کی آنکھوں میں بھی نیند آنے لگی۔ یوں بھی جوانی میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے، اور پھر دن بھر کام کاج کر کے تھک جانے کی وجہ سے مایا گہری نیند سوتی تھی۔ میری نیند تو عام بوڑھوں کی سی نیند تھی۔ کبھی ایک آدھ گھنٹے تک سو لیتا

۔پھر دو گھنٹے جاگتا رہتا۔ پھر کچھ دیر اونگھنے لگ جاتا اور باقی رات اختر شماری کرنے گزار دیتا۔ میں نے مایا کو سو جانے کے لئے کہا اور بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔

''بتی جلتی رہنے دو۔ صرف دھیمی کر دو۔ میلے کی وجہ سے بہت سے چور چکا ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔'' میں نے سوئی ہوئی مایا سے کہا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس دفعہ میلے پر جو لوگ آئے تھے ان میں ایسے آدمی بھی تھے جو کہ ننھے ننھے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ پڑوس کے ایک گاؤں میں دو ایک ایسی وارداتیں ہوئی تھیں اور اسی لئے میں نے بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ بھولا جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بتی کو دیوار پر نہ دیکھا۔ گھبرا کر ہاتھ پسارا تو میں نے دیکھا کہ بھولا بھی بستر پر نہ تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح در و دیوار سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے تمام چارپائیوں پر دیکھا۔ مایا کو بھی جگایا۔ گھر کا کونا کونا چھانا۔ بھولا کہیں نہ تھا۔!

''مایا ہم لُٹ گئے۔'' میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

مایا ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا یہ کوئی اسی سے پوچھے اپنے سُہاگ لُٹنے پر اس نے اتنے بال نوچے تھے جتنے کہ اس وقت نوچے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں شور سن کر جمع ہو گئیں اور بھولے کی گم شدگی کی خبر سُن کر رونے پیٹنے لگیں۔

میں عورتوں سے زیادہ پیٹ رہا تھا۔ آج میں نے ایک بازی گر کو اپنے گھر کے اندر گھورتے بھی دیکھا تھا۔ مگر میں نے پروا نہیں کی تھی۔ آہ! وہ وقت کہاں سے ہاتھ آئے۔ میں نے دعائیں کیں کہ کسی وقت کا دیا کام آ جائے۔ منتیں، مانیں کہ بھولا مل جائے۔ وہی گھر کا اُجالا تھا۔ اسی کے دم سے میں اور مایا جیتے تھے۔ اسی کی آس سے ہم اُڑے پھرتے تھے۔ وہی ہماری آنکھوں کی بینائی، وہی ہمارے جسم کی توانائی تھا۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہ تھے۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ مایا بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ اندر کی طرف مُڑ گئے تھے۔ نسیں کھچی ہوئی اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور عورتیں اس کی ناک بند کر کے ایک چمچے سے اس کے دانت کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں سچ کہتا ہوں۔ ایک لمحے کے لئے میں بھولے کو بھی بھول گیا۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک ساتھ گھر کے دو بشر جب دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلے جائیں تو اس وقت دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے لرزتے ہوئے، ایشور کو بُرا بھلا کہا کہ ان دُکھوں کے دیکھنے سے بیشتر اس نے میری ہی جان کیوں نہ لے لی۔ آہ! مگر جس کی قضا آتی ہے اس کے سوا کسی اور کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

قریب تھا کہ میں بھی مایا کی طرح گر پڑوں، کہ مایا ہوش میں آ گئی۔ مجھے پہلے سے کچھ سہارا ملا۔ میں نے دل میں کہا۔ میں ہی مایا کو سہارا دے سکتا ہوں۔اور اگر میں خود اس طرح حوصلہ چھوڑ دوں تو مایا کسی طرح نہیں بچ سکتی میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا۔

''مایا بیٹی……دیکھو! مجھے یوں خانہ خراب مت کرو……حوصلہ کرو۔ بچے اغوا ہوتے ہیں مگر آخر مل بھی جاتے ہیں۔ بازی گر بچوں کو مارنے کے لئے نہیں لے جاتے۔ پال کر بڑا کر کے کسی کام میں لانے کے لئے لے جاتے ہیں۔ بھولا مل جائے گا۔''

ماں کے لئے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے بھی اپنے اطرح صبر کرنے پر گمان ہوا۔ گویا میں اس وجہ سے چپ ہو گیا ہوں کہ مایا کے مقابلے میں بھولے سے بہت کم پیار ہے۔مگر ''نہیں'' میں نے کہا۔''مرد کو ضرور کچھ حوصلہ دکھانا چاہئے۔''

اس وقت آدھی رات ادھر تھی اور آدھی اُدھر جب ہمارا پڑوسی اس حادثے کی خبر تھانے میں پہنچانے کے لئے، جو گاؤں سے دس کوس دور شہر میں تھا، روانہ ہوا۔

باقی ہم سب ہاتھ ملتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے۔تا کہ دن نکلنے پر کچھ سُجھائی دے۔

دفعتاً دروازہ کُھلا اور ہم نے بھولے کے ماموں کو اندر آتے دیکھا۔اس کی گود میں بھولا تھا۔اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکریاں اور ایک ہاتھ میں بتی تھی۔ ہمیں تو گویا تمام دنیا کی دولت مل گئی۔ مایا نے بھائی کو پانی پوچھا نہ خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر اسے چومنے لگی۔ تمام اڑوس پڑوس نے مبارک باد دی۔ بھولے کے ماموں نے کہا۔

''مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر رات کے اندھیرے میں'' میں اپنا راستہ گم کر بیٹھا تھا۔ یکا یک مجھے ایک طرف سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب بڑھا۔اس خوف ناک تاریکی میں پرس پور سے آنے والی سڑک پر بھولے کو بتی پکڑے ہوئے اور کانٹوں میں اُلجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اس وقت اس کے وہاں ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ بابا جی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سنائی تھی۔اور کہا تھا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا کہ تم راستہ بھول گئے ہو گے اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گئے ہو گے اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا تو تم ذمے دار ہو گے نا!!''

☆☆☆

ہمدوش

سطحی نظر سے تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ مرکزی شفاخانے کے ان لوگوں کو جن کی نگرانی میں بہت سے نا امید پُر امید مریض رہتے ہیں، مساوات پر بہت یقین ہے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کو بلا امتیاز مذہب وملت تیس تیس گرہ کے کھلے پائینچوں کا پاجامہ اور کھلے کھلے بازوؤں والی قمیص پہنا دیتے ہیں۔ جن سے ایک خاص قسم کی سوندھی سوندھی نامانوس سی بُو آتی ہے۔ قمیص گھٹنے سے بھی چھ گرہ اونچی ہوتی ہے۔ بعض وقت اتنی اونچی کہ ازار بند بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔ مرکزی شفاخانے اور مرکزی زندان خانے کے مکینوں کی وشش میں فرق ہی کیا ہے؟ یہی نا کہ شفاخانوں کے مکینوں کی پوشش قدرے مٹیالے رنگت کی مگر اُجلی ہوتی ہے۔ لیکن زندان خانے میں بسنے والے بدنصیبوں کو شاید ہی کبھی دھوبی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

شفاخانے میں ان تیس تیس گرہ کے کھلے پائینچوں اور ڈھیلی ڈھالی قمیصوں میں ڈھکے ہوئے بدن بھی ایک ہی ساخت کے ہوتے ہیں۔ جسمانی لحاظ سے کوئی قدرے فربہ یا کوئی بہت لاغر ہو تو ہو لیکن نہ پر ایک ہی سی زردی چھائی ہوتی ہے۔ ایک ہی خوف یا اندیشہ ہوتا ہے جو ہر ایک کے دل میں اضطراب پیدا کیا کرتا ہے۔

''کیا ہم موت کے اس غار سے زندہ سلامت گزر جائیں گے؟''

اور یہی سوچ ان غریبوں پر راتوں کی نیند حرام کر دیتی ہے۔ سورج ڈوبنے کو ہے۔ شفاخانے کے احاطے کی مرمت طلب دیوار پر ممولے کی مادہ اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لئے چونا کریدنے آتی ہے اور اسی وقت ان ہی تیس تیس گرہ کے کھلے پائینچوں اور ڈھیلی ڈھالی قمیصوں میں بے رنگ و روپ چہروں والے لوگ حکمِ امتناعی کے باوجود شفاخانے کے احاطے کی مرمت طلب دیوار پر تن درستی کا نظارہ کرنے آتے ہیں اور گھنٹوں حسرت کے عالم میں اس متحرک زندگی کا تماشا کرتے ہیں۔

شفاخانے کے سامنے ایک بساطی کی دوکان پر چند نوجوان لڑکیوں کا جمگھٹا ہے۔ ان کا رنگا رنگ ساڑھیوں کے پلے بے باکانہ طور پر سر سے اُڑ رہے ہیں۔ کوئی 'ہمانی' کی خریدار ہے، کوئی زینت، کی اور کوئی 'کوٹی' کی .... دوکان کے اوپر' چھت پر پرفیسر کی بیوی چق کے پیچھے اپنے لبوں پر سے لپ سٹک کی اُڑی ہوئی سرخی کو درست کرتے ہوئے دھندلی دُھندلی سی دکھائی دیتی ہے۔

میرا ساتھی عظیم الدین کھیڑا مغلی ۔۔کھیڑا مغل کا رہنے والا ہے۔ مغلی، پروفیسر کی حسین بیوی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اپنے کاربنکل بلکہ وجود تک کے احساس سے بے نیاز ہو کر کہتا ہے۔

''کیا اس کے لبوں پر سے سرخی اُڑ گئی تھی؟''

''دیکھتے نہیں، ابھی پروفیسر کے کمرے سے باہر آ رہی ہے اور۔۔''

''ہش ش......ہش'' ......اور ہمارا دوسرا ساتھی اشچر ج لال پھر ہمیں فنا کے عالم میں لے آتا ہے۔

سڑک پر ایک سبز اوپل کا پورے زور سے ہارن بجاتی ہوئی گزرتی ہے۔ اس میں بیٹھے ہوئے دو بوڑھوں کی نگاہیں تانگے میں جاتی ہوئی دلہن کی سرخ چوڑیوں میں پیوست ہیں اور دلہن کی نگاہیں سڑک کے کنارے پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر جم رہی ہیں۔

چند ایک اوباش چھوکرے اپنے مخصوص بے پروایانہ انداز سے 'پٹے' گاتے ہوئے سینما کی طرف لپکے جا رہے ہیں اور ان سے کچھ ہٹ کر سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے ایک سادھو مہاتما ہیں۔ جن کا ایک ایک قدم شانتی کے تجسس میں اٹھتا ہے وہ شانتی اور سکون جو کہیں نہیں ملتا............شفا خانے کے پھاٹک پر دو خوانچے والے گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ وہ دونوں بیک ساعت دروازے کے عین بغل میں اپنا خوانچہ رکھنا چاہتے ہیں............کمزور نے پیچھے ہٹ کر تنومند کو ایک پتھر مارا ہے۔

''ارے او بے صبر و قناعت لوگو! صحت کی اس تھوڑی سی خوشی سے جو تمھیں عاریتاً دی گئی ہے کیوں مستفیض نہیں ہوتے؟ ارے دیکھتے نہیں۔ ہم تمھارے بھائی کتنے حرماں نصیب ہیں؟''

''ہاں بھائی!...... یہ سب تن درستی کی باتیں ہیں۔'' اشچر ج لال کہتا ہے۔

''شاید ہم بھی تن درست ہو کر ایسا ہی کریں۔''

پھر کھیڑا مغلی اس قبرستان کی طرف جو شفا خانے کے قریب واقع ہے، دیکھ کر چونک اٹھتا ہے اور کہتا ہے۔

''کل ہمارے ہی کمرے میں......ساتویں چارپائی......اُف! میرا سر گھوم رہا ہے۔ مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے وہ قبرستان ہماری طرف آ رہا ہے۔''

''ہش......ش ش......'' میں اسے خاموش ہو جانے کے لئے کہتا ہوں'' ایسی بات نہ کہو بھائی۔''

لیکن یہ مغلی کے بس کی بات نہیں۔ وہ زور سے چھینکتا ہے۔ کاربنکل کے ساتھ اسے انفلوئنیز نے بھی آ دبایا ہے۔ اس کے بالکل زرد، بے رونق چہرے پر سُرخ دار رقیق لعاب سے بھری ہوئی ناک ایک عجیب، کریہہ منظر پیدا کر رہی ہے۔

لیکن پھر بھی ہمیں تن درستی کی دل چسپ حماقتیں محو کر ہی لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ پھر مغلی ایک خوف ناک انداز سے چھینکتا ہے اور بہت سے آبی، لعابی ذرات دھوپ کی کرنوں میں اڑنے لگتے ہیں۔ چھینکنے سے مغلی کی ریڑھ کی ہڈی پر زور پڑتا ہے اور وہ درد کے ایک شدید احساس سے کاربنکل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ جوں جوں درد کم ہوتا ہے اس کی مڑی ہوئی آنکھیں اور ہمارے رُکے ہوئے سانس آہستہ آہستہ واپس آتے ہیں۔ کچھ دم لینے کے بعد مغلی کہتا ہے۔

''بھائی......کیا ہم ان چوڑے والیوں، ان خوانچے والوں......مزدوروں کے ہمدوش چل سکیں گے؟''

''تم جی میلا نہ کرو مغلی۔ میں۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ تم بالکل تن درست ہو جاؤ گے۔ اشچر چ لال پہلے ہی روبصحت ہے۔لیکن میں ان لوگوں کے شانہ بشانہ کبھی نہیں چل سکوں گا، دیکھتے نہیں میری ٹانگ کو؟ بالکل گل ہی تو گئی ہے۔کاش! میں اس گداگر کے دوش بدوش چل سکوں مغلی۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں۔ چاہے اس کی طرح میری بھی ایک ٹانگ کاٹ لی جائے۔ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ صحت کی حالت میں اس احاطے کی دیوار کو پھاند سکوں۔''

اور یوں ان تن درست انسانوں کے ہمدوش چلنے کی ایک زبردستی خواہش کو پالتے ہوئے ہم اپنے اپنے کمروں کا رُخ کرتے ہیں اور ممولے کی مادہ جو کہ مٹی کے ایک ڈھیر پر بیٹھی ہمارے چلے جانے کا بڑی ہی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ پھر اسی مرمت طلب دیوار پر اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لئے چونا کُریدنے آتی ہے۔

جب پرندہ پرواز کے لئے پر تولتا ہے اور پنجے کا پچھلا حصہ زمین پر سے اٹھا کر نشست و پرواز کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ اسے صورتِ ناہض، کہتے ہیں۔ بیمار کے لئے صورتِ ناہض بیٹھنا معیوب اور بدشگونی کی علامت گنا جاتا ہے۔ ہاں! جو اس دنیا میں سے ایڑیاں اُٹھا کر فضائے عدم میں پرواز کرنا چاہے، وہ بیمار بلاخوف اس حالت میں بیٹھے۔ کھیڑا مغلی اسی طرح بیٹھا تھا۔ میں نے اسے یوں بیٹھنے سے منع کیا۔ اور ہمیں دروازے سے ''گرٹی'' آتے دکھائی دی۔

گرٹی ہماری نرس تھی۔ اس کا پورا نام مس گرٹروڈ بینسن GERTRUDE BENSON MISS) تھا۔ مگر ہم میں سے چند ایک دیرینہ مریض اس سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ اسے اس کے عیسائی نام سے بُلانے سے ذرہّ بھر بھی تامل نہیں کرتے تھے اور یہ چھوٹی سی رعایت گرٹی نے خود دے رکھی تھی، وہ مجھ پر عموماً اور کھیڑ مغلی پر خصوصاً مہربان تھی۔ مغلی کی اُجڈ گنوار وحرکتیں گرٹی کے لئے باعثِ تفریح تھیں۔ سُرخ کمبل کو ایک طرف سرکاتے ہوئے وہ اکثر مغلی کے پاس بیٹھ جاتی اور اس کے جہلمی تراش کے بالوں میں اپنی خوب صورت اُنگلیاں پھیرا کرتی۔

جتنا وہ مغلی کو پیار کرتی، اتنا ہی اسے وہم ہو جاتا کہ وہ سلامتی سے بعید ہے۔ وہ کہتا۔

''وہ محض میری دل جوئی کے لئے مجھ سے پیار کرتی ہے۔۔۔ مریض کو ہر ممکن طریقے سے خوش رکھنا ان کے پیشے کی خصوصیت ہے، اور پھر گرٹی میں جذبۂ رحم بھی تو بہت ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میرے دن بہت قریب ہیں اور پھر اس چہرے پر روکھا پھیکا تبسم بھی رقص نہ کرے گا۔''

''گرٹی!۔۔۔۔۔ گرٹی۔۔۔'' ہم دونوں نے پکارا۔

شفا خانے میں چند ایک مریض ایسے بھی تھے جنھیں کھانا گھر سے منگوا لینے کی اجازت تھی۔ ہم ان خوش نصیبوں میں سے نہیں تھے۔ ہمیں شفا خانے کی طرف سے بیماروں کی خاص خوراک ملتی تھی...... وہ خوش نصیب جب کھانا کھا کر چینی کے برتن دُور رکھ دیتے اور ان میں سالن کی زردی اور روغن کی چکناہٹ دکھائی دیتی تو ہمارا دل ہمیں بغاوت کے لئے اکساتا۔

گرٹی کے ہاتھ سے ہم نے کھانا چھینا۔ وہی روزمرہ کا کھانا۔ اگر بھوک نہ ہوتی تو اس کے کھانے سے ہمیں رتی بھر بھی رغبت نہیں رہی تھی۔ بہت سے دودھ میں تھوڑا سا گودا نہ تیرتا ہوا یوں دکھائی دیتا جیسے برسات کے پانی میں مینڈک کے سینکڑوں انڈے چھوٹے چھوٹے سیاہ داغوں کی صورت میں ایک جھلی میں لپٹے ہوئے تیرتے نظر آتے ہیں۔

ہم نے قحط زدہ لوگوں کے مخصوص اندا سے ایک ہی رکابی میں کھانا شروع کر دیا اور گرٹی کے کہنے کی مطلق پروا نہ کی۔ مریضوں کی تیمارداری کے لئے آئے ہوئے لوگ ہمیں گھورنے لگے۔

''ایک سکھ اور ایک مسلمان۔۔۔۔ ساتھ ساتھ نہیں، ایک ہی رکابی میں!''

وہ کیا جانیں کہ شفا خانے کے احاطے کی چار دیواری سے باہر سب کچھ ہے مگر یہاں کوئی ہندو ہے نہ مسلمان ،سکھ ہے نہ عیسائی، گوڑ برہمن اور نہ اچھوت۔۔۔ یہاں ایک ہی مذہب کے آدمی ہیں۔ جنھیں بیمار کہتے ہیں اور جن کی نجات شفا ہے، جس کے حصول کے لئے وہ اپنی تمام خواہشات اور رہی سہی قوت صرف کر ڈالتے ہیں۔

اس دن شام کو ہم نے پھر تن درست انسانوں کی دل چسپ حماقتوں کا تماشا کیا۔ وہی ہنگامے، وہی بے صبری۔۔۔۔ سامنے ایک ڈبل فلائی راؤٹی خیمہ کے نیچے چند ایک آدمی دعوت اڑا رہے تھے۔ ایک کونے میں چند بوتلیں کھلی پڑی تھیں۔ کبھی کبھی سوڈے کی 'بز' کی آواز آتی...... وہ لوگ ہنستے تھے، چلاتے تھے۔ کیلے اور سنگتروں کے چھلکے ایک دوسرے پر پھینک کر نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے اور اس دعوت کی تمام رونق قبرستان کے بے رونق پس منظر کی وجہ سے زیادہ بارونق دکھائی دے رہی تھی، بے شک! زندگی کی بہت سی خوشیاں موت کے پس منظر کی رہین

منت ہیں۔ جس طرح اخترِ شب کی درخشندگی رات کی سیاہی اور آسمان کے نیلے پن کی۔

کھیڑا مغلی نے یک بیک صورتِ ناہض سے اُٹھ کر ایک کانپتا ہوا پُر جوش ہاتھ میرے شانے پر رکھا اور مشکوک انداز سے بولا۔

''بھائی...... کیا ہم ان لوگوں کے ہمدوش ہو بھی سکیں گے؟''

میں کچھ دیر مبہوت کھڑا آسمان پر اُڑتی ہوئی چنڈولوں کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے مغلی سے لپٹے ہوئے کہا۔''ہاں...... مغلی، کیوں نہیں؟ لیکن تم اس طرح مت بیٹھا کرو۔''

پھر کچھ رُک رُک کر میں نے کہا۔

''کل میری ٹانگ کا اپریشن ہے...... گرٹی نے مجھے بتایا تھا۔ شاید آج یہ میری اور تمھاری آخری ملاقات ہو۔ تم ان لوگوں کے دوش بدوش چل سکو گے...... اشچر ج بھی شفا پا جائے گا...... لیکن میں}''

اور ہم دونوں چپ چاپ نمناک آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر کھیڑا مغلی نے ایک خوف ناک چھینک لی۔

دوسرے دن میری ٹانگ کاٹ لی گئی۔

پانچویں دن میری آنکھ کھلی۔ میں ہل جل نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیکھا، کھیڑا مغلی میری پائنتی پر بیٹھا زیرِ لب کچھ ورد کر رہا تھا۔ میری آنکھیں کھلتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔ میں نے اپنے بدن میں کچھ طاقت محسوس کرتے ہوئے اس سے لپٹنے کے لئے کانپتے ہوئے ہاتھ پھیلا دئے۔ میں اپنی ٹانگ کے دُکھ جانے سے بلبلا اُٹھا اور مغلی اپنے کاربنکل پر زور پڑنے سے!

مغلی کا کاربنکل اچھا ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں میں شفا پا کر ہسپتال سے چلا گیا۔ میری غیر حاضری میں میری رفیقِ زندگی فوت ہو چکی تھی۔ اب ایک شیشم کی، سخت سی دوہری لاٹھی میری رفیقِ زندگی بن گئی تھی۔ پہلی اور اس رفیقِ زندگی میں فرق صرف اتنا تھا، کہ وہ مجھے اپنی باتونی طبیعت سے نالاں رکھتی اور یہ اپنی خاموشی سے نالاں تر۔

اسی لاٹھی کو بغل میں دبائے میں آہستہ آہستہ کام پر چلا جاتا۔ مجھے اپنی ٹانگ کے کاٹے جانے کا چنداں افسوس نہ تھا۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ تن درست تو ہو گیا اور اپنی خواہش کے مطابق شفا خانے کے احاطے کی دیوار سے باہر۔

ایک دفعہ میں شفا خانے کے پاس سے گزرا تو میری روح تک لرز گئی۔ اس وقت میرے ساتھی اور بعد میں آئے ہوئے مریض حسرت بھری نگاہوں سے ہماری دل چسپ حماقتیں دیکھنے میں محو تھے۔ اور احاطے کی مرمت

طلب دیوار پر تین ممولے اپنی تین کاٹ کی دُموں کو تھر تھرا رہے تھے۔ میرے خیال میں بڑا ممولا چھوٹے ممولوں کی ماں تھی جو ہماری بیماری کے ایام میں اسی دیوار پر اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لئے چونا کریدنے آیا کرتی تھی۔

اس وقت میرے سوا ان مریضوں کی تکلیف کو کون جان سکتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کی مصیبت پر چند ایک آنسو بہائے۔ مجھے سامنے بساطی کی دُکان پر چند نوجوان لڑکیوں کا جمگھٹا دکھائی دیا۔ ان کی ساڑھیوں کے پلے اسی طرح بے باکانہ طور اُڑ رہے تھے۔ اور چھت پر حق کے پیچھے پروفیسر کی بیوی اپنی ساڑھی کی سلوٹوں کو درست کرتی ہوئی دھندلی دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں ایک مبہم سے احساس کے ساتھ بساطی کی دوکان کی طرف بڑھا اور وہاں سے کچھ رنگ دار، ریشمی فیتے لاٹھی کو سجانے کے لئے خریدے اور کچھ غیر مطمئن کھویا کھویا اور لڑکھڑاتا ہوا واپس لوٹا۔

ایک دن میں شفا خانے کے اندر گیا تو میں نے دیکھا، مغلی کا کاربنکل بہت حد تک ٹھیک ہو چکا تھا۔ ہاں! اشچرج کی حالت نازک اور ناقابلِ بیان تھی۔ اس کے بعد مجھے اپنے ایک افسر کے ساتھ چند ہفتوں کے لئے باہر جانا پڑا۔

میرے دل میں کئی بار خیال آیا۔ کھیڑا مغلی مجھے کتنا کوستا ہوگا۔ وہ تو پہلے ہی کہا کرتا تھا کہ انسان خود سُکھی ہو کر اپنے گزشتہ دُکھ اور دوسروں کی تکالیف کو عمداً بھول جایا کرتا ہے۔ ہر چند یہ بات درست تھی۔ مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے مجھ سے عائد نہ ہوتی تھی۔

واپس آنے پر فرصت کے ایک دن میں شفا خانے گیا۔

گرٹی نے ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ میں ڈر سے سہم گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اشچرج لال دو دن ہوئے مکمل شفا پا کر اجمیر چلا گیا۔ مگر گرٹی نے کھیڑا مغلی کی بابت کچھ نہ کہا۔

میں احتیاط سے قدم اُٹھاتا ہوا جنرل وارڈ کی طرف گیا۔ برآمدے کے نیچے شفا خانے کے ملازم چند ایک عورتوں اور بچوں کو بلند آواز سے رونے سے منع کر رہے تھے۔ ان عورتوں میں سے ایک کھیڑا مغلی کی ضعیفُ العمر اور نیم مُردہ ماں تھی جو اپنے بیٹے کی دائمی مفارقت کے غم میں فلک شگاف چیخیں مار رہی تھی۔ پھر اس کی بیوی بچے۔

برآمدے کے ایک طرف مغلی موت کی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ اسے یوں دیکھ کر میری بغل میں لاٹھی گر پڑی ...... میں رو بھی نہ سکا۔ لوگوں نے چپکے سے مغلی کی میت کو اٹھایا۔ اسے کندھوں کے برابر کیا اور کلمۂ طیب پڑھتے ہوئے لے چلے۔............

☆☆☆

من کی من میں

مادھو کی بیوی کو لوگ کلکارنی پکارتے تھے۔ اگر میں کچھ زیادہ نہیں بھولتا تو یہ نام گُلتارنی سے ہی بگڑ کر بنا تھا۔ مطلب گُل کی (ڈوبتی ہوئی) نیا کو پار لگانے والی۔ یہ پیارا دُلارا نام نہ صرف گُل کو لاج لگانے والی سے اختلاف ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ اس کا کچھ اور بھی گہرا مطلب ہے، جسے مادھو کے سوا کوئی کم ہی جان سکتا ہے۔ عین اس طرح جیسے موسیقی سے فضا میں تموج کے علاوہ ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے کچھ دل ہی سمجھ سکتا ہے اور پھر چوٹ کھایا ہوا دل!

سچ تو یہ ہے کہ یہ نام ہوتے ہی کچھ گورکھ دھندا سے ہیں۔ معلوم نہیں لوگ کیوں بعض وقت جنم کے اندھے کو 'نین سکھ' اور نپٹ گنوار و کو 'وِدّیا ساگر' کہہ دیتے ہیں۔

کئی دفعہ بھولا بھالا بچہ اچانک اپنی ماں سے سوال کر دیتا ہے کہ میں اس دنیا میں کہاں سے آیا تو ماں گھبرا کر جواب دیتی ہے۔ بیٹا! نرالی پورنما کے روز اندر بھگوان نے بہت سا مینہہ برسایا۔ اس وقت بہت سے بچے آکاش سے گرے تھے۔ ان میں سے ایک تم تھے۔ مجھے بہت من موہنے لگے اور میں نے تمھیں صحن میں سے اُٹھا لیا۔ یا کہتی ہے، تمھارا باپ ایک سو بیالیس گھنڈیوں والا جال لے کر رام تلائی یا شاہ بلور کے جوہڑ میں مچھلیاں پکڑنے گیا۔ وہاں نہ مچھلی تھی نہ کچھوا صرف جونکیں تھیں۔ ایک ننھا سا مینڈک عمرو جولا ہے کے گھر کے سامنے روئی کے گالے پر آرام سے بیٹھا ہوا برسات کی خوشی میں گا رہا تھا۔ وہ تمھیں تھے۔ تمھارا باپ تمھیں اٹھالا یا اور ہم نے پال لیا۔ کچھ ایسی ہی بات ہم نے مادھو کے متعلق بی سنی تھی کہ وہ چکنی مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا۔ ادھری ندیا میں طغیانی آنے پر مٹی کے ایک ڈھیلے نے رام تلائی کے مندر میں ٹھاکر جی کے چرنوں کو چھوا۔ مٹی، پانی اور ہوا تو پہلے ہی موجود تھے۔ آکاش اور آگ ملی تو بچہ بن گیا اور یہ سب کچھ ٹھاکر جی کی دیا سے ہوا۔ گلاب گڑھ کے تمام پرائمری پاس یا مڈل فیل آدمی اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ بھلا وہ اس بات کا جواب تو دیں کہ سیتا جی کس طرح کھیت میں دبائے ہوئے ایک گھڑے کو ہل کی ٹھوکر لگ جانے سے پیدا ہو گئیں؟ کرن جی کس طرح کُنتی جی کے کانوں کی میل سے بن گئے؟ رام چندر جی کے دوسرے بیٹے کُش کو کُشا یعنی گھاس سے کیسے بنا لیا گیا؟

اگرچہ مادھو مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا۔ پھر بھی اسے مٹی کا مادھو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک بہت

سمجھ دار آدمی تھا۔ اگر گھر کے آدمی اسے مٹی کا مادھو سمجھتے تھے تو سمجھا کرتے۔ گھر کا جوگی جوگڑا...... گھر والوں کو یہی شکایت تھی نا کہ مادھو گھر کا کام کاج کرنے کی بجائے دوسروں کا کام کر کے زیادہ خوش ہوتا تھا۔ اور حقیقت میں اس بات سے مادھو کی تعریف ہی کا پہلو نکلتا ہے۔

ہاں! کچھ مادھو کی صورت کے متعلق وہ قد کا گٹھیلا تھا اور جسم کا اکہرا، عمر یہی کوئی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے پر چیچک کے داغ، گورے رنگ سے گھی کھچڑی ہو رہے تھے۔ کلکارنی کی آنکھیں تو رسیلی تھیں ہی مگر مادھو کی زیادہ دور تک مار کرتی تھیں۔ قدرے باہر کو اُبھری ہوئی تھیں اتنی اُبھری ہوئی کہ سوتے میں درِفتنہ کی طرح ہمیشہ نیم باز رہتیں۔ گلاب گڑھ کے پرائمری اسکول کے منشی بھائی گریب داس جو کبھی کبھی شہر میں جا کر ایک آدھ ردّی سی فلم کے نظارے سے مستفیض ہو آیا کرتے تھے، مادھو کی آنکھوں کو 'پیا ملن کی آس' مار کہ آنکھیں کہا کرتے تھے اور ان کے ہونہار شاگرد اپنے اُستاد پر تضمین کرتے، یا بالکل تجدید کرتے ہوئے مادھو کو 'چمگادڑ نینا' کہتے تھے۔

کلکارنی زندگی کے روشن پہلو اور مادھو تاریک پہلو کو دیکھنے کا عادی تھا۔ دونوں میں ایک دل چسپ مگر خطرناک تضاد تھا۔ اس وجہ سے اکثر ان کی آپس میں ایک آدھ جھپٹ ہو جایا کرتی۔ مادھو کی قنوطیت اس درجہ نمایاں تھی کہ جو کوئی اسے بازار میں ملتا تو بجائے جے رام جی کے یا صاحب سلامت کے کہتا۔

''کہو بھئی مادھو من کی من میں رہی؟''

فنا کا نمائندہ اور قنوطیت کا علمبردار فی الفور ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا۔

''ہاں............ بھائی............ من کی من میں رہی!

اور اس قسم کا طریقۂ تخاطب کلکارنی کو سر سے پاؤں تک جلا دیتا۔ کیا کرتی وہ؟ گلاب گڑھ کے لوگ تو اس کی شادی سے پہلے ہی مادھو کو اس کی یاس پسندی کی وجہ سے یوں خطاب کرنے کے عادی تھے انھیں روکنا اس پودے کو موڑنے کے برابر تھا جو ایک خاصا تناور درخت بن چکا ہو۔ بہر حال وہ بہت ہی جھلّاتی اور جو کوئی مادھو کو یوں خطاب کرتا اگلے روز اس کی بیوی، ماں یا بہن سے کلکارنی کی لڑائی ہوتی اور کلکارنی جواب طلب کرتی۔ ''آخر اس من کی من میں رہی کا مطلب کیا؟''

مادھو کلکارنی کے اس احتجاج پر بہت خوش ہوتا۔ ڈفلی بجاتا اور کہتا۔

''میری زندگی کلکارنی کو کتنی پیاری ہے۔ کسی 'من کی من میں رہی' کہنے ہی نہیں دیتی۔ حالانکہ نہ اسے ہنسلی بنوا کر دی ہے اور نہ پازیب ارے تین مہینے سے تو سر پیٹ رہی ہے۔''

ایک دن میں نے مادھو کو یک بیک فلسفی بنتے دیکھا۔ منشی گریب داس کے سامنے وہ عورت کی محبت و مروّت

کوسراہ رہا تھا...... کنگرو کی قلانچ سے زیادہ عجیب، اُجڈ اور دیہاتی انداز...... اور کون نہیں بھانپ سکتا تھا کہ اس کا اشارہ کلکارنی کی طرف ہے۔اس کے لفظ تھے۔

''بھائی گریب داس اگر دنیا عورت کی بجائے آدمی کے پیٹ سے پیدا ہونے لگے تو دیا، پریم اور نرمی کا نام ہی نہ رہے۔عورت آدمی کو اپنی کوکھ سے جنم دے کر اس کے اکّھڑ پن کو دُور کر دیتی ہے۔''

کتنا حقیقت سے لبریز تھا مادھو کا عملی فلسفہ ایسی لاکھوں کی ایک سُن کر بھی جو مادھو کو مٹی کا مادھو کہے، کیا وہ خود مٹی کا مادھو نہیں ہے؟

بُرج والے کنویں کی بیڑ، جھرکل، ڈھول یا لٹھ ٹوٹتی ٹوٹ جائے گی، مگر مادھو اس کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ بیلوں کی جوڑی سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر اور کم سے کم چارہ ڈال کر اس کے مزارعے دو دو سو کے بیلوں کی جوگ کو ایسی ناکارہ بنا دیں گے، گلوشاہ کے بھرے میلہ میں ان کی قیمت پچاس روپے سے کوڑی نہ بڑھے گی۔گھر میں کسی خوشی یا غم کے موقع پر مادھو سے کسی قسم کی توقع بے کار ہوگی۔مگر وہ دوسروں کی مدد کے لئے کتنی جلدی لنگر لنگوٹا کسے گا گلاب گڑھ میں ایک بیوہ امبو رہتی تھی۔اس کے خاوند رُلیا کو مرے سات سال کے قریب ہوئے تھے۔اسی روز سے بے چاری اپنی عزت کو سنبھالے بیٹھی تھی۔اگر اسے سماج کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو بے چاری کبھی کی تباہ و برباد ہو چکی ہوتی۔مادھو کو اس کی مدد کرتا دیکھ کر لوگ کئی طرح کے بہتان لگاتے......طرح طرح کی باتیں بنا کر معصوم مادھو اور بدنصیب بیوہ کو بدنام کرتے۔سماج میں اتنی دَیا کہاں کہ جس چیز کو یہ خود دینے سے ہچکچاتی ہے۔اپنے کسی فرد کو دیتا دیکھے۔امبو کی مدد پر لوگوں کی مخالفت نے دونوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی اور اس مخالفت میں کلکارنی سب کی پیشوائی کرتی تھی۔

اگر یہ سچ ہے کہ کسی غیر مرد کا یوں بیوہ کی مدد کرنا پاپ ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ سماج کے دائرے میں رکھ کر ایسی شکستہ حال بیوہ کے رہے سہے گوشت پوست کو نوچ نوچ کر کھانا کوئی پاپ نہیں!

ایک دن مادھو کہیں باہر سے آیا۔وہ چہرے سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

''مجھے بیس، روپے دوگی......کارنی؟'' مادھو نے گاڑھے کی چادر کو شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا کروگے اتنے روپوں کو؟''

مادھو کو اسی سال کی توقع تھی۔کارنی کو اس بات کا وہم رہتا تھا کہ مادھو اپنی سخاوت پسند طبیعت کی وجہ سے بے جا روپیہ خرچ کرتا رہتا ہے اور اس کا عقیدہ تھا کہ جو آپ کھایا سو کھا، جو کھلایا سو گنوایا۔وہ روپیہ جمع بھی کرتی تو اس لئے کہ زندگی میں کبھی کام آئے گا۔گویا وہ ہمیشہ جیتی رہے گی۔۔۔اتنی لمبی آس اور شرادھ میں گئے گزروں کے نام پر

بہت سارو پیہ دان بھی کرتی ۔مگراس قسم کے دان سے مادھو متفق نہیں تھا۔

''کیا کرو گے ان روپوں کا؟''

اس سوال کا جواب مادھو نے پہلے ہی سے اپنے ذہن میں تراش رکھا تھا۔فوراً بولا۔

''چند دن ہی ہوئے،تو خود ہی ہنسلی اور پازیب کے لئے کہہ رہی تھی۔۔میں باہر جا رہا ہوں،بنوالاؤں گا۔''

کلکارنی اچھل پڑی۔بھلا ہنسلی اور پازیب کے لئے کون بیس روپے نہ دے گا۔وہ فوراً گندم کے ڈھیر میں چھپائی ہوئی ہانسلی اٹھالائی اور بیس کے پچیس روپے مادھو کی کمر میں بندھوا کر بولی:

سنو!کل سنکرانت ہے۔۔۔سنکرانت تمھارے بہو بیٹے کا پہلا تیوہار ہوگا۔ہو سکے تو سنار کے پاس ہی بیٹھ کر ہنسلی ڈھلوا لینا۔نہیں تو اس کے عوض کوئی اور ہی لے آنا۔۔۔پل کی پل پہن لوں گی۔جلدی آنا میں تیوہار منانے کا بندوبست کرلیا ہے۔''

مادھو نے کمر میں بندھی ہوئی ہانسلی پر ایک چُست سی صدری ڈالی اور چل دیا۔

سنکرانت بھی آ گئی ۔ اس دن سورج دھن راسی سے نکل کر مکر راسی میں داخل ہوتا ہے اس لئے اسے مکر سنکرانت کہتے ہیں۔سنکرانت کی دیوی نے سوائے مادھو کے پاپ کے گلاب گڑھ تو کیا تمام دُنیا میں سے پاپ کی بیج کنی کے لئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔سجی دھجی عورتیں تل،گڑ، بیر،امرود اور گنڈیریاں بانٹ رہی تھیں۔ پریم کے اس تبادلے کو'اوٹی بھرن' کہتے ہیں۔اوٹی بھرن کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ہماری زندگی میں ایک روح پھونک دینے والا پیغام دے رہی تھیں۔دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔''میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو۔''

چوں کہ مادھو کے بہو بیٹے کا پہلا تیوہار تھا۔دونوں کو صحن کے وسط میں ایک دھوتی اور ایک لنگوٹی بندھوا کر بٹھا دیا گیا۔جسم پر تیل اور دہی ملا گیا اس کے بعد بہو کی بہن نے بہو کو اور دولھا کی بہن نے دولھا کو سہیلے گاتے ہوئے نہلایا۔کونے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے چند پُرانے سے ناقوس اور نفریاں بجائیں۔دف پر چوٹ پڑی،کلکارنی نے سیندور،مصری اور ناریل بانٹا۔اس وقت مادھو کا بدھائی لینے کے لئے وہاں ہونا لازمی تھا۔مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔کلکارنی کو تو اپنی ہنسلی اور پازیب کی پڑی تھی۔ وہ رہ رہ کر مادھو کو کوستی اور اپنے گلے اور ایڑیوں کو ساڑھی کے پلوؤں سے چھپاتی۔۔۔کلکارنی جان گئی کہ سُنار نے ہنسلی بناتے ہوئے دیر لگا دی ہو گی۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا۔شاید مادھو میری زیادتیوں کی وجہ سے مجھ سے روٹھ گیا ہو۔کیوں کہ وہ جانتا تھا

کہ مکر سنکرانت کے دن روٹھے منائے جاتے ہیں۔مگر سیدھا سادا ماھوا تنے چھل بل کہاں جان سکتا تھا......سنار کے پاس آدمی دوڑا گیا تو پتہ چلا کہ مادھو وہاں پہنچا ہی نہیں۔

مادھو کی ڈھنڈیا پٹی۔کوئی بچہ تھوڑے ہی تھا کہ راستہ بھول جاتا۔کلکارنی کی تشویش بڑھی۔اس نے چاروں طرف آدمی بھیجے۔اس میں شک نہیں کہ مادھو نے گھر کلی پر کلکارنی سی ہوشیار عورت کو سونپ رکھا تھا۔مگر وہ اتنا بے مہر نہیں تھا کہ اپنے بہو بیٹے کے پہلے تیوہار کے شگن منانے سے احتراز کرتا۔

شام تک مادھو پہنچا نہ کلکارنی کی ہنسلی اور پازیب۔کلکارنی کا غصہ اور فکر دونوں سرعت سے بڑھنے لگے۔

جب شام کو دیئوں کو دیا سلائی دکھائی گئی تو عورتیں سب کی سب ایک ایک کر کے رخصت ہوگئیں۔پہلے شور غوغا سے آشنا کان برابر کی خاموشی پا کر شائیں شائیں کرنے لگے۔اس وقت کلکارنی کے کانوں میں ایک دھیمی سی آواز آئی۔اس کا پڑوسی بنجارہ کہہ رہا تھا۔

''کہو بھائی...... مادھو من کی من میں رہی؟''

جواب میں ایک مُردہ سی آواز آئی۔''ہاں بھائی! من کی من میں رہی!''

اب تک تو کلکارنی کی فکر اس کے غصے پر غالب تھی۔لیکن مادھو کو بے آنچ پہنچتے اور پھر برس برس کے دن، من کی من میں رہی، کے الفاظ کہتے سُن کر اس کا غصہ فکر پر غالب آ گیا۔وہ سر سے پاؤں تک راکھ ہی تو ہوگئی۔بجلی کی مانند لپکی۔صحن میں آئی۔ڈیوڑھی میں پہنچ کر دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا دی۔ننگی ایڑیوں کو دیکھ کر اس کا غصہ اور بھی چمک اُٹھا۔اس اثناء میں مادھو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔پوہ ماگھ کی سردی جگر تک پہنچتی ہے۔کانپتے ہوئے مادھو نے کلکارنی سے دروازہ کھولنے کی منت کی۔

اندر سے آواز آئی''جاؤ...... باہر ہی رہو۔اب تمھاری ضرورت ہی کیا ہے؟ جدھر مُنہ اُٹھائے ہو اُدھر چلے جاؤ اُتر ہے تو اُتر کو، دکھن ہے تو دکھن......گھر کیا ہے، ہنسی کھیل بنا رکھا ہے۔بڑے سونٹھ کی جڑ تلاش کرنے کو گئے تھے...... اتنا بھی نہیں سوجھا گھر میں خوشی ہے...... پرمیشر نے چاہا تو، یہ من کی من میں ہی رہے گی......واویلا کیوں کرتے ہو؟''

مادھو کچھ دیر کے لئے ٹھٹک گیا۔پھر بولا''دروازہ تو کھولو کارنی، دیکھو سردی کے مارے اکڑ جارہا ہوں۔ تمھاری ہنسلی اور پازیب ہی تو بنوانے گیا تھا۔''

''جانتی ہوں سُنار کے پاس تو تمھاری پرچھائیں تک نہیں پھٹکی۔سچ سچ کہو کیا تم اس میری سوت کے پاس نہیں گئے تھے؟''

''کون سوت؟''

''امبو......اور میری سوت کون ہوگی؟''

حقیقت میں مادھواسی کے پاس گیا تھا۔کلکارنی کے سامنے اس بات سے انکار کرنے کی جرأت نہ پڑی اور وہ انکار کرتا بھی کیوں؟ بولا۔

''ٹھیک ہے کارنی امبو بہن نے کہا بھیجا تھا۔ساہوکار نے ایک ایک روپے کے دو دو اور دو دو کے تین تین بنا لئے ہیں اور میں نے بیس روپے تم سے دراصل اسی لئے مانگے تھے۔تمھاری ہنسلی میں اپنے پیسوں سے بنوا دوں گا جوڑا ک گھر میں جمع ہیں۔فکر نہ کرو۔دروازہ تو کھولو۔''

مادھو کو کوئی جواب نہ ملا۔کلکارنی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔وہ کہہ رہی تھی۔

''برس دن کے بعد ایک آدھ دن خوشی کا آتا ہے......اس میں بھی دُکھ ہی ملتا ہے...... بہو بیٹے کا تہوار روز روز آئے گا نا۔۔ ہیلے روز روز گائے جائیں گے۔۔ایسے موقع پر خوشی کو دبا کر کون دق مول لے۔۔ یہ ہیں کہ۔۔''

مادھو نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

''کسی بہن بھائی کو دُکھی دیکھ کر مجھ سے تو مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں، نہ گائے جائیں گے۔''

کلکارنی نے دروازہ نہ کھولا۔

مگر اسے نیند کہاں آتی تھی۔ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس نے آہستہ سے کواڑ کھولے تو دیکھا۔اس کا مجازی خدا دروازے کی چوکھٹ پر سر ٹیک کر اونگھ گیا تھا۔اس کے گُھٹنے چھاتی سے لگ رہے تھے۔کلکارنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔شرمندگی کے ایک گہرے احساس سے اس نے مادھو کا شانہ ہلایا اور بولی۔

''میں کہتی ہوں''

''..................

''............میں کہتی ہوں............چلو گے؟اندر......''

مادھو نے آنکھیں ملتے ہوئے سر اُٹھایا اور بولا''ہاں......چلوں گا۔''

مادھو اندھیرے میں اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔سردی میں ہاتھ سُن ہو رہے تھے یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ اس کے اپنے نہیں ہیں۔کلکارنی نے جلدی سے انگیٹھی جلائی مادھو کے اکڑے ہوئے جسم کو گرم کیا اور اس کے پاؤں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی......اور یہ رونا دھونا کاہے کا...... مادھو کو تو ذرا بھی غصہ نہیں تھا۔

نصف شب کے قریب مادھو کو چھاتی میں کچھ درد محسوس ہوا۔باقی رات وہ چھاتی کو دباتا اور کراہتا رہا۔ کلکارنی نے گھی گرم کر کے جائفل کوٹ کو مالش بھی کی۔مگر مادھو کا دُکھ بڑھتا گیا۔

صبح ہوتے ہوتے اس کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی۔ دُور نزدیک سے سیانے بلائے گئے۔ مادھو کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑے شل ہو گئے تھے۔ سانس مشکل سے آتی تھی۔ کارنی کہتی تھی کہ نمونیہ وغیرہ کچھ نہیں۔ امبو بہت گنڈے تعویذ جانتی ہے۔ اس نے کچھ نہ کچھ دے دیا ہوگا۔ اگر وہ گزشتہ شب کے واقعے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنا قصور مان لیتی تو دیوی سے کم کیا ہوتی۔ مگر وہ تو محض ایک عورت تھی!

دوپہر کے قریب کچھ افاقہ ہوا۔ اس نے کارنی کو بلایا اور بولا۔

''میں نے سُنا ہے۔۔ کہ تم نے امبو کو اندر تک نہ آنے دیا۔ صبح جب وہ میری خبر لینے کے لئے آئی تھی۔۔ کیوں؟''

''نہ جانے کیوں۔''

''تم جانتی ہو میں امبو بہن سے بہت پیار کرتا ہوں۔۔۔''

''ہاں۔۔ مگر میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی۔ تمام دنیا میرے پیچھے کُتّے لگائے گی۔۔ جانتے بھی ہو دُنیا کو۔۔؟''

''جانے دو دنیا کو۔'' مادھو نے بائیں پھیپھڑے میں درد کی ایک ٹیس محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''اب جب کہ میں مر رہا ہوں، مجھے دنیا کی پرواہی کیا ہے۔۔۔۔ میرے پاس تو اتنے بول بھی نہیں کہ میں امبو بہن اور اس کے ساتھ اپنے رشتے کے پوتر ہونے کا دعویٰ کرسکوں۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔ تم اپنے مرتے ہوئے پتی کو بچن دو تم اپنی زندگی میں اس غریب کا ہاتھ پکڑ لوگی۔۔۔ اسے اپنے پاس بلا لوگی۔۔۔۔ کہو تو۔۔۔''

''میرا ہاتھ کون پکڑے گا؟۔۔۔۔ تمھارے دشمنوں کو۔۔۔۔' کلکارنی زاروقطار روتے ہوئے بولی۔

مادھو نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھائی۔

مادھو دنیا کو چھوڑ رہا تھا۔ مگر کارنی دنیا سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس نے تو مادھو کو خالی تسکین دینے کے لئے اثبات میں سر نہ ہلایا۔ وہ بالکل اُس آدمی کی طرح تڑپتا رہا جس کے دل میں بہت سی خواہشیں ہوں مگر موت اس کا گلا آدبائے۔۔۔۔ کچھ دیر بعد مادھو کا درد ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

مرنے کے بعد مرحوم کی جو آخری باتیں نمایاں طور پر یاد آتی ہیں ان میں سے ایک یہ تھی ''کسی بھائی بہن کو دُکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں، نہ گائے جائیں گے!

ہمارے مُلک میں تہوار ہی تہوار تو ہیں اور ہئی کیا؟ کاش یہاں کوئی تہوار نہ ہوتا۔۔۔ بیوائیں اور یتیم تو رونے سے بچ جاتے۔ پھر ایک بار مکر سنکرانت آ گئی۔ پھر سورج دھن راسی سے مکر راسی میں داخل ہوا۔ سنکرانت کی دیوی نے سماج کے کلنک یعنی امبو کے پاپ کے سوا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لئے اپنی بڑی بڑی ڈراؤنی

آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اوٹی بھرن کرتے ہوئے دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی ''میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو۔''

پھر موقع آیا کہ برسوں کے روٹھے ہوئے منائے جائیں۔ امبو سے تو گاؤں کا ہر ایک بچہ بوڑھا روٹھ گیا تھا۔ وہ کس کس کو مناتی۔ ایک رُلیا اور مادھو کے روٹھ جانے سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس سے روٹھ گیا تھا۔ ہائے! رُلیا اور مادھو ایسے روٹھنے والے کوئی ماننے کے لئے تھوڑے ہی روٹھے تھے۔

امبو کے گھر میں کانسی کے چمکتے ہوئے برتن بالکل سونے کے بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جھونپڑی میں لیپ پوت یوں کیا گیا جیسے امبو کے گھر میں کوئی آنے والا ہو۔ کبھی کبھی وہ آنکھ اٹھا کر باہر دیکھ لیتی۔ کیا عجب جو کہیں گھومتا پھرتا رُلیا ہی آجائے۔ نہیں تو مادھو کی صورت ہی دکھائی دے جائے!

مادھو کے بیٹے میں امبو کو مادھو بھائی کی ہی روح نظر آتی تھی۔ اگر چہ وہ جانتی تھی، کہ گاؤں کے لوگ عام طور پر اور کلکارنی اور اس کی بہو اور بیٹا خاص طور پر اس کی شکل دیکھنے سے بے راز ہیں۔ کیوں کہ اسی نے تو مادھو کو کوئی جنتر منتر دے دیا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک کانسی کی تھالی میں کچھ گاجریں، مٹر، امرود، بیر اور گنڈیریاں وغیرہ رکھیں تا کہ مادھو کی بہو کو دے، اپنی پھٹی ہوئی ساڑھی کے ایک پلو سے اس نے تھالی کو ڈھانپا اور مادھو کے گھر کی طرف چل دی۔

امبو کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ دہلیز کے اندر قدم رکھے۔ ایک برس پہلے لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس کی اس گھر میں پوچھ ہوتی تھی۔ آج وہ اس گھر میں کون تھی۔ ایک عورت نے اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''کارنی...... وہ رہی تمھاری سوت۔''

کلکارنی اسے دیکھ کر جل بُھن گئی۔ آہستہ سے بولی۔ ''مرتی بھی نہیں کم بخت۔۔۔۔ مرے تو میں آٹے میں لوبان اور گھی ریندھوں۔۔۔۔ دودھ کا کٹورا پیوں۔۔۔۔ گنگا نہاؤں۔ نہ جانے کیا کیا کروں۔''

جب امبو بالکل نزدیک آ گئی تو کلکارنی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی بولی۔

''آؤ بہن!۔۔۔۔ میٹھا میٹھا کھاؤ، اور میٹھا میٹھا بولو!''

امبو نے ان دونوں کی باتیں تھوڑی بہت سُن لی تھیں۔ سوت کا لفظ کان میں پڑتے ہی اس کا تمام جسم کانپنے لگا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ''بھیا کہاں ہیں؟''

دوسری عورتیں مسکرانے لگیں۔

پچھلے سال ٹھیک اسی دن مادھو اس سے آخری بار ملنے گیا تھا۔ اس بات کو یاد کرتے ہوئے امبو کا دل مسلا

گیا۔کلکارنی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔اسے بھی پچھلی سنکرانت یاد آ گئی۔ٹھیک اسی دن امبو نے مادھو کا کلیجہ نکال لیا تھا۔مگر وہ اس سنکرانت کی رات کا واقعہ بالکل بھول گئی تھی۔صرف اسے مادھو کے وہ الفاظ یاد تھے۔''کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں، نہ گائے جائیں گے!''

تمام عورتیں ہنستی کھیلتی رہیں۔پھر اوٹی بھرن کیا گیا۔سہاگنوں نے ایک دوسری کی مانگ میں سیندور لگایا۔ جب کلکارنی کی بہو کی مانگ میں پڑوس کی ایک دُلھن نے سیندور لگایا تو امبو وہیں کھڑی رہی۔سہاگن کے پاس بیوہ کھڑی رہے۔رام رام۔۔۔! کارنی نے امبو کو بازو سے پکڑا اور دھکا دے کر برآمدے سے باہر کر دیا۔بولی:

''دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟''

امبو نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اس کی طرف تو نہیں دیکھ رہا۔مگر سب کی نظریں اسی کی طرف تھیں۔ امبو نے منہ چھپا کر رونا چاہا۔مگر وہ رو بھی تو نہ سکتی تھی۔برس برس کا دن اور رونا! کارنی جان ہی تو نہ نکال لے گی۔مگر رونا برس برس کے روز اور عام دن میں کوئی بھی تمیز نہیں کرتا۔وہ آپی آپ آ جاتا ہے۔بلکہ یتیم اور بیوہ کو رونا برس برس کے دن ہی تو آتا ہے۔اسی دن مرے ہوئے بالکل نزدیک آ جاتے ہیں۔ساتھ ہی اُٹھتے ہیں۔۔۔ساتھ ہی بیٹھتے ہیں۔ہنسو تو ہنستے ہیں۔روؤ تو روتے ہیں اور گلے مل مل کر روتے ہیں۔کوئی انھیں دیکھتا ہے کوئی نہیں دیکھتا!

پڑوس کی بنجارن امبو کے پاس سے گزری اور محض امبو کو سُنانے کی غرض سے گنگنانے لگی۔۔۔''پتی برتا کا ایک ہے وبھچارن کے دوئے!''

اور پھر سنکرانت کے شور و غوغا میں شامل ہوتے ہوئے بولی۔''میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو!''

امبو کو زمین میں جگہ نہیں ملتی تھی کہ اس میں سما جائے۔اس گومگو کی حالت میں کلکارنی نے اسے دھکے دے کر باہر دیا۔ وہ محض دنیا سے چمٹی ہوئی تھی اور مادھو کے آخری الفاظ کا اسے کوئی خیال نہ تھا۔

اگلی صبح لوگ کہہ رہے تھے۔''نہ جانے امبو کہاں چلی گئی۔''

سماج کے ماتھے سے اس کلنک کے ٹیکے کو کلکارنی نے ہی تو دھویا تھا۔لوگ اُس سے خوش تھے اور جب وہ بہت خوش ہو کر عقیدت سے کہتے''بھئی کلکارنی نے اپنے نام کی لاج رکھ لی۔'' تو سوکھا سا منہ بنا کر بھائی گریب داس ایک ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا۔

''۔۔۔آہ! مگر غریب مادھو کی من کی من ہی میں رہی!''

☆☆☆

گرم کوٹ

میں نے دیکھا ہے۔معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دکان پر بہت سے عمدہ عمدہ سوٹ آویزاں ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا اپنا گرم کوٹ بلکل پھٹ گیا ہے اور اس سال ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود مجھے ایک نیا گرم کوٹ ضرور سلوا لینا چاہیے۔ٹیلر ماسٹر کی دکان کے سامنے سے گزرنے یا اپنے محکمے کے تفریح کلب میں جانے سے گریز کروں تو ممکن ہے۔ مجھے گرم کوٹ کا خیال بھی نہ آئے کیوں کہ کلب میں جب سنیتا سنگھ اور یزدانی کے کوٹوں کے نفیس ورسٹڈ (Worsted) مرے سمندِ تخیل پہ تازیانہ لگاتے ہیں تو میں اپنے کوٹ کی بوسیدگی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگتا ہوں۔یعنی وہ پہلے سے کہیں زیادہ پھٹ گیا ہے۔

بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کے لیے مجھ سے معمولی کلرک کو اپنی بہت سی ضروریات ترک کرنا پڑتی ہیں اور انھیں جگت تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لیے خود موٹا جھوٹا پہننا پڑتا ہے۔۔۔یہ گرم کوٹ میں نے پار سال دہلی دروازے سے باہر پُرانے کوٹوں کی ایک دکان سے مول لیا تھا۔کوٹوں کے سوداگر نے پُرانے کوٹوں کی سیکڑوں گانٹھیں کسی مرانجا، مرانجا اینڈ کمپنی کراچی سے منگوائی تھیں۔میرے کوٹ میں نقلی سلک کے استر سے بنی ہوئی اندرونی جیب کے نیچے مرانجا، مرانجا اینڈ کو، کا لیبل لگا ہوا تھا۔مگر کوٹ مجھے ملا بہت سستا۔مہنگا روئے ایک بار سستا روئے بار بار۔۔۔اور میرا کوٹ ہمیشہ ہی پھٹا رہتا تھا۔

اسی دسمبر کی ایک شام کو تفریح کلب سے واپس آئے ہوئے میں ارادتاً انارکلی میں سے گزرا۔اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔آٹا، دال، ایندھن، بجلی بیمہ کمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس کا نوٹ بچ رہا تھا۔۔۔جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گزرنا معیوب نہیں۔اس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا۔ بلکہ اپنی ذات کچھ بھی معلوم ہوتی ہے۔اس وقت انارکلی میں چاروں طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آرہے تھے اور ساڑیاں، چند سال سے ہر نتھو اخیرا سوٹ پہننے لگا ہے۔۔۔۔میں نے سنا ہے گذشتہ چند سال میں کئی ٹن سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔شاید اسی لیے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی بہت زیادہ رکھتے ہیں۔نئے نئے سوٹ پہننا اور خوب شان سے رہنا ہمارے افلاس کا بدیہی ثبوت ہے۔ورنہ جو لوگ سچ مچ امیر ہیں۔ایسی شان و شوکت اور ظاہری تکلفات کی چنداں پرواہ نہیں کرتے۔

کپڑے کی دکان میں ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے۔ انھیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ کیا میں اس مہینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا خرید کر بیوی بچوں کو بھوکا ماروں؟ لیکن کچھ عرصے کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے ناپاک خیال کا ردِعمل شروع ہوا۔ میں اپنے پُرانے گرم کوٹ کا بٹن پکڑ کر اسے بل دینے لگا۔ چوں کہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آگئی تھی۔ اس لیے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ مجھے تو اس وقت اپنا وہ کوٹ بھی سراسر تکلف نظر آنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کہا ہے جو شخص حقیقتاً امیر ہوں وہ ظاہری شان کی چنداں فکر نہیں کرتے۔ جو لوگ سچ مچ امیر ہوں انھیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قمیص بھی تکلف میں داخل سمجھنی چاہیے تو کیا میں سچ مچ امیر تھا کہ۔۔۔۔؟

میں نے گھبرا کر ذاتی تجزیہ چھوڑ دیا اور بہ مشکل دس کا نوٹ صحیح سلامت لیے گھر پہنچا۔

شمی، میری بیوی، میری منتظر تھی۔

آٹا گوندھتے ہوئے اس نے آگ پھونکنی شروع کر دی۔۔۔۔کم بخت منگل سنگھ نے اس دفعہ لکڑیاں گیلی بھیجی تھیں۔ آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ زیادہ پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیاں میں سے زیادہ دھواں اُٹھا۔ شمی کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ ان سے پانی بہنے لگا۔

''کم بخت کہیں کا۔۔۔۔منگل سنگھ۔'' میں نے کہا، ''ان پُرنم آنکھوں کے لیے منگل سنگھ تو کیا میں تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔''

بہت تگ و دو کے بعد لکڑیاں آہستہ آہستہ چٹخنے لگیں۔ آخر اُن پُرنم آنکھوں کے پانی نے میرے غصّے کی آگ بجھا دی۔۔۔۔شمی نے میرے شانے پر سر رکھا اور میرے پھٹے ہوئے گرم کوٹ میں پتلی پتلی انگلیاں داخل کرتی ہوئی بولی۔

''اب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا۔''

میں نے دھیمی آواز سے کہا، ''ہاں!''

''سی دوں؟۔۔۔یہاں سے۔۔۔''

''سی دو۔ اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رفو کر دو تو کیا کہنے ہیں۔''

کوٹ کو اُلٹاتے ہوئے شمی بولی۔ ''استر کو تو موئی ٹڈّیاں چاٹ رہی ہیں۔۔۔نقلی ریشم کا ہے نا۔۔۔یہ دیکھیے۔''

میں نے شمی سے اپنا کوٹ چھین لیا اور کہا، ''مشین کے پاس بیٹھنے کی بجائے تم میرے پاس بیٹھو شمی۔۔۔ دیکھتی نہیں ہو دفتر سے آ رہا ہوں۔۔۔ یہ کام تم اُس وقت کر لینا جب میں سو جاؤں۔''

شمی مسکرانے لگی۔

وہ شمی کی مسکراہٹ اور میرا پھٹا ہوا کوٹ!

شمی نے کوٹ کو خود ہی ایک طرف رکھ دیا۔ بولی ''میں خود بھی اس کوٹ کی مرمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔۔۔ اسے مرمت کرنے میں اس گیلے ایندھن کو جلانے کی طرح جان مارنی پڑتی ہے۔ آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔۔۔ آخر آپ اپنے کوٹ کے لیے کپڑا کیوں نہیں خریدتے؟''

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔

یوں تو میں اپنے کوٹ کے لیے کپڑا خریدنا گناہ خیال کرتا تھا۔ مگر شمی کی آنکھیں۔۔۔۔ ان آنکھوں کی تکلیف سے بچانے کے لیے میں منگل سنگھ تو کیا تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ جاؤں۔ ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان خرید لوں نئے گرم کوٹ کے لیے کپڑا خریدنے کا خیال دل میں پیدا ہوا ہی تھا کہ پشپا منی بھاگتی ہوئی کہیں سے آ گئی، آتے ہی برآمدے میں ناچنے اور گانے لگی۔ اس کی حرکات کتھا کلی مدراسے زیادہ کیف انگیز تھیں۔

''بابو جی۔۔۔ آپ آ گئے؟۔۔۔ آج بڑی بہن جی (اُستانی) نے کہا تھا۔ میز پوش کے لیے دوسوتی لانا اور گرم کپڑے پر کاٹ سکھائی جائے گی۔ گنیا ماپ کے لیے اور گرم کپڑا۔۔۔''

چوں کہ اس وقت میرے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی تھی۔ شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگائی اور بولی۔

''اس جنم جلی کو ہر وقت۔۔۔۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ خریدنا ہی ہوتا ہے۔۔۔ مشکل سے انھیں کوٹ سلوانے پر راضی کر رہی ہوں۔۔۔''

۔۔۔ وہ پشپا منی کا رونا اور میرا کوٹ!

میں نے خلافِ عادت اونچی آواز سے کہا۔ ''شمی!''

شمی کانپ گئی۔ میں نے غصّے سے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے اس کوٹ کی مرمت کر دو۔۔۔ ابھی۔۔۔ کسی طرح کرو۔۔۔ ایسے جیسے رو پیٹ کر منگل سنگھ کی گیلی لکڑیاں جلا لیتی ہو۔۔۔ تمھاری آنکھیں! ہاں! یاد آیا۔۔۔ دیکھو تو پشپا منی کیسے رو رہی ہے۔ پو پی بیٹا! ادھر آؤ نا۔۔۔ ادھر آؤ میری بچی! کیا کہا تھا تم نے؟ بولو تو۔۔۔ دوسوتی؟ گنیا ناپ کے لیے اور کاٹ سیکھنے کو گرم کپڑا؟۔۔۔ بچوں نھا بھی تو ٹرائسکل کا راگ الاپتا اور غبارے کے

لیے مچلتا سو گیا ہوگا۔ اسے غبارہ نہ لے دو گی تو میرا کوٹ سل جائے گا۔ ہے نا؟۔۔۔کتنا رویا ہوگا بے چارہ۔۔۔۔شمی! کہاں ہے بچو؟'' بچو آ گئے۔آندھی اور بارش کی طرح شور مچاتے ہوئے۔

میں نے شمی کو خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ یوں ہی کافوری رنگ کے مینار کا کانٹے سب سے پہلے لکھے۔ اچانک رسوئی کی طرف میری نظر اُٹھی۔ چولھے میں لکڑیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔۔۔اور ادھر شمی کی آنکھیں بھی دو چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔معلوم ہوا کہ منگل سنگھ گیلی لکڑیاں واپس لے گیا ہے۔

''وہ شہتوت کے ڈنڈے جل رہے ہیں اور کھوکھا۔'' شمی نے کہا۔

''اور اُپلے؟''

''جی ہاں، اوپلے بھی۔۔۔''

''منگل سنگھ دیوتا ہے۔۔۔شاید میں بھی جلد ہی گرم کوٹ کے لیے اچھا سا ورسٹڈ خرید لوں تاکہ تمھاری آنکھیں یوں ہی چمکتیں ہیں۔انھیں تکلیف نہ ہو۔۔۔اس ماہ کی تنخواہ میں تو گنجائش نہیں۔۔۔۔اگلے مہینے ضرور۔۔۔۔ضرور۔۔۔''

''جی ہاں، جب سردی گزر جائے گی۔۔۔''

پشپا منی نے کئی چیزیں لکھائیں۔دوسوتی، گنیا ناپ کے لیے گرم بلیزر سبز رنگ کا، ایک گز مربع، ڈی، ایم، سی کے گولے، گوٹے کی مغزی۔۔۔اور امرتیاں اور بہت سے گلاب جامن۔۔۔موئی نے سب کچھ ہی تو لکھوا دیا۔ مجھے دائمی قبض تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یونانی دواخانے سے اطریفل زمانی کا ایک ڈبّا بھی لا رکھوں۔دودھ کے ساتھ تھوڑا سا کھا کر سو جا کروں گا۔مگر موئی پشپا نے اس کے لیے گنجائش ہی کہاں رکھی تھی، اور جب پشپا منی نے کہا ''گلاب جامن'' تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا سب سے ضروری چیز تو ہی ہے۔۔۔شہر سے واپس آنے پر میں گلاب جامن وہاں چھپا دوں گا، جہاں سیڑھیوں میں باہر جمعدار اپنا دودھ کا کلسا رکھ دیا کرتا ہے اور پشپا سے کہوں گا کہ میں تو لانا ہی بھول گیا تمھارے لیے گلاب جامن۔۔۔اوہو!۔۔۔اس وقت اس کے منہ میں پانی بھر آئے گا اور گلاب جامن نہ پا کر اس کی عجیب کیفیت ہوگی۔

پھر میں نے سوچا بچو بھی تو صبح سے غبارہ لینے اور ٹرائسکل کے لیے ضد کر رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا ''اطریفل زمانی؟'' شمی بچو کو پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔''بچو بیٹی کو ٹرائسکل لے دوں گی اگلے مہینے۔۔۔بچو بیٹی سارا دن چلایا کرے گی ٹرائسکل۔۔۔پوپی منّا کچھ نہیں لے گا۔۔۔۔''

بچو چلایا کرے' گی' اور پوپی منہ نہیں لے' گا'!

۔۔۔اور میں نے شمی کی آنکھوں کی قسم کھائی کہ جب تک ٹرائسکل کے لیے چھ سات روپے جیب میں نہ ہوں، میں نیلے گنبد کے بازار سے نہیں گزروں گا۔اس لیے کہ دام نہ ہونے کی صورت میں نیلا گنبد کے بازار سے گزرنا بہت معیوب ہے۔خواہ مخواہ اپنے آپ غصہ آئے گا۔اپنی ذات سے نفرت پیدا ہوگی۔

اس وقت شمی بلجیمی آئینے کے بیضوی ٹکڑی کے سامنے اپنے کافوری سپیڈ سوٹ کھڑی تھی۔میں چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا،''میں بتاؤں تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟''

''بتاؤ تو جانوں۔۔۔''

''تم کہہ رہی ہو۔کافوری سپیڈ سوٹ کے ساتھ وہ کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے پہن کر ضلع دار کی بیوی کے ہاں جاؤں گی تو دنگ رہ جائے۔۔۔''

''نہیں تو''،شمی نے ہنستے ہوئے کہا،''آپ میری آنکھوں سے پیار کرتے تو کبھی کا گرم۔۔۔''

میں نے شمی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔میری تمام خوشی بے بسی میں بدل گئی۔میں نے آہستہ سے کہا،''بس۔۔۔ادھر دیکھو۔۔۔اگلے مہینے۔۔۔ضرور خرید لوں گا۔۔۔''

''جی ہاں، جب سردی۔۔۔''

۔۔۔پھر میں اپنی حسین دنیا کو،جس کی تخلیق پر محض دس روپے صرف ہوتے تھے،تصور میں بسائے بازار چلا گیا۔ میرے سوا انارکلی سے گزرنے والے ہر ذی عزت آدمی نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔لاہور کے ایک لحیم شحیم جنٹلمین کی گردن نکٹائی اور مکلّف کالر کے سبب میرے چھوٹے بھائی کے پالتو کتّے''ٹائیگر'' کے گردن کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔میں نے ان سوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لوگ سچ مچ مفلس ہو گئے۔۔۔اس مہینے نہ معلوم کتنا سونا چاندی ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔''

کانٹوں کی دکان پر میں نے کئی جوڑیاں دیکھے۔اپنی تخیل کی پختہ کاری سے میں شمی کی کوفوری سپیڈ سوٹ میں ملبوس ذہنی تصور کو کانٹے پہنا کر پسند یا ناپسند کر لیتا۔۔۔کافوری سپیڈ سوٹ۔۔۔کافوری مینا کار کانٹے۔۔۔۔۔۔کثرتِ اقسام کے باعث میں ایک بھی منتخب نہ کر سکا۔

اس وقت بازار میں مجھے یزدانی مل گیا۔وہ تفریح کلب سے جو دراصل پریل کلب تھا۔پندرہ روپے جیت کر آیا تھا۔آج اس کے چہرے پر اگر سُرخی اور بشاشت کی لہریں دکھائی دیتی تھیں تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔میں ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی سلوٹوں کو چھپانے لگا۔نچلی بائیں جیب پر ایک روپے کے برابر کوٹ سے ملتے ہوئے رنگ کا پیوند بہت ہی ناموزوں دکھائی دے رہا تھا۔۔۔۔میں اسے بھی ایک ہاتھ سے چھپاتا رہا۔پھر میں نے دل میں کہا۔

کیا عجب یزدانی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھنے سے پہلے میری جیب کو سلوٹیں اور وہ روپے کے برابر کوٹ کے رنگ کا پیوند دیکھ لیا ہو۔۔۔اس کا بھی ردِّعمل شروع ہوا اور میں نے دلیری سے کہا۔

''مجھے کیا پروا۔۔۔ یزدانی مجھے کون سی تھیلی بخش دے گا۔۔۔۔اور اس میں بات ہی کیا ہے۔ یزدانی اور سنتا سنگھ نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ وہ رفعتِ ذہنی کی زیادہ پروا کرتے ہیں اور ورسٹڈ کی کم۔

مجھ سے کوئی پوچھے۔ میں ورسٹڈ کی زیادہ پروا کرتا ہوں اور رفعتِ ذہنی کی کم!

یزادنی رخصت ہوا اور جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گیا میں غور سے اس کے کوٹ کے نفیس ورسٹڈ کو پشت کی جانب سے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے پشپا منی کے گلاب جامن اور امرتیاں خریدنی چاہیں۔ کہیں واپسی پر سچ مچ بھول ہی نہ جاؤں۔ گھر پہنچ کر انھیں چھپانے سے خوب تماشا رہے گا۔ مٹھائی کی دکان پر کھولتے روغن میں کچوریاں خوب پھول رہی تھیں۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس طرح جیسے گلاب جامن کے تخیل سے پشپا منی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ قبض اور اطریفل زمانی کے خیال کے باوجود میں سفید پتھر کی میز پر کہنیاں ٹکا کر بہت رغبت سے کچوریاں کھانے لگا۔

ہاتھ دھونے کے بعد جب پیسوں کے لیے جیب ٹٹولی تو اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ دس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا!

کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بڑا سوراخ ہو رہا تھا۔ نقلی ریشم کو ٹڈیاں چاٹ گئی تھیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اس جگہ جہاں مرانجا، مرانجا اینڈ کمپنی کا لیبل لگا ہوا تھا میرا ہاتھ باہر نکل آیا۔ نوٹ وہیں سے باہر گر گیا ہو گا۔

ایک لمحے میں یوں دکھائی دینے لگا جیسے کوئی بھولی سی بھیڑ اپنی خوب صورت، ملائم سی اون اتر جانے پر دکھائی دینے لگتی ہے۔

حلوائی بھانپ گیا۔ خود ہی بولا۔

''کوئی بات نہیں بابو جی۔۔۔۔ پیسے کل آ جائیں گے۔''

میں کچھ نہ بولا۔۔۔۔ کچھ بول ہی نہ سکا۔

صرف اظہارِ تشکر کے لیے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی کے پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن میں پھولتی ہوئی کچوریاں کے دھوئیں میں سے آتشیں سرخ امرتیاں جگر پر داغ لگا رہی تھیں۔۔۔اور ذہن میں پشپا منی کی دھندلی سی تصویر پھر گئی۔

میں وہاں سے بادامی باغ کی طرف چل دیا اور آدھ پون گھنٹے کے قریب بادامی باغ کی ریلوے لائن کے ساتھ

ساتھ چلتا رہا۔اس عرصے میں جنکشن کی طرف سے ایک مال گاڑی آئی۔اس کے پانچ منٹ بعد ایک شنٹ کرتا ہوا انجن جس میں سے دہکتے ہوئے سرخ کوئلے لائن پر گر رہے تھے۔۔۔۔میں لائن کے ساتھ ساتھ دریا کے پُل کی طرف چل دیا۔ چاندنی رات میں سردی کے باوجود کالج چند منچلے نوجوان کشتی چلا رہے تھے۔

''قدرت نے عجیب سزا دی ہے مجھے۔'' میں نے کہا،''پشپامنی کے لیے گوٹے کی مغزی، دوسوتی، گلاب جامن اور شمی کے لیے کوفوری مینا کارکانٹے خریدنے سے بڑھ کر کوئی گناہ سرزد ہوسکتا ہی؟ کس بے رحمی اور بے دردی سے میری ایک حسین مگر بہت سستی دنیا برباد کر دی گئی ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی قدرت کا ایک 'شاہکار' توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔

۔۔۔مگر پانی میں کشتی راں لڑکا کہہ رہا تھا۔

''اس موسم میں تو راوی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا۔''

''سارا پانی تو اوپر سے اپر باری دواب لے لیتی ہے۔۔۔اور یوں بھی آج کل پہاڑوں پر برف نہیں پگھلتی۔'' دوسرے نے کہا۔

میں ناچار گھر کی طرف لوٹا اور نہایت بے دلی سے زنجیر ہلائی۔

میری خواہش اور اندازے کے مطابق پشپامنی اور بچو ننھا بہت دیر ہوئی دہلیز سے اُٹھ کر بستروں میں جا سوئے تھے۔شمی چولھے کے پاس شہتوت کے نیم جان کوئلوں کو تاپتی ہوئی کئی مرتبہ اونگھی اور کئی مرتبہ چونکی تھی۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔اس کے سامنے میں نے چور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا اور لیبل کے نیچے سے نکال لیا۔ شمی سب کچھ سمجھ گئی۔وہ کچھ نہ بولی۔۔۔۔کچھ بول ہی نہ سکی۔

میں نے کوٹ کھونٹی پر لٹکا دیا۔میرے پاس ہی دیوار کا سہارا لے کر شمی بیٹھ گئی اور ہم دونوں سوئے ہوئے بچوں اور کھونٹی پر لٹکتے ہوئے گرم کوٹ کو دیکھنے لگے۔

اگر شمی نے میرا انتظار کیے بغیر وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو شاید میری حالت اتنی متغیر نہ ہوتی!

یزدانی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں پریل کھیل رہے تھے۔انھوں نے دو دو گھونٹ پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لیے اصرار کرنے لگے۔مگر میں نے انکار کر دیا۔اس لیے کہ میری جیب میں دام نہ تھے۔سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھ بھی پلا دیا۔شاید اس لیے وہ جان گئے تھے کہ اس کے پاس پیسے نہیں یا شاید اس لیے کہ وہ رفعتِ ذہنی کی ورسٹڈ سے زیادہ پروا کرتے تھے۔

اگر میں گھر میں اس دن شمی کو وہی کافوری سپید پہنے ہوئے دیکھ کر نہ آتا تو شاید پریل میں قسمت آزمائی کرنے کو میرا جی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہ کاش! میری جیب میں بھی ایک روپے ہوتے۔کیا عجب تھا کہ میں بہت سے روپے بنا لیتا۔۔۔مگر میری جیب میں تو کل پونے چار آنے تھے۔

یزدانی اور سنتا سنگھ نہایت عمدہ ورسٹڈ کے سوٹ پہنے نیک عالم کلب کے سکریٹری سے جھگڑ رہے تھے۔نیک عالم کہہ رہا تھا کہ وہ تفریح کلب کو پریل کب اور 'باز' بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔اس وقت میں نے ایک مایوس آدمی کے مخصوص انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا۔اور کہا،''بیوی بچوں کے لیے کچھ خریدنا قدرت کے نزدیک گناہ ہے۔اس حساب سے پریل کھیلنے کے لیے تو اسے اپنی گرہ سے دام دینے چاہئیں۔ہی ہی۔۔۔غی غی۔۔۔''

اندرونی کیسہ۔۔۔بائیں نچلی جیب۔۔۔۔کوٹ میں پشت کی طرف مجھے کوئی کاغذ سرکتا ہوا معلوم ہوا۔ اسے سرکاتے ہوئے۔۔۔میں نے دائیں جیب کے سوراخ کے نزدیک جا نکالا۔

۔۔۔وہ دس روپے کا نوٹ تھا جو اس دن اندرونی جیب کی تہ کے سوراخ میں سے گزر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہو گیا تھا۔

اس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اس کی خواہش کے مطابق پریل وریل نہ کھیلا۔نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔اگر اس دن میرا انتظار کیے بغیر شمی نے وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔

ہاں، پھر چلنے لگا وہی تخیل کا دور۔گویا ایک حسین سے حسین دنیا کی تخلیق میں دس روپے سے اوپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی۔جب میں بہت سی چیزوں کی فہرست بنا رہا تھا شمی نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پُرزے کر دیا اور بولی۔

''اتنے قلعے مت بنائیے۔۔۔پھر نوٹ کو نظر لگ جائے گی۔''

''شمی ٹھیک کہتی ہے۔''میں نے سوچتے ہوئے کہا، نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے۔''

پھر میں نے کہا،''ایک بات ہے شمی! مجھے ڈر ہے کہ نوٹ پھر کہیں مجھ سے گم نہ ہو جائے۔۔۔تمھاری کھیمو پڑوسن بازار جا رہی ہے اس کے ساتھ جا کر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ۔۔۔کافوری مینا کار کانٹے۔۔۔ڈی، ایم، سی، کے گولے، مغزی۔۔۔اور دیکھو پوپی منّا کے لیے گلاب جامن ضرور لانا۔۔۔۔ضرور۔۔۔۔''

شمی نے کھیمو کے ساتھ جانا منظور کر لیا اور اس شام شمی نے کشمیرے کا ایک وہ سوٹ پہنا جو اسے جہیز میں ماں باپ نے دیا تھا۔

بچوں کے شور وغوغا سے میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔مگر اس دن میں دیر تک بچو ننھے کو اس کی ماں کی غیر حاضری میں بہلاتا رہا۔ وہ رسوائی سے ایندھن کو کوٹھی، غسل خانے، نیم چھت پر۔۔۔سب جگہ اسے ڈھونڈھتا پھرا۔ میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا،

''وہ ٹرائسکل لینے گئی ہے۔۔۔نہیں جانے دو۔ٹرائسکل گندی چیز ہوتی ہے،اخ تھو۔۔۔غبارہ لائے گی، بی بی،تمھارے لیے، بہت خوب صورت غبارہ۔۔۔۔''

بچو بیٹی نے میرے ساتھ تھوک دیا۔ بولی،''اے۔۔۔ای۔۔۔گنڈی۔''

میں نے کہا،''کوئی دیکھے تو۔۔۔کیسا بیٹیوں جیسا بیٹا ہے۔''

پشپا منی کو بھی میں نے گود میں لے لیا اور کہا،''پو پی منّا۔۔۔آج گلاب جامن جی بھر کر کھائے گا نا!''

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ گودی سے اُتر پڑی اور بولی،''ایسا معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔جیسے ایک بڑا سا گلاب جامن کھا رہی ہوں۔''

بچو روتا رہا۔ پشپا منی کتھا کلی مُدرا سے زیادہ حسین ناچ برآمدے میں ناچ رہی۔

مجھے میرے تخیل کی پرواز سے کون روک سکتا تھا۔کہیں میرے تخیل کے قلعے زمین پر نہ آ رہیں۔اسی ڈر سے تو میں نے شمی کو بازار بھیجا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔شمی اب گھوڑے اسپتال کے قریب پہنچ چکی ہوگی۔۔۔اب کالج روڈ کے نکڑ پر ہوگی۔۔۔اب گندے انجن کے پاس۔۔۔

اور ایک نہایت دھیمے آواز سے زنجیر ہلی۔

شمی اندر آتے ہوئے بولی،''میں نے دو روپے کھیمو سے اُدھار لے کر بھی خرچ کر ڈالے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔

پھر بچو، پوپی منا اور میں تینوں شمی کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔

مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔اس نے میز پر بنڈل کھولا۔۔۔۔وہ میرے کوٹ کے لیے بہت نفیس ورسٹڈ تھا۔

پشپا منی نے کہا،''بی بی، میرے گلاب جامن۔۔۔۔''

شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی!

☆☆☆

کوارنٹین

پلیگ اور کوارنٹین!

ہمالہ کے پاؤں میں لیٹے ہوئے میدانوں پر پھیل کر ہر ایک چیز کو دھندلا بنا دینے والی کُہر کے مانند پلیگ کے خوف نے چاروں طرف اپنا تسلّط جما لیا تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اس کا نام سُن کر کانپ جاتا تھا۔

پلیگ تو خوف ناک تھی ہی مگر کوارنٹین اس سے بھی زیادہ خوف ناک تھی۔ لوگ پلیگ سے اتنے ہراساں نہیں تھے جتنے کوارنٹین سے اور یہی وجہ تھی کہ محکمہ حفظانِ صحت نے شہریوں کو چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے لیے جو قدِ آدم اشتہار چھپوا کر دروازوں، گزرگاہوں اور شاہراہوں پر لگایا تھا اُس پر 'نہ چوہا نہ پلیگ' کے عنوان میں اضافہ کرتے ہوئے 'نہ چوہا پلیگ نہ کوارنٹین' لکھا تھا۔

کوارنٹین کے متعلق لوگوں کا خوف بجا تھا۔ بحیثیت ایک ڈاکٹر کے میری رائے نہایت مستند ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی اموات شہر میں کوارنٹین سے ہوئیں، اتنی پلیگ سے نہ ہوئیں۔ حالاں کہ کوارنٹین کوئی بیماری نہیں بلکہ اس وسیع رقبے کا نام ہے جس میں متعدی وبا کے ایّام میں بیمار لوگوں کو تندرست انسانوں سے از روئے قانون علیحدہ کر کے لا ڈالتے ہیں تا کہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔ اگرچہ کوارنٹین میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا کافی انتظام تھا، پھر بھی مریضوں کے کثرت سے وہاں آ جانے پر ان کی طرف فرداً فرداً توجہ نہ دی جا سکی تھی۔ خویش و اقارب کے قریب نہ ہونے سے میں نے بہت سے مریضوں کو بے حوصلہ ہوتے دیکھا۔ کئی تو اپنے نواح میں لوگوں کو پے در پے مرتے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مر گئے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ کوئی معمولی طور پر بیمار آدمی وہاں کی وبائی فضا ہی کے جراثیم سے ہلاک ہو گیا اور کثرتِ اموات کی وجہ سے آخری رسوم بھی کوارنٹین کے مخصوص طریقے پر ادا ہوتیں یعنی سیکڑوں لاشوں کو مُردہ کتوں کی نعشوں کی طرح گھسیٹ کر ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں جمع کیا جاتا اور بغیر کسی مذہبی رسوم کا احترام کیے پٹرول ڈال کر سب کو نذرِ آتش کر دیا جاتا اور شام کے وقت جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آتشیں شفق کے ساتھ بڑے بڑے شعلے یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے تو دوسرے مریض یہی سمجھتے کہ تمام دُنیا کو آگ لگ رہی ہے۔

کوارنٹین اس لیے بھی زیادہ اموات کا باعث ہوئی کہ بیماری کے آثار نمودار ہوتے تو بیمار کے متعلقین اسے چھپانے لگتے۔تا کہ کہیں مریض کو جبراً کوارنٹین میں نہ لے جائیں۔ چونکہ ہر ایک ڈاکٹر کو تنبیہہ کی گئی تھی کہ مریض کی خبر پاتے ہی فوراً مطلع کرے۔اس لیے لوگ ڈاکٹروں سے علاج بھی نہ کراتے اور کسی گھر کے وبائی ہونے کا صرف اسی وقت پتہ چلتا جب کہ جگر دوز آہ وبُکا کے درمیان ایک لاش اس گھر سے نکلتی۔

ان دنوں میں کوارنٹین میں بطور ایک ڈاکٹر کام کر رہا تھا۔ پلیگ کا خوف میرے دل و دماغ پر بھی مسلّط تھا۔ شام کو گھر آنے پر میں ایک عرصے تک کاربالک صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا اور جراثیم کُش مرکب سے غرارے کرتا یا پیٹ کو جلا دینے والی گرم کافی یا برانڈی پی لیتا۔اگر چہ اس سے مجھے بے خوابی اور آنکھوں کے چندھے پن کی شکایت پیدا ہوگئی۔کئی دفعہ بیماری کے خوف سے میں نے قے آور دوائیں کھا کر اپنی طبیعت کو صاف کیا۔نہایت گرم کافی یا برانڈی پینے سے پیٹ میں تخمیر ہوتی اور بخارات اُٹھ اُٹھ کر دماغ کو جاتے تو میں اکثر ایک حواس باختہ شخص کی مانند طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ گلے میں ذرا بھی خراش محسوس ہوتی تو میں سمجھتا کہ پلیگ کے نشانات نمودار ہونے والے ہیں۔۔۔اُف! میں بھی اس موذی بیماری کا شکار ہو جاؤں گا۔۔۔ پلیگ! اور پھر۔۔۔کوارنٹین!

انھیں دنوں میں نو عیسائی ولیم بھاگو خاک روب جو میری گلی میں صفائی کیا کرتا تھا، میرے پاس آیا اور بولا،''بابو جی۔۔۔غضب ہو گیا۔آج ایمبواسی محلہ کے قریب سے بیس اور ایک بیمار لے گئی ہے۔''

''اکیس؟ ایمبولینس میں۔۔۔۔؟ میں نے متعجب ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

''جی ہاں۔۔۔ پورے بیس اور ایک۔۔۔انھیں بھی کونٹن (کوارنٹین) لے جائیں گے۔۔۔۔آہ! وہ بے چارے کبھی واپس نہ آئیں گے؟''

دریافت کرنے پر مجھے علم ہوا کہ بھاگو رات کے تین بجے اُٹھتا ہے۔آدھ پاؤ شراب چڑھا لیتا ہے اور پھر حسبِ ہدایت کمیٹی کی گلیوں اور نالیوں میں چونا بکھیرنا شروع کر دیتا ہے تا کہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔ بھاگو نے مجھے مطلع کیا کہ اس کے تین بجے اُٹھنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ بازار میں پڑی ہوئی لاشوں کو اکٹھا کرے اور اس محلے میں جہاں وہ کام کرتا ہے، ان لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرے جو بیماری کے خوف سے باہر نہیں نکلتے۔ بھاگو تو بیماری سے ذرا نہیں ڈرتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ اگر موت آئی ہو تو خواہ وہ کہیں بھی چلا جائے بچ نہیں سکتا۔

ان دنوں جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ بھاگو سر اور منہ پر منڈاسا باندھے نہایت انہاک سے بنی نوع انسان کی خدمت گزاری کر رہا تھا۔اگر چہ اس کا علم نہایت محدود تھا۔تاہم اپنے تجربے کی بنا پر وہ ایک مقرر کی طرح لوگوں کو بیماری سے بچنے کی تراکیب بتاتا۔عام صفائی، چونا بکھیرنے اور گھر سے باہر نکلنے کی تلقین کرتا۔ایک

دن میں نے اسے لوگوں کو شراب کثرت سے پینے کی تلقین کرتے ہوئے بھی دیکھا اس دن جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا، ''بھاگُو تمھیں پلیگ سے ڈر نہیں لگتا؟''

''نہیں بابو جی۔۔۔۔ بن آئی بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ آپ اِتّے بڑے حکیم ٹھیرے ہجاروں نے آپ کے ہاتھ سے سفا پائی۔ مگر جب میری آئی ہوئی ہوگی تو آپ کی دوا دارو بھی کچھ اثر نہ کرے گی۔۔۔۔۔ ہاں بابو جی۔۔۔ آپ بُرا نہ مانیں، میں ٹھیک اور صاف کہہ رہا ہوں۔'' اور پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولا، '' کچھ کونٹین کی کہیے بابو جی۔۔۔ کونٹن کی!''

''وہاں کوارنٹین میں ہزاروں مریض آ گئے ہیں۔ ہم حتی الوسع ان کا علاج کرتے ہیں۔ مگر کہاں تک، نیز میرے ساتھ کام کرنے والے خود بھی زیادہ دیر ان کے درمیان رہنے سے گھبراتے ہیں۔ خوف سے اس کے گلے اور لب سوکھے رہتے ہیں۔ پھر تمھاری طرح کوئی مریض کے منہ کے ساتھ منہ نہیں جا لگاتا۔ نہ کوئی تمھاری طرح اتنی جان مارتا ہے۔۔۔۔ بھاگُو خدا تمھارا بھلا کرے جو تم بنی نوع انسان کی اس قدر خدمت کرتے ہو۔۔۔!

بھاگُو نے گردن اور منڈاسے کے ایک پلّو کو منہ پر سے ہٹا کر شراب کے اثر سے سرخ چہرے کو دکھاتے ہوئے بولا، ''بابو جی! میں کس لائق ہوں۔ مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے، میرا یہ نکمّا تن کسی کے کام آ جائے اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے، بابو جی بڑے پادری لابے (ریورینڈ مونت ل،آبے) جو ہمارے محلوں میں اکثر پرچار کے لیے آیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: خداوند یسوع مسیح یہی سکھاتا ہے کہ بیمار کی مدد میں اپنی جان تک لڑا دو۔۔ میں سمجھتا ہوں۔۔''

میں نے بھاگُو کی ہمت کو سراہنا چاہا مگر کثرتِ جذبات سے میں رک گیا۔ اس کی خوش اعتقادی اور عملی زندگی کو دیکھ کر میرے دل میں ایک جذبۂ رشک پیدا ہوا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج کوارنٹین میں پوری تن دہی سے کام کر کے بہت سے مریضوں کو بقیدِ حیات رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ان کو آرام پہنچانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا۔ مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کوارنٹین میں پہنچ کر جب میں نے مریضوں کی خوف ناک حالت دیکھی اور ان کے منہ سے پیدا شدہ تعفّن میرے نتھنوں میں پہنچا تو میری روح لرز گئی اور بھاگُو کی تقلید کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

تاہم اس دن بھاگُو کو ساتھ لے کر میں نے کوارنٹین میں بہت کام کیا۔ جو کام مریض کے زیادہ قریب رہ کر ہو سکتا تھا وہ میں نے بھاگُو سے کرایا اور اس نے بلا تامّل کیا۔۔۔ خود مریضوں سے دور دور ہی رہتا۔ اس لیے کہ میں موت سے بہت خائف تھا اور اس سے بھی زیادہ کوارنٹین سے!

مگر کیا بھاگُو موت اور کوارنٹین دونوں سے بالاتر تھا؟

اس دن کوارنٹین میں چار سو کے قریب مریض داخل ہوئے اور اڑھائی سو کے لگ بھگ لقمۂ اجل ہو گئے!

یہ بھاگُو کی جاں بازی کا صدقہ ہی تھا کہ میں نے بہت سے مریضوں کو شفا یاب کیا۔ وہ نقشہ جو مریضوں کی رفتارِ صحت کے متعلق چیف میڈیکل آفیسر کے کمرے میں آویزاں تھا اِس میں میرے تحت میں رکھے ہوئے مریضوں کی اوسط صحت کی لکیر سب سے اونچی چڑھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں ہر روز کسی نہ کسی بہانے سے اس کمرے میں چلا جاتا اور اس لکیر کو سو فی صد کی طرف اوپر ہی اوپر بڑھتے دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوتا۔

ایک دن میں برانڈی ضرورت سے زیادہ پی لی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ نبض گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی اور میں ایک جنوبی کی مانند اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مجھے خود شک ہونے لگا کہ پلیگ کے جراثیم نے مجھ پر آخر کار اپنا اثر کر ہی دیا ہے اور عنقریب ہی گلٹیاں میرے گلے یا رانوں میں نمودار ہوں گی۔ میں بہت سراسیمہ ہو گیا۔ اس دن میں نے کوارنٹین سے بھاگ جانا چاہا۔ جتنا عرصہ میں وہاں ٹھہرا، خوف سے کانپتا رہا۔ اس دن مجھے بھاگو کو دیکھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہوا۔

دوپہر کے قریب میں نے اسے ایک مریض سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ نہایت پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھپک رہا تھا۔ مریض میں جتنی بھی سکت تھی اسے جمع کرتے ہوئے اس نے کہا، ''بھئی اللہ ہی مالک ہے۔ اس جگہ تو خدا دشمن کو بھی نہ لائے۔ میری دو لڑکیاں۔۔۔۔''

بھاگُو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کھُد اوند یسوع مسیح کا سکر کرو بھائی۔۔۔ تم تو اچھے دکھائی دیتے ہو۔''

''ہاں بھائی شکر ہے خدا کا۔۔۔ پہلے سے کچھ اچھا ہی ہوں۔ اگر میں کوارنٹین۔۔۔''

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ اس کی نسیں کھنچ گئیں۔ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کئی جھٹکے آئے اور وہ مریض جو ایک لمحے پہلے سب کو اور خصوصاً اپنے آپ کو اچھا دکھائی دے رہا تھا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ بھاگُو اس کی موت پر دکھائی نہ دینے والے خون کے آنسو بہانے لگا۔ اور کون اسکی موت پر آنسو بہاتا۔ کوئی اس کا وہاں ہوتا تو اپنے جگر دوز نالوں سے ارض و سما کو شق کر دیتا۔ ایک بھاگُو ہی تھا جو سب کا رشتے دار تھا۔ سب کے لیے اس کے دل میں درد تھا۔ وہ سب کی خاطر روتا اور کُڑھتا تھا۔ ایک دن اس نے خداوند یسوع مسیح کے حضور میں نہایت عجز و انکسار سے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کے گناہ کے کفارے کے طور پر بھی پیش کیا۔

اسی دن شام کے قریب بھاگُو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ ایک دردناک آواز سے کراہ رہا تھا۔ بولا، ''بابو جی۔۔۔ یہ کونٹین تو دوجخ ہے دوجخ۔ پادری لابے اسی قسم کی دوجخ کا نقصہ کھینچا کرتا تھا۔۔۔''

میں نے کہا،''ہاں بھائی، یہ دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے۔۔۔۔میں تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا ہوں۔۔۔میری طبیعت آج بہت خراب ہے۔''

''بابو جی اس سے جیادہ اور کیا بات ہو سکتی ہے۔۔۔آج ایک مریض جو بیماری کے کھوف سے بے ہوس ہو گیا تھا۔اسے مردہ سمجھ کر کسی نے لاسوں کے ڈھیر میں جا ڈالا۔جب پٹرول چھڑکا گیا اور آگ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو میں نے اسے سعلوں میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا۔میں نے کود کر اسے اٹھا لیا۔بابو جی! وہ بہت بُری طرح جھلسا گیا تھا۔۔۔اسے بچاتے ہوئے میرا دایاں باجو بلکل جل گیا ہے۔''

میں نے بھاگُو کا بازو دیکھا۔اس پر زرد زرد چربی نظر آ رہی تھی۔میں اسے دیکھتے ہوئے لرز اٹھا میں نے پوچھا،''کیا وہ آدمی بچ گیا ہے، پھر۔۔۔؟

''بابو جی۔۔۔وہ کوئی بہت سریف آدمی تھا جس کی نیکی اور سریفی (شرافت) سے دنیا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی، اتنے دردو کرب کی حالت میں اس نے اپنا جھلسا ہوا چہرہ اوپر اُٹھایا اور اپنی مریل سی نگاہ میری نگاہ میں ڈالتے ہوئے اس نے میرا سکریہ ادا کیا۔''

''۔۔۔اور بابو جی۔'' بھاگُو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔''اس کے کچھ دیر بعد وہ اتنا تڑپا، اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریج کو اس طرح جان توڑتے نہیں دیکھا۔۔۔اس کے بعد وہ مر گیا۔کتنا اچھا ہوتا جو میں۔۔۔اسے اسی وقت مر جانے دیتا۔اسے بچا کر میں نے اسے مزید اور دکھ سہنے کے لیے جندہ رکھا اور پھر وہ بچا بھی نہیں، اب انہی جلے ہوئے باجوؤں سے میں پھر اسے اسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں۔۔۔''

اس کے بعد بھاگُو کچھ بول نہ سکا۔درد کی ٹیسوں کے درمیان اس نے رُکتے رُکتے کہا۔

''آپ جانتے ہیں۔۔۔وہ کس بیماری۔۔۔سے مرا؟ پلیگ سے نہیں۔۔۔کونٹین سے۔۔۔کونٹین سے!''

اگرچہ ہمہ یاراں دوزخ کا خیال اس لا متناہی سلسلۂ قہر و غضب میں لوگوں کو کسی حد تک تسلّی کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔تاہم مقہور بنی آدم کی فلک شگاف صدائیں تمام شب کانوں میں آتی رہتیں۔ماؤں کی آہ و بکا، بہنوں کے نالے، بیویوں کے نوحے، بچوں کی چیخ و پکار، شہر کی اس فضا میں جس میں کہ نصف شب کے قریب اُلّو بھی بولنے سے ہچکچاتے تھے، ایک نہایت الم ناک منظر پیدا کرتی تھی۔جب صحیح و سلامت لوگوں کے سینوں پر منوں بوجھ رہتا تھا تو ان لوگوں کی حالت کیا ہوگی جو گھروں میں بیمار پڑے تھے اور جنھیں کسی یرقان زدہ کے مانند در و دیوار سے مایوسی کی زردی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی اور پھر کوارنٹین کے مریض جنھیں مایوں کی حد سے گزر کر ملک الموت مجسم دکھائی دے رہا

تھا، وہ زندگی سے یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے طوفان میں کوئی کسی درخت کی چوٹی سے چمٹا ہوا ہو، اور پانی کی تیز وتُند لہریں ہر لحظہ بڑھ کر اس چوٹی کو بھی ڈبو دینے کی آرزومند ہوں۔

میں اس روز تو ہم کی وجہ سے کوارنٹین بھی نہ گیا۔ کسی ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اگر چہ مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی رہی۔۔۔ کیونکہ یہ بہت ممکن تھا کہ میری مدد سے کسی مریض کو فائدہ پہنچ جاتا۔ مگر اس خوف نے جو میرے دل و دماغ پر مسلّط تھا، مجھے پابہ زنجیر رکھا۔ شام کو سوتے وقت مجھے اطلاع ملی کہ آج شام کوارنٹین میں پانسو کے قریب مزید مریض پہنچے ہیں۔

میں ابھی ابھی معدے کو جلا دینے والی گرم کافی پی کر سونے ہی والا تھا کہ دروازے پر بھاگو کی آواز آئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو بھاگو ہانپتا ہوا اندر آیا۔ بولا ''بو بو جی۔۔۔ میری بیوی بیمار ہوگئی۔۔۔ اس کے گلے میں گٹلیاں نکل آئی ہیں۔۔۔ کھُدا کے واسطے اُسے بچاؤ۔۔۔ اس کی چھاتی پر ڈیڑھ سالہ بچہ دودھ پیتا ہے، وہ بھی مر جائے گا۔''

بجائے گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے میں نے خشمگیں لہجے میں کہا ''اس سے پہلے کیوں نہ آسکے۔۔۔ کیا بیماری ابھی ابھی شروع ہوئی ہے؟''

''صبح معمولی بکھار تھا۔۔۔ جب میں کونٹین گیا۔۔۔''

''اچھا۔۔۔ وہ گھر میں بیمار تھی اور پھر بھی تو کوارنٹین گئے؟''

''جی بو بو جی۔۔۔'' بھاگو کانپتے ہوئے کہا ''وہ بلکل ماموُلی بیمار تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید دودھ چڑھ گیا ہے۔۔۔ اس کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں۔۔۔۔ اور پھر میرے دونوں بھائی گھر پر ہی تھے۔۔۔ اور سینکڑوں مریج کونٹین میں بے بس۔۔۔''

''تو تم اپنی حد سے زیادہ مہربانی سے جراثیم کو گھر لے ہی آئے نا۔ میں نہ تم سے کہتا تھا کہ مریضوں کے اتنا قریب مت رہا کرو۔۔۔ دیکھو میں آج اسی وجہ سے وہاں نہیں گیا۔ اس میں سب تمھارا قصور ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم سے جانباز کو اپنی جانبازی کا مزہ بھگتنا ہی چاہیے۔ جہاں شہر میں سینکڑوں مریض پڑے ہیں۔۔۔''

بھاگو نے ملتجیانہ انداز سے کہا ''مگر کھُداوند یسو مسیح۔۔۔''

''چلو ہٹو۔۔۔ بڑے آئے کہیں کے۔۔۔ تم نے جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالا ہے اب اس کی سزا میں بھگتوں؟ قربانی ایسے تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ میں اتنی رات گئے تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔۔۔''

''مگر پادری لابے۔۔۔''

''چلو۔۔۔ جاؤ۔۔۔ پادری لا، آبے کے کچھ ہوتے۔۔۔''

بھاگو سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ اس کے آدھ گھنٹے بعد جب میرا غصہ فرو ہوا تو میں اپنی حرکت پر نادم ہونے لگا۔ میں عاقل کہاں کا تھا جو بعد میں پشیمان ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہی یقیناً سب سے بڑی سزا تھی کہ اپنی تمام خودداری کو پامال کرتے ہوئے بھاگو کے سامنے گذشتہ رویے پر اظہارِ معذرت کرتے ہوئے اسکی بیوی کا پوری جانفشانی سے علاج کروں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور دوڑا دوڑا بھاگو کے گھر پہنچا۔۔۔ وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ بھاگو کے دونوں چھوٹے بھائی اپنی بھاوج کو چارپائی پر لٹائے ہوئے باہر نکال رہے تھے۔۔۔

میں نے بھاگو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا، ''اسے کہاں لے جا رہے ہو؟''

بھاگو نے آہستہ سے جواب دیا، ''کونٹین میں۔۔۔''

''تو کیا اب تمھاری دانست میں کوارنٹین دوزخ نہیں۔۔۔ بھاگو؟۔۔۔''

''آپ نے جو آنے سے انکار کر دیا۔ بابوجی۔۔۔ اور چارہ ہی کیا تھا۔ میرا کھیال تھا وہاں حکیم کی مدد مل جائے گی اور دوسرے مریجوں کے ساتھ اس کا بھی کھیال رکھوں گا۔''

''یہاں رکھ دو چارپائی۔۔۔ ابھی تک تمھارے دماغ سے دوسرے مریضوں کا خیال نہیں گیا؟۔۔۔ احمق۔۔۔''

چارپائی اندر رکھ دی گئی اور میرے پاس جو تیر بہدف دوا تھی میں نے بھاگو کی بیوی کو پلائی اور پھر اپنے غیر مرئی حریف کا مقابلہ کرنے لگا۔ بھاگو بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔

بھاگو نے لرزتے ہوئی آواز میں کہا، ''آپ کا احسان ساری عمر نہ بھولوں گا، بابوجی۔۔۔''

میں نے کہا، ''مجھ اپنے گزشتہ رویے پر سخت افسوس ہے بھاگو۔۔۔ ایشور تمھیں خدمات کا صلہ تمھاری بیوی کی شفا کی صورت میں دے۔''

اسی وقت میں نے اپنے غیر مرئی حریف کو اپنا آخری حربہ استعمال کرتے دیکھا۔ بھاگو کی بیوی کے لب پھڑکنے لگے۔ نبض جو کہ میرے ہاتھ میں تھی مدّھم ہو کر شانے کی طرف سرکنے لگی۔ میرے غیر مرئی حریف نے جس کی عموماً فتح ہوتی تھی۔ حسب معمول پھر مجھے چاروں شانے چت گرایا۔ میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا، ''بھاگو! تمھیں اپنی قربانی کا یہ عجیب صلہ ملا ہے۔۔۔!''

بھاگو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ نظارہ کتنا دل دور تھا، جب کہ بھاگو نے اپنے بلبلاتے ہوئے بچے کو اسکی ماں سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا اور مجھے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ لوٹا دیا۔

میرا خیال تھا کہ اب بھاگو اپنی دنیا کو تاریک پا کر کسی کا خیال نہ کرے گا۔۔۔ مگر اس سے اگلے روز میں

نے اسے بیش از بیش مریضوں کی امداد کرتے دیکھا۔ اس نے سینکڑوں گھروں کو بے چراغ ہونے سے بچا لیا ۔۔۔اوراپنی زندگی کو ہیچ سمجھا۔ میں نے بھی بھاگو کی تقلید میں نہایت مستعدی سے کام کیا۔کوارنٹین اورہسپتالوں سے فارغ ہوکراپنے فالتو وقت میں میں نے شہر کے غریب طبقے کےلوگوں کے گھروں سے جو کہ بدرووٗں کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے یا غلاظت کے سبب بیماری کے مسکن تھے، رجوع کیا۔

اب فضا بیماری کے جراثیم سے بالکل پاک ہوچکی تھی۔شہرکو بالکل دھوڈالا گیا تھا۔ چوہوں کا کہیں نام ونشان دکھائی نہ دیتا تھا۔سارے شہر میں صرف ایک آدھ کیس ہوتا جس کی طرف فوری توجہ دیے جانے پر بیماری کے بڑھنے کا احتمال باقی نہ رہا۔

شہر میں کاروبار نے اپنی طبعی حالت اختیار کرلی،اسکول،کالج اوردفاتر کھلنے لگے۔

ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ تھی کہ بازار میں گزرتے وقت چاروں طرف سے انگلیاں مجھی پر اُٹھتیں ۔لوگ احسان مندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ۔اخباروں میں تعریفی کلمات کے ساتھ میری تصاویر چھپیں ۔اس چاروں طرف سے تحسین وآفریں کی بوچھار نے میرے دل میں کچھ غرورسا پیدا کردیا۔

آخر ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں شہر کے بڑے بڑے رئیس اور ڈاکٹر مدعو کیے گئے۔ وزیر بلدیات نے اس جلسے کی صدارت کی ۔ میں صاحب صدر کے پہلو میں بٹھایا گیا۔ کیوں کہ وہ دعوت دراصل میرے ہی اعزاز میں دی گئی تھی۔ ہاروں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جاتی تھی اور میری شخصیت بہت نمایاں ہوتی تھی۔ پُر غرورنگاہ سے میں کبھی اِدھر دیکھتا کبھی اُدھر۔۔۔۔بنی آدم کی انتہائی خدمت گزاری کے صلے میں کمیٹی شکرگزاری کے جذبے سے معمورایک ہزارایک روپے کی تھیلی بطور'ایک حقیر رقم' میری نذر کررہی تھی۔۔۔۔

جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب نے میرے رفقائے کار کی عموماً اور میری خصوصاً تعریف کی اور کہا کہ گذشتہ آفت میں جتنی جانیں میری جانفشانی اورتن دہی سے بچی ہیں ان کا شمار نہیں۔ میں نے نہ دن کو دن دیکھا نہ رات کو رات، اپنی حیات کو حیاتِ قوم اوراپنے سرمائے کو سرمایہ ملّت سمجھا اور بیماری کے مسکنوں میں پہنچ کر مرتے ہوئے مریضوں کو جامِ شفا پلایا!

وزیر بلدیات نے میز کے بائیں پہلو میں کھڑے ہوکرایک پتلی سی چھڑی ہاتھ میں لی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی توجہ اس سیاہ لکیر کی طرف دلائی جو دیوار پرآویزاں نقشے میں بیماری کے دنوں میں صحت کے درجے کی طرف ہرلحظہ اُفتاں وخیزاں بڑھی جارہی تھی۔ آخر میں انھوں نے نقشے میں وہ دن بھی دکھایا جب میرے زیرنگرانی چوّن مریض رکھے گئے اوروہ تمام صحت یاب ہوگئے۔یعنی نتیجہ سوفی صد کامیابی رہااوروہ سیاہ لکیر

اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

اس کے بعد وزیر بلدیات نے اپنی تقریر میں میری ہمت کو بہت کچھ سراہا اور کہا کہ لوگ یہ جان کر بہت خوش ہوں گے کہ بخشی جی اپنی خدمات کے صلے میں لفٹیننٹ کرنل بنائے جا رہے ہیں۔

ہال تحسین و آفرین کی آوازوں اور پُرشور تالیوں سے گونج اُٹھا۔

انہی تالیوں کے شور کے درمیان میں نے اپنی پُرغرور گردن اُٹھائی۔ صاحب صدر اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس میں علاوہ اور باتوں کے میں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی توجہ کے قابل ہسپتال اور کوارنٹین ہی نہیں تھے۔ بلکہ ان کی توجہ کے قابل غریب طبقے کے لوگوں کے گھر تھے۔ وہ لوگ اپنی مدد کے بالکل نا قابل تھے، اور وہی زیادہ تر اس موذی بیماری کا شکار ہوئے۔ میں اور میرے رفقا نے بیماری کے صحیح مقام کو تلاش کیا اور اپنی توجہ بیماری کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے میں صرف کر دی۔ کوارنٹین اور ہسپتال سے فارغ ہو کر ہم نے راتیں ان ہی خوف ناک مسکنوں میں گزاریں۔

اسی دن جلسے کے بعد جب میں بطور ایک لفٹیننٹ کرنل کے اپنی پُرغرور گردن کو اُٹھائے ہوئے، ہاروں سے لدا پھندا، لوگوں کا ناچیز ہدیہ ایک ہزار ایک روپے کی صورت میں جیب میں ڈالے ہوئے گھر پہنچا تو مجھے ایک طرف سے آہستہ سی آواز سنائی دی۔

''بابو جی۔۔۔ بہت بہت مبارک ہو۔''

۔۔۔اور بھاگو نے مبارک باد دیتے وقت وہی پُرانی جھاڑو قریب ہی کے گندے حوض کے ایک ڈھکنے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے منڈاسا کھول دیا، میں نے بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔

''تم ہو؟۔۔۔ بھاگو بھائی! میں نے بمشکل تمام کہا۔۔۔''دنیا تمھیں نہیں جانتی، بھاگو تو نہ جانے۔۔۔ میں تو جانتا ہوں۔ تمھارا یسوع تو جانتا ہے۔۔۔۔ پادری ل، آبے کے بے مثال چیلے۔۔۔ تجھ پر خدا کی رحمت ہو۔۔۔!''

اس وقت میرا گلا سوکھ گیا۔ بھاگو کی مرتی ہوئی بیوی اور بچے کی تصویر میری آنکھوں میں کھنچ گئی۔ ہاروں کے بارِ گراں سے مجھے اپنی گردن ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی اور بٹوے کے بوجھ سے میری جیب پھٹنے لگی اور۔۔۔ اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہو کر اس قدر ناشناس دنیا کا ماتم کرنے لگا!

☆☆☆

وِٹامن ’بی‘

ایجرٹن روڈ کے عین وسط میں جہاں جلی حروف میں ’روڈ اَپ‘ لکھا ہوا تھا اور نصف درجن کے قریب سُرخ پھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں بطور ایک چھوٹے اوورسیر کے مزدوروں کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک بہت لمبا ٹیپ تھا۔ جس سے بار ہا مجھے مرمت طلب سڑک اور کُٹی ہوئی روڑی کی پیمائش کرنی پڑتی تھی۔

’’روڈ اَپ‘‘ بورڈ کے پاس ہی کولتار کے چند خالی پیپے پڑے تھے اور ان میں سُرخ شیشوں والی بتیاں رات کے وقت استعمال کے لیے اقلیدسی نصف دائرے میں پڑی تھیں۔ قریب ہی پگڈنڈی میں چند گہرے سے گڑھے نظر آ رہے تھے۔ ان گڑھوں کو بطور چولھے کے استعمال کرتے ہوئے سڑک کے مرمت شدہ حصے پر بچھانے کے لیے کولتار کو گرم کیا جا رہا تھا اور دو ایک چیختا چلاتا ہوا انجن بچھی ہوئی کنکریوں کو دبا رہا تھا۔

پھریروں اور خالی ٹینوں کے ساتھ ہی چند مارواڑی اور پوربی عورتیں سڑک کے مرمت طلب قطعۂ زمین کو بڑے بڑے برشوں سے صاف کر رہی تھیں اور مخصوص سُر تال سے گا کر کام میں روح پھونک رہی تھیں۔ پاس ہی سول لائن کے تھانے اور ایک بڑی سی نرسری کے درمیان ایک لہسوڑے کے نیچے دو ایک بچے بلک رہے تھے۔ نرسری میں چند ایک چھوکرے غلیلیں اور گوپھیے ہاتھ میں لیے ثمر آور پودوں سے توتوں وغیرہ کو اُڑا رہے تھے۔ کنکری چھوڑتے وقت وہ بلند آواز سے ’’اللہ اکبر‘‘ پکارتے۔ کبھی کبھی بے وجہ چیختے، زور زور سے ہنستے اور اپنی آواز کی گونج سے حظ اُٹھاتے۔ میری توجہ نرسری کی طرف لہسوڑے کے نیچے بلکتے ہوئے بچوں کی طرف منعطف ہوگئی۔ بچوں کے پیٹ پھولے ہوئے تھے اور ان کی چھاتیاں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ جب کوئی مارواڑی یا پوربی عورت اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لیے اُٹھتی تو ٹھیکیدار عرفانی خشم آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ مگر جیسے ہی پس پُشت گر گراتا ہوا انجن سیٹی دیتا، عرفانی اُچھل کر انجن کی زد سے باہر پٹڑی پر کھڑا ہو جاتا۔

اس دفعہ ٹھیکیدار عرفانی نے ٹنڈر بہت کم رقم کا بھرا تھا۔ اس لیے مزدوروں پر سخت نگرانی تھی۔ سُستانا، گڑگڑی کے کش لگانا، دن میں دو دفعہ سے زیادہ پیشاب کے لیے کام کو چھوڑنا قواعد کے خلاف تھا۔ بچوں کو ایک دفعہ سے زیادہ دودھ پلانے کی اجازت نہ تھی۔ مادریت کے پھلنے پھولنے یا پیدائش کی شرح کا کسی کو خیال نہ تھا۔ اور نہ حکومت کی طرف سے کوئی آسائش مہیا تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بلکتے ہوئے بچے بھوک سے نڈھال

ہوکر مر جائیں گے۔

جمعدار رام اوتار کی مدد سے میں پگڈنڈی پر پڑی ہوئی روڑی کو ناپنے لگا۔ روڑی ساڑھے تین فٹ چوڑی، آٹھ فٹ لمبی اور ایک فٹ گہری تھی۔ اور میرے اندازے کے مطابق ایک بڑے سے بیضوی گڑھے کے لیے کافی تھی۔ اس وقت میں نے ماتا دین کو اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہوکر سُستانے کی خاطر بیٹھتے دیکھا۔ ماتا دین ایک ادھیڑ کا پوربی مزدور تھا۔ ذات اس کی کوری تھی۔ جسم کے لحاظ سے وہ باقی مزدوروں سے کہیں اچھا تھا۔ دھوپ میں ماتا دین کا پسینے سے شرابور سیاہ رنگت کا عریاں تنومند جسم کانسے کے ایک بڑے سے مجسّمے کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

ماتا دین کو اس حالت میں دیکھ کر میں نے ٹیپ کو جمعدار رام اوتار کے حوالے کیا اور 'روڈاپ' کو پھلانگ کر ماتا دین کے پاس جا پہنچا اور بلند آواز سے چیخا۔

''ہے۔۔۔۔ ماتا دین!''

ماتا دین گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، اور اپنی خمار آلود نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے بولا ''مالک!''

''ہاں! مالک۔۔ آرام کر رہے تھے نا؟۔۔۔ شاید تم عرفانی کے مزاج سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے۔''

''رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ اس لیے جرا۔۔۔''

''یہ کوئی وجہ نہیں۔''

ماتا دین ایک مہیب انداز سے مسکرا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، اس کے بدشکل چہرے میں مسوڑے پھول کر بڑے بڑے گھناؤنے دانتوں کو گویا چھوڑ رہے تھے۔ وہ روڑی کو ٹتے ہوئے بولا۔

''کام چور نہیں ہوں مالک۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں میں تو دوٹکیوں میں کام کیے جاتا ہوں۔ مگر۔۔۔''

ماتا دین ایک ایمان دار مزدور تھا۔ وہ باقی مزدوروں سے زیادہ ذہین تھا۔ اسے دوبارہ بات سمجھانے کی ضرورت کبھی نہیں پیش آئی تھی۔ صبح جب اسی سڑک پر سورج کی پہلی ٹکیہ مشرق کی طرف نرسری کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوتی، اس وقت سے لے کر شام تک جب کہ دوسری ٹکیہ مغرب کی طرف شہر کے مکانوں کے بے ربط منڈیروں کی طلائی مغزی ادھیڑتے ہوءڈوب جاتی، وہ دوٹکیوں میں برابر کام کیے جاتا۔ اسی اثنا میں گردوغبار سے سینہ صاف کرنے کے لیے ماتا دین کوڑی بھر پشاوری گڑ کھاتا۔ اور چھپ کر ایک آدھ گڑگڑی کا کش لگاتا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے دن لیے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

عرفانی نظر سے اوجھل کھڑا تھا۔ اپنی ذمے داری کا احساس دلانے کے بعد میں نے ماتا دین سے پوچھا۔

''عرصے سے من بھری ان عورتوں میں دکھائی نہیں دیتی۔۔۔ اچھی تو ہے نا؟''

''اجی کہاں اچھی ہے۔'' ماتا دین بولا، اسی کے لیے تو رات کو جاگنا پڑتا ہے اور دن کو میری یہ دسا ہوتی ہے۔''

مجھے ایک مخدوش سے قطعۂ زمین کی طرف موجہ ہونا پڑا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سڑک کے ایک دم مغرب کی طرف مڑ جانے کی وجہ سے انجن کے پہیے پہنچنے سے قاصر تھے مگر یوں توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے ماتا دین بولا، '' مالکا سے بیری ہوگئی ہے۔ شاید مجھے یہ نوکری چھوڑنی پڑے۔''

''بیری بیری؟'' میں نے اپنے شانوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا، ''میں نہیں جانتا بیری بیری کیا ہوتی ہے؟''

ماتا دین بولا،

''آپ بیری بیری بھی نہیں جانتے۔۔۔ آپ سے پڑھے لکھے آدمی نہ جانیں گے تو اور کون جانے گا؟''

۔۔۔ ایک مستعار سی مسکراہٹ ماتا دین کے چہرے پر لڑھکنے لگی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی دھوتی کے ایک پلّے کو کمر سے نکالا اور کپڑے کی کئی تہوں میں سے کاغذ کے ایک خستہ ٹکڑے کو برآمد کرتے ہوئے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ لال جی بھارتی جی خیراتی ہسپتال کی تشخیصی پرچی تھی۔ مرض کا نام بیری بیری لکھا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پٹھوں میں ورم ہو جانے کو بیری بیری کہتے ہیں اور یہ مرض خوراک میں وٹامن 'بی' کے کافی مقدار میں موجود نہ ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔

''تو کیا من بھری کے پٹھوں میں ورم ہو چکے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

ماتا دین نے انگوٹھے اور انگلی سے ایک بڑے سے سوراخ کی شکل پیدا کرتے ہوئے کہا، ''اِتے بڑے۔۔۔ سرکار۔''

میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

ماتا دین کہنے لگا، ''اسے کھوراک اچھی نہیں ملتی۔۔۔ ڈاک ٹر کی رپٹ دیکھی ہے نا آپ نے؟ اس نے گول مانس، انڈے، مکھن اور پنیر کھلانے کے لیے کہا ہے۔''

اس وقت میں سوچنے لگا۔ بھلا روکھی سوکھی دال چپاتی میں سے من بھری کیوں کر وٹامن 'بی' اخذ کر سکتی ہے۔ اگرچہ کوری، کرمی اور نیچ ذات کے پوربی لوگ گوشت کھا لیتے ہیں۔ مگر ماتا دین پٹھوں کا نرم نرم گوشت، انڈے مکھن، پنیر، ٹماٹر اور اس قسم کی امیرانہ خوراک کہاں سے مہیا کرے گا۔ جہاں تک میرا خیال تھا، اس نے تو عرصے سے سبزی بھی استعمال نہ کی تھی اور اپنے گاؤں کے کسی بھائی بند کے ہاتھ مُسور کی دال منگوا رکھی تھی، جسے وہ صبح و شام کھاتا تھا۔ تبھی تو اسے دانتوں کی سکروی (Scurvy) تھی۔ سکروی، خوراک میں وٹامن 'سی' کے مفقود ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس کے مسوڑھے بہت زیادہ پھول کر ٹیڑھے میڑھے دانتوں کو چھوڑ رہے تھے۔ میں نے کہا، ''خواہ کسی ماتا دین یا گنگا دین کی جورو من بھری سے زیادہ خوب صورت ہو اور کوئی اس کے لیے ماتا دین سے زیادہ جفاکشی کرے۔ مکھن، پنیر

کی سی خوراک مہیا نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد میں اس ڈاکٹر کی حماقت پر ہنسنے لگا، جس نے بیری بیری کا نام ماتا دین کے ذہن نشین کرا دیا تھا اور اس قسم کی خوراک بطور علاج لکھ دی تھی۔ ماتا دین کے بیان کے مطابق ڈکٹر کا اپنا رنگ، سنگر پھی، (شنگرفی) ہو رہا تھا۔ 'کوئی جانے کھون پھٹ کر باہر آ جائے۔' ڈاکٹر نے ماتا دین کو وہ دوائی کی بوتل بھی دکھائی تھی جس میں وٹامن 'بی' کا جزو کافی مقدار میں موجود تھا۔

یکا یک مجھے یاد آیا۔ ماتا دین کام چھوڑنے کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''تم یہاں سے کام چھوڑ دو گے۔۔۔ کہاں جاؤ گے ماتا دین؟''

''چھاؤنی میں مالک!۔۔۔ وہاں ڈنڈی وار کے پاس ٹلا جم ہو جاؤں گا۔ ڈنڈی دار تمھاری طرح مہربان ہے۔''

پھر ماتا دین نے مجھے بتایا کہ ایجرٹن روڈ اور ایبٹ روڈ کی مرمت سے پہلے جہاں لاٹ صاحب کا دفتر بن رہا تھا۔ وہاں ماتا دین اور من بھری کام کر رہے تھے، ڈنڈی دار اُدھر آ نکلا۔ دھوپ میں بیٹھی ہوئی من بھری کو دیکھ کر ماتا دین سے بولا، ''اس بچاری کو کیوں تکلیف دیتے ہو، میرے ساتھ چھاؤنی چلو، سٹور میں بہت سے قلی چاہئیں۔ تمھیں رکھ لیں گے، پیسے اچھے مل جائیں گے۔''

پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اس نے کھوراک دینے کا بھی وعدہ کیا مالک۔۔۔ اسٹور میں کام کرنے والے ڈنڈی دار آنکھ بچا کر وہاں سے بہت کچھ اڑا سکتے ہیں۔ مس (Mess) میں سے پنیر، انڈے وغیرہ بھی لے سکتے ہیں۔ کم از کم راسن میں سے تو کچھ ان کے پلّے پڑ ہی جاتا ہے۔''

میں نے سوچا، شاید ماتا دین کو وہاں سے وٹامن 'سی' بھی مل سکیں اور اس کی سکروی بھی دور ہو جائے۔ میس میں کاہو، گوبھی، کرم کلا، شلجم، رام ترئی سبھی کچھ تو آتا ہے۔

ایک محنتی مزدور کو کھو دینے پر ضرور رنج ہوتا ہے۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ ماتا دین کو کسی صورت بھی اس کے ارادے سے باز رکھوں، کون جانے من بھری کی بیری بیری کا علاج ہو جائے اور پھر وہ بھی 'سنگر پھی' ہو جائے۔

چند دنوں بعد میں عرفانی کا معتبر ملازم ہو گیا۔

ایک پرانے قبرستان میں ہمارے بزرگوں کو ہڈیوں اور ایک مسمار سی گڑھی کے کھنڈروں میں سے ایک سرکاری عمارت آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگی۔ میرے ہاتھ میں وہی پُرانا ٹیپ تھا۔ بسا اوقات مجھے بنیادوں کے اندر گھس کھدائی کی پیمائش کرنی ہوتی اور کبھی کندہ کاروں اور سنگتراشوں کے کام کا جائزہ لینا ہوتا۔

عرفانی نے تمام بچوں والی عورتوں کو کام سے علیحدہ کر دیا تھا۔ جو عورتیں ملازم رکھی گئی تھیں وہ پیسے کم لے کر مردوں کے برابر کام کرتی تھیں۔

جب سرکاری تعمیر کی چھت پر لنٹل ڈالنا پڑا تو چند ایک مزید مزدوروں کی ضرورت لاحق ہوئی۔ یہ کام عرفانی نے میرے سپرد کیا۔ مجھے چند محنتی اور ایمان دار مزدوروں کی ضرورت تھی۔ میں نے جمعدار رام اوتار سے ماتا دین کا پتہ پوچھا۔ کالے جمعدار نے مشکوک نگاہوں یا نگاہ سے میری طرف دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے ماتا دین کا پتہ بتا دیا اور میں اس کی تلاش میں چھاؤنی جا پہنچا۔

شام کا وقت تھا۔ صدر بازار کی بجلیاں ابھی روشن نہ ہوئی تھیں۔ ایک گہرا دھواں مزدوروں کی گنجان بستی لال کُرتی اور فالور لائنز پر چھایا ہوا تھا۔ اور وقت سے پہلے تیرگی پیدا کر رہا تھا۔ بڑی دقت کے بعد مجھے ماتا دین کی جھونپڑی ملی۔ ایک بیٹھے ہوئے چھپّر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا اور جھونپڑی میں ماتا دین گڑ گڑی سلگائے تمباکو پی رہا تھا۔ ایک خاص قسم کی بُو سب طرف پھیلی ہوئی تھی، ماتا دین کے قریب ایک کوڑی بھر مکھن پڑا تھا۔ ایلومنیم کی ایک تھالی میں ایک بڑا سا گوبھی کا پھول رکھا تھا اور پھول میں سے ایک سنڈی کچھ چپ چپا، لسلسا سا لعاب اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی تھالی کے کنارے کنارے رینگ رہی تھی۔

وٹامن 'سی' سے تہی ایک مسکراہٹ ماتا دین کے ٹیڑھے میڑھے دانتوں اور پھولے ہوئے مسوڑھوں کو دکھانے لگی۔ عین اس وقت جھونپڑی کے اندر سے کراہنے کی آواز آئی۔

میں نے جھونپڑی کے اندر ایک تاریک سے کمرے میں جھانکا، اس کمرے میں من بھری پڑی تھی۔ وہاں ہوا اور روشنی کی پہنچ نہ تھی۔ میں نے کہا، مہربان ڈنڈی دار کی مہربانی سے من بھری کو خوراک تو اچھی مل جاتی ہے۔ ممکن ہے اسے بیری بیری سے نجات حاصل ہو جائے تو بھی اس سے قسم کی فضا میں ضرور وہ کسی اور خوف ناک بیماری کا شکار ہو جائے گی۔ دنیا میں خوراک ہی سب کچھ نہیں، روشنی بھی تو ہے۔ کھلی ہوا ہے۔۔۔ اور دِق ہے!

یک لخت روشنی سے اندھیرے میں چلے جانے پر مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر آہستہ آہستہ من بھری کا سہما ہوا چہرہ اور مسلوب جسم نظر آنے لگا۔ اپنے کتابی اور سنگِ یشب کی طرح زرد چہرے کے ساتھ من بھری ہو بہو اس مصری لاش کی مانند دکھائی دیتی جس پر ابھی ابھی حنوطی عمل کیا گیا ہو اور جسے نسلوں تک محفوظ رکھے جانے کے لیے ممی میں اُتارا جانا ہو!

ماتا دین نے گڑ گڑی کا ایک لمبا کش لگایا اور برتن میں سے سنڈی نکال کر باہر پھینک دی۔ گوبھی کو چیرا، اور مسالحہ بھونتے ہوئے اسے تسے میں ڈال دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی جورو کے بیمار ہونے کی وجہ سے ڈنڈی دار اسے بہت

کم کام دیتا ہے۔ تمام قلی افسروں کو ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مگر اسے افسروں کے نزدیک جانے کا کام ہی نہیں دیا جاتا۔ 'اسٹور کیپر' ڈنڈی دار کا سگا ماموں ہے، راشن میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ آخر ڈنڈی دار کتنا اچھا آدمی ہے، ایسے چند آدمیوں کے سہارے ہی تو دنیا جیتی ہے۔

پھر میرے قریب آتے ہوئے ماتا دین بولا، ''ایک کھُسی کی کھبر سناؤں مالک؟'' اور پھر میرے کان کے قریب منہ لاتے ہوئے بولا، ''وہ امید سے ہے۔''

ماتا دین کے بیان کے مطابق ساڑھے تیرہ برس بیاہ کو آئے تھے، اور اس وقت تک اولاد کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میری دانست میں تو یہ ماتا دین کی خوش قسمتی تھی۔ غریب طبقے کے لوگ عموماً کثرتِ اولاد سے نالاں ہوتے ہیں، ان کے لیے تو ایک بچہ بھی بوجھ ہوسکتا ہے۔ مگر ماتا دین خوش تھا۔ میں نے سوچا شاید من بھری پہلے سے بھی زیادہ بیمار ہوجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد اس کی کچھ بیماریاں قدرتی طور پر دور ہوجائیں۔ بہرصورت من بھری کے عرصے تک بیمار رہنے یا زچگی میں ماتا دین کو اکیلے ہی گھر کا جوا اُٹھانا پڑے گا۔ علاوہ اس کے خرچ بھی دوگنا ہوجائے گا۔

ماتا دین کی اس عجیب وغریب زندگی میں کھو کر میں اپنے کام کو بھی بھول گیا۔ میں نے کہا ڈنڈی دار کی مہربانی سے ان لوگوں کو وٹامن 'بی' اور 'سی' دونوں مل جاتے ہیں۔ ان کی خوشی۔۔۔ بچے کی امید، بھی شاید وٹامن 'بی' کا کرشمہ ہے اور بچے کو بھی اس کے مقدر کا سب کچھ مل جائے گا۔ اب وہ عرفانی کی مزدوری ہی نہیں کرے گا۔ اسے پرواہی کیا ہے۔ میں نے اس کے سامنے مزدوری کا تذکرہ ہی نہ کیا۔ گویا میں اسے یوں ہی دیکھنے آیا تھا۔

عرفانی کا مال واسباب شہر میں لے جانے کے لیے چھکڑوں میں سے دو ایک بیل زخمی تھے، پھر بھی ان سے برابر کام لیا جارہا تھا۔ انجمن تحفظِ جانوراں کے ایک افسر نے گاڑی بانوں کا چالان کردیا۔ اس قضیے کو نمٹانے کا کام بھی میرے سپرد کیا گیا اور میں انجمن کے ایک افسر کو رشوت دینے میں مصروف تھا۔

ایک طرف سے ماتا دین ہانپتا ہوا آنکلا، وہ بمشکل پہنچانا تھا۔ اس چند ماہ کے عرصے میں اس کی شکل یکسر تبدیل ہوگئی تھی۔ اس کے دانت زیادہ گھناؤنے ہوگئے تھے اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کا چہرہ اچھی طرح دیکھنے کے لیے وہ بار بار آنکھیں جھپکاتا تھا۔ پہلے تو وہ چند لمحات مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر میری آواز کو پہچان کر بولا۔

''مالک۔۔۔! رام اوتار کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔ وہ کہتا تھا، آپ کو مجوری چاہیے۔ میرا چھوٹا بھائی آپ کے پاس کام کر ہی رہا ہے، مجھے بھی رکھ لو۔''

میں اپنی جگہ پر سے اُچھل پڑا۔ بھلا دو ٹکیوں میں کام کیے جانے والے ماتا دین کو کون مزدور نہ رکھے گا لیکن میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا ڈنڈی دار کا راشن ختم ہو گیا ہے؟''

ماتا دین کچھ نہ بولا۔

''کیا تمہیں خوراک نہیں ملتی اب؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

ماتا دین آنکھیں جھپکتا ہوا انجمن تحفظِ جانوراں کے افسر کی طرف دیکھنے لگا، وہ افسر جان گیا کہ یہ مزدور کچھ کہنا چاہتا ہے مگر اس کی موجودگی نہیں چاہتا۔ وہ خود بخود وہاں سے ہٹ گیا۔ اور ایک کچی دیوار کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا ۔ ماتا دین بولا۔

''کیا کہوں مالک! ۔۔۔ ڈنڈی دار نے تو ہماری جندگی برباد کر دی ۔۔۔ کسی کو سکل سے کوئی کیا جانے۔ بڑا بدماس تھا۔ جب مجھے کام کرتے ہوئے چند روز ہو گئے تو کہنے لگا قلیوں کے اسٹور کیپر کو سکایت کر دی ہے، پھر بھی میں تمھیں تکلیف نہیں ہونے دوں گا، تمھیں سب کچھ گھر پہنچا دیا کروں گا۔ دو تین دفعہ گھر پہنچا تو مجھ سے پہلے وہاں موجود تھا۔''

''اور من بھری کہاں تھی؟'' میں نے دم روکتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی اندر تھی ۔۔۔ سیدھی سادھی عورت ۔۔۔ جھانسے میں آ گئی، سرکار ہم اِجّت والے آدمی ہیں۔ جب میں نے کھری کھری سنائیں تو ڈنڈی دار نے کھوراک دینی بند کر دی اور دوسروں سے تگنا کام لینے لگا۔ اپھسر جھڑکنے لگے۔ گلی تنگ کرنے لگے۔ میں نے اس کی مجوری چھوڑ دی اور گودام میں کام کرنے لگا۔''

پھر ماتا دین نے اپنا شانہ برہنہ کیا۔ اس پر ایک بڑے سے زخم میں چربی دکھائی دے رہی تھی۔ ماتا دین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''یہ بعد میں میس کی بوریاں اُٹھانے سے ہوا ۔۔۔ میری جان ہی تو نکل جاتی، اگر میں وہاں سے مُلاجمت نہ چھوڑتا ۔۔۔ میں نے بدنامی بھی سہی مالک ۔۔۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔''

انجمن تحفظ جانوراں کا انسپکٹر قریب آ چکا تھا۔ میں نے پانچ کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں دیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ تمام کام ٹھیک ٹھاک کر دینے کا وعدہ دیا۔ اس وقت مجھے، من بھری کے ہونے والے بچے اور اس کے مستقبل کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ماتا دین کا برہنہ شانہ اب بھی میرے سامنے تھا۔ میں نے انجمن تحفظِ جانوراں کے انسپکٹر کو ماتا دین کا شانہ دکھاتے ہوئے پوچھا، ''کیا آپ کا محکمہ ایسے ظلم کا انسداد نہیں کرتا؟'' انسپکٹر صاحب نے جیب میں پانچ کا نوٹ ٹٹولتے اور اپنے پالش کیے ہوئے بوٹوں پر چھڑی مارتے ہوئے کہا، ''چودھری صاحب قبلہ ۔۔۔ وہ تو صاف جانوروں کے لیے ہے۔'' اور میں نے ماتا دین کو مزدور رکھ لیا۔

سڑکوں اور عمارتوں کے چیف انجینئر نے عرفانی کی بنائی ہوئی ایجرٹن روڈ ناقص قرار دی۔ چیف انجینئر کے ساتھ رشوت نہ چل سکی اور ایک دفعہ پھر ایجرٹن روڈ پر 'روڈ اَپ' کے بورڈ رکھ دیے گئے۔

پھر نرسری میں چند ایک چھوکرے سڑک پر سر کنکر اٹھا اٹھا کر انھیں ہوا میں چھوڑتے ہوئے دکھائی دینے لگے، وہ گوپھیے کو چھوڑتے ہوئے اونچی آواز سے 'اللہ اکبر' پکارتے سنائی دیتے تھے۔۔۔ ماتا دین کا چھوٹا بھائی مینسر کام کرنے کے بعد دو ایک کولتار کے خالی ٹینوں کے پیچھے پڑ سُستانے لگا۔ 'روڈ اَپ' کو پھلانگتے ہوئے میں اس کے پاس پہنچا۔ میں نے چلاتے ہوئے کہا ''ہے۔۔۔ مینسر!''

مینسر گھبرا کر بولا۔ ''مالک!''

''ہاں۔۔۔ مالک۔۔۔!'' میں نے کہا۔ ''سُستا رہا تھا نا؟ اور ماتا دین کہاں ہے؟ اس کے چار دن سے غیر حاضری لگ رہی ہے۔''

مینسر نے دبی آواز سے کہا۔۔۔ ''ماتا دین حوالات میں ہے سرکار۔''

۔۔۔ میں اپنی جگہ پر سے اُچھل پڑا۔ ''حوالات میں؟''

مینسر نے بتایا کہ ماتا دین نے ایک ڈاکٹر کے ہاں چوری کی، اور بھاوج کو ایک سفید دوائی پلائی۔ بعد میں پکڑا گیا، پولیس آئی تو ڈبّہ گھر میں ملا، بھاوج اس میں سے آدھی دوائی کھا چکی تھی۔۔۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میں نے گھوم کر کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھا۔ مجھے وہ سب کی سب بیمار دکھائی دینے لگیں، گویا انھیں بڑے بڑے ورم ہو رہے ہیں۔ میرے تصور میں من بھری کا سنگِ یشب کی طرح زرد چہرہ ظاہر ہو گیا۔ مجھے ماتا دین سے بہت دل چسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں حوالات میں گیا تو دیکھا کہ ماتا دین مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ مستعار نہ تھی۔ اسے اپنی قید کی رتّی بھر بھی پروانہ تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس کے ورم درست ہو جائیں گے۔ وہ خوش تھا کہ مینسر کے ہاں وہ آرام سے رہ کر ایک تن درست بچے کو جنم دے گی۔۔۔ مگر ماتا دین کیا جانے کہ شدتِ غم سے من بھری کا حمل گر چکا ہے۔ وہ مینسر کے بازوؤں میں زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے، اور خون سے مینسر کی جھونپڑی کی تمام زمین شنگرفی ہو رہی ہے!

☆☆☆

تلادان

دھوبی کے گھر کہیں گوراچٹا چھوکر پیدا ہوجائے تو اس کا نام بابو رکھ دیتے ہیں۔۔۔سادھورام کے گھر بابو نے جنم لیا اور یہ صرف بابو کی شکل وصورت پر ہی موقوف نہیں تھا۔ جب وہ بڑا ہوتو اس کی تمام عادتیں بابوؤں جیسی تھیں۔ ماں کو حقارت سے 'اے بُو' اور باپ کو 'چل بے' کہنا اس نے نہ جانے کہاں سے سیکھ لیا تھا۔ وہ اس کی رعونت سے بھری ہوئی آواز، پھونک پھونک کر پاؤں رکھنا، جوتوں سمیت چوکے میں چلے جانا، دودھ کے ساتھ بالائی نہ کھانا، سبھی صفات بابوؤں والی ہی تو تھیں۔ جب وہ تحکمانہ انداز سے بولتا اور 'چل بے' کہتا تو سادھورام ''خی خی۔۔۔ بلکل بابو۔'' کہہ کر اپنے زرد دانت نکال دیتا اور پھر خاموش ہوجاتا۔

بابو جب سکھ نندن، امرت اور دورے امیر زادوں میں کھیلتا تو کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ یہ اس مالا کا منکا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایشور نے سب جیو جنتو کو ننگا کر کے اس دنیا میں بھیج دیا ہے۔ کوئی بولی ٹھولی نہیں دی۔ یہ نادار، لکھ پتی، مہابراہمن، بھنوٹ، ہریجن، لنگوا فرینکا سب کچھ بعد میں لوگوں نے خود ہی ایجاد کیا ہے۔

بدھئی کے پُروا میں سکھ نندن کے ماں باپ کھاتے پیتے آدمی تھے اور سادھورام اور دوسرے آدمی انھیں کھاتے پینے دیکھنے والے سکھ نندن کا جنم دن آیا تو پُروا کے بڑے بڑے نیتا گگن دیو بھنڈاری، ڈال چند، گنپت، مہابراہمن وغیرہ کھانے پر مدعو کیے گئے۔ ڈال چند اور گنپت مہابراہمن دونوں موٹے آدمی تھے اور قریب قریب ہر ایک دعوت میں دیکھے جاتے تھے۔ ان کی اُبھری ہوئی توند کے نیچے پتلی سی دھوتی میں لنگوٹ، بھاری بھر کم جسم پر ہلکا سا جنیو، لمبی چوٹی، چندن کا ٹیکا دیکھ کر بابو جلتا تھا اور بھلا یہ بھی کوئی جلنے کی بات تھی۔ شاید ایک ننھا سا نازک بدن بابو بننے کے بعد انسان ایک بدزیب بے ڈول سا پنڈت بننا چاہتا ہے۔۔۔ اور پنڈت بننے کے بعد ایک پست ضمیر گناہ گار انسان اور اچھوت۔۔۔ ڈال چند اور گنپت مہابراہمن کے چلن کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ یہ انسانی فطرت کی نیرنگی ہر جگہ کرشمے دکھاتی ہے۔

بابو نے دیکھا۔ جہاں بھنڈاری اور مہابراہمن، بھنوٹ آئے ہوئے تھے۔ وہاں عمداں مراسن، ہرکھو، جڑی دادا کارندے اور دو تین جھوٹی پلیٹیں اور دونے اٹھانے والے جھیور بھی دکھائی دے رہے تھے۔ جب دس پندرہ آدمی کھانے سے فارغ ہوجاتے تو جھیور پلیٹوں اور دونوں سے بچی کھچی چیزیں ایک جگہ اکھٹی کرتے۔

جمعدرانی صحن میں چادر کا ایک پلّو بچھائے بیٹھی تھی۔ وہ سب بچی کھچی چیزیں، حلوا، دال، توڑے ہوئے لقمے، پکوڑیاں ملے ہوئے آلو مٹر اور چاول اس بچھی ہوئی چادر یا ایلومنیم کے ایک بڑے سے زنگ آلود تسلے میں ڈال دیتے۔ اس کے سامنے سب چیزیں کھچڑی دیکھ کر بابو نہ رہ سکا۔ بولا:

''جمعدارنی۔۔۔ کیسے کھاؤ گی یہ چیزیں؟''

جمعدارنی ہنس پڑی۔ ناک سکیڑتی ہوئی بولی، ''جیسے تم روٹی کھاتے ہو۔''

اس عجیب اور سادہ سے جواب سے بابو کی رعونت کو ٹھیس لگی۔ بولا، ''کتنی ناسمجھ ہو تم۔۔۔ اتنی سی بات نہ سمجھیں۔ تبھی تو تم لوگ جوتوں میں بیٹھنے کے لائق ہو۔''

حلال خوری کی اکڑ زبان زدِ عوام ہے۔ ماتھے پر تیور چڑھاتے ہوئے جمعدارنی بولی۔

''اور تم تو عرش پر بیٹھنے کے لائق ہو۔۔۔ ہے نا؟''

''یوں ہی خفا ہو گئیں تم تو۔'' بابو بولا ''میرا مطلب تھا سالن میں حلوا، پکوڑیوں میں آلو مٹر، پلاؤ میں فرنی، یہ تمام چیزیں کھچڑی نہیں بن گئیں کیا؟''

جمعدارنی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بھنڈاری اور مہابراہمن کو اچھی جگہ پر بٹھایا گیا۔ وہ سادھوؤں کی سی رودرکش کی مالا گلے میں ڈالے کنکھیوں سے بار بار عمداں اور جمعدارنی کی طرف دیکھتے رہے۔ عمداں جمعدارنی کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ہرکھو، جڑئی، دادا دھوپ میں بیٹھے ہوئے کھاتے پیتے آدمیوں کا منہ دیکھ رہے تھے۔ کب وہ سب کھا چکیں تو انھیں بھی کچھ میسر ہو۔ بابو نے دیکھا عمداں کے قریب ہی ایندھن کی اوٹ میں اس کی اپنی ماں بیٹھی تھی۔ اس کے قریب برتن مانجھنے کے لیے راکھ اور نیم سوختہ اُپلے پڑے تھے اور راکھ سے اس کا لہنگا خراب ہو رہا تھا۔ قمیص بھی خراب ہو رہی تھی۔ خیر قمیص کی تو کوئی بات نہ تھی۔ وہ تو کسی کی تھی اور دھلنے کے لیے آئی تھی۔ ایک دفعہ دھو کر بابو کی ماں نے پہن لی تو کچھ بگڑ نہیں گیا۔ پرماتما بھلا کرے بادلوں کا کہ انہی کی مہربانی سے ایسا موقع میسر ہوا۔

جب اپنے دوست سکھی نندن کو ملنے کے لیے بابو نے آگے بڑھنا چاہا تو ایک شخص نے اسے چپت دکھا کر وہیں روک دیا اور کہا، ''خبردار! دھوبی کے بچے۔۔۔ دیکھتا نہیں، کدھر جا رہا ہے؟'' بابو تھم گیا۔ سوچنے لگا کہ اس کے ساتھ لے یا نہ لڑے۔ جھیور کا تنومند جسم دیکھ کر دب گیا اور یوں بھی وہ ابھی بچہ تھا۔ بھلا اتنے بڑے آدمی کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس نے ایک اُداس اُچٹتی ہوئی نظر سے اچھی جگہ پر بیٹھ کر کھانے والوں اور نیم سوختہ اُپلوں کی راکھ اور جوتوں میں پڑے ہوئے انسانوں کو دیکھا اور دل میں کہا۔ اگرچہ سب ننگے پیدا ہوئے ہیں مگر ایک کارندے اور

براہمن میں کتنا فرق ہے۔

پھر دل میں کہنے لگا۔ سکھ نندن اور بابو میں کتنا فرق ہے۔ اور ہلکی سی ایک ٹیس اس کے کلیجے میں اٹھی۔ حقیقت تو بابو کے سامنے تھی۔ مگر اتنی مکروہ شکل میں کہ وہ خود اسے دیکھنے سے گھبراتا تھا۔ بابو دل ہی دل میں کہنے لگا۔'' ہم لوگوں کے کارن ہی تو یہ لوگ جیتے ہیں۔ دن کی طرح اُجلے اُجلے کپڑے پہنتے ہیں۔۔۔'' دراصل بابو کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہی پکوڑیاں، حلوا مانڈے کے خیال میں۔۔۔ مگر وہ حقیقت تو کیا وہ اپنے وجود سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ گرم گرم پوریوں کی صبر آزما خوشبو اس کے دماغ میں بسی جا رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر عمداں پر پڑی۔ عمداں کی نظر بھی ٹوکری میں گھی میں بسی ہوئی پوریوں کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ جب سکھ نندن کی ماں قریب سے گزری تو اس کی متوجہ کرنے کے لیے عمداں بولی۔

''ججمانی۔۔۔ ذرا حلوائی کو ڈانٹو تو۔۔۔ اے دیکھتیں نہیں، کتنا گھی بہہ رہا ہے جمین (زمین) پر۔''

ججمانی کڑک کر بولی۔

''ارے او کشنو۔۔۔ حلوائی کو کہنا۔ ذرا پوریاں کڑھائی میں دبائے رکھے۔''

بابو ہنسنے لگا۔ عمداں کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ بابو جانتا تھا کہ عمداں وہ سب باتیں محض اس وجہ سے کر رہی ہے کہ اسکا اپنا جی پوریاں کھانے کو بہت چاہتا ہے۔ گو ججمانی کی توجہ کو کھینچنے والے فقرے سے اس کی خواہش کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ متعجب تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس طرح اس نے عمداں کے ان غیر متعلق لفظوں میں چھپے ہوئے اصلی مطلب کو پالیا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ اس کی خاموشی میں کوئی اس کی بات کو پالے۔ آخر خاموشی گفتگو سے زیادہ معنی خیز ہوتی ہے۔

اس وقت سُکھ نندن تُل رہا تھا۔ خوب صورت ترازو کے ایک پلڑے میں بیٹھا چاروں طرف دیکھ کر مسکراتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف گندم کا انبار لگا تھا۔ گندم کے علاوہ چاول باسمتی، چنے، اُڑد، موٹے ماش اور دوسری اس قسم کی اجناس بھی موجود تھیں۔ سُکھ نندن کو تول تول کر لوگوں میں اجناس بانٹی جا رہی تھیں۔ بابو کی ماں نے بھی پلّو بچھایا۔ اسے گندم کی دھڑی مل گئی۔ وہ سکھ نندن کی درازیِ عمر کی دعائیں مانگتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ بابو نے نفرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو۔ چھی! تمھیں کپڑوں کی دھلائی پر قناعت ہی نہیں تبھی تو ہر ایک کی میل نکالنے کا کام ایشور نے تمھارے سپرد کر دیا ہے اور تم بھی جمعدارنی کی طرح جوتوں میں بیٹھنے کے لائق ہو۔ تمھاری کوکھ سے پیدا ہو جانے والے بابو کو چلچلاتی دھوپ میں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ آگے بڑھنے پر لوگ اسے چپت دکھاتے ہیں۔ ہائے! تیری یہ پھٹی ہوئی، بے قناعت آنکھیں گندم سے نہیں، قبر کی مٹی سے پُر ہوں گی۔ قریب سے ماں گزری تو بابو بولا'' اے یو!''

پھر سوچنے لگا۔ رام جانے میرا جنم دن کیوں نہیں آتا؟ میری ماں مجھے کبھی نہیں تولتی۔ جب سُکھ نندن کو اس

کے جنم دن کے موقع پر تول کر اجناس کا دان کیا جاتا ہے تو اس کی سبھی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ اسے سردی میں برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی اور گرمیوں میں بھیجا جلا دینے والی دھوپ میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا۔ بالوں میں لگانے کے لیے خاص لکھنؤ سے منگوایا ہوا آملے کا تیل ملتا ہے۔ جیب پیسوں سے بھری رہتی ہے۔ بخلاف اس کے میں تمام دن صابن کی جھاگ بناتا رہتا ہوں۔ سکھ نندن اس لیے پانی کی بلبلوں کو پسند کرتا ہے کہ وہ بلبلے اور ان میں چمکنے والے رنگ اسے ہر روز نہیں دیکھنے پڑتے یوں کپڑے نہیں دھونے ہوتے۔۔۔ سکھی کی دنیا کو کتنی ضرورت ہے۔ خاص کر اس کے ماں باپ کو۔۔۔ میرے ماں باپ کو میری ذرا بھی ضرورت نہیں۔ ورنہ وہ مجھے بھی جنم دن کے موقع پر یوں ہی تولتے۔ اور جب سے ننھی پیدا ہوگئی ہے۔۔۔ کہتے ہیں بلا ضرورت دنیا میں بھی کوئی پیدا نہیں ہوا۔ یہ بھتوا جو نالی کے کنارے اُگ رہا ہے۔ بظاہر ایک فضول سا پودا ہے جب اس کی بھُجیا بنتی ہے تو مزہ ہی آ جاتا ہے۔۔۔ اور پوریاں!

بابو کی ماں نے آواز دی۔

''بابو۔۔۔ ارے او بابو!''

س وقت سکھ نندن بابو کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اب بابو کو امید بندھی کہ وہ خوب ضیافت اُڑا سکے گا۔ بابو اس چُبھنے والی دھوپ کو بھی بھول گیا جو برسات کے بعد تھوڑے عرصے کے لیے نکلتی ہے اور اسی عرصے میں اپنی تب و تاب ختم کر دینا چاہتی ہے۔ اس نے ماں کی آواز پر کان نہ دھرا۔ اور کان دھرتا بھی کیوں؟ ماں کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ ضرورت ہوتی تو وہ اس کا جنم دن نہ مناتی؟ وہ تو شاید اس دن کو کوستی ہوگی جس دن وہ پیدا ہوگیا۔۔۔ اگرچہ بھتورے کی بھجیا بڑی ذائقے دار ہوتی ہے۔

''بابو۔۔۔ ارے ابو بابو کے بچے! آتا کیوں نہیں؟'' بابو کی ماں کی آواز آئی۔

''بابو جاؤ۔۔۔ ابھی میں نہیں آ سکتا۔'' سکھ نندن نے کہا اور پھر ایک مغرورانہ انداز سے اپنے زرد وختہ کوٹ اور بابو کو دیکھتا ہوا بولا ''کل آنا بھائی۔۔۔ دیکھتے نہیں ہو، آج بھی فرصت ہے؟ جاؤ۔''

عمداں کو پوریاں مل گئی تھیں۔ وہ جھانی کو فرشی سلام کر رہی تھی۔ بابو نے سوچا تھا کہ شاید مسکراتا ہوا سکھ نندن اس کی خاموشی میں اس کے من کی بات پالے گا۔ مگر سکھ نندن کو آج بابو کا خیال کہاں آتا تھا۔ آج ہر چھوٹے بڑے کو سکھی کی ضرورت تھی لیکن سکھی کو کسی کی ضرورت نہ تھی۔ اپنی عظمت اور بابو کے سادہ اور بوسیدہ ٹاٹ کے سے کپڑوں کو دیکھ کر شاید وہ اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اپنی عدیم الفرصتی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے گویا بابو کی رہی سہی

رعونت کو مٹی میں ملا دیا۔ پھر بابو کی ماں کی کرخت آواز آئی۔

''بابو۔۔۔ تیرا ستیاناس، طون (طاعون) مارے۔۔۔ گھس جائے تیرے پیٹ میں ماتا کالی۔۔۔ آتا کیوں نہیں۔ دوسو کپڑے پڑے ہیں۔۔۔ لمبر گیرنے والے، میں تو رو رہی ہوں تیری جان کو۔۔۔''

بابو کو یہ محسوس ہوا کہ نہ صرف سکھ نندن نے اس کے جذبات کو ٹھیس لگائی ہے اور وہ اس کے ساتھ کبھی نہیں کھیلے گا۔ بلکہ اس کی ماں جس کے پیٹ سے وہ ناحق پیدا ہوا تھا۔۔۔ جس سے اسے دنیا میں سب سے زیادہ پیار کی توقع تھی، اس سے ایسا سلوک کرتی ہے۔ کاش! میں اس دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اگر ہوتا تو یوں بابو نہ ہوتا۔ میری مٹی یوں خراب نہ ہوتی۔ آخر میں سکھی سے شکل اور عقل میں بڑھ چڑھ کر نہیں؟

سکھ نندن کے جنم دن کو ایک مہینہ ہو گیا۔ ٹلا دان میں آئی ہوئی گندم پسی۔۔۔ پس کر اس کی روٹی بنی۔ بابو کے ماں باپ نے کھائی مگر بابو نے وہ روٹی کھانے سے انکار کر دیا۔ جتنی دیر ٹلا دان کا آٹا گھر میں رہا وہ روٹی اپنے چچا کے ہاں کھاتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جس طرح مانگے تانگے کی چیزیں کھا کھا کر اس کے ماں باپ کی ذہنیت غلامانہ ہو گئی ہے وہ روٹی کھا کر اس میں بھی وہ بات آ جائے۔ گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی روٹی سے تو دودھ ٹپکتا ہے۔ مگر حرام کی کمائی سے خون۔۔۔ اور غلامی خون بن کر اس کے رگ و ریشہ میں سما جائے، یہ کبھی نہ ہو گا سادھو رام حیران تھا۔ بابو کی ماں حیران تھی۔ چچا جس پر اس کی روٹی کا بوجھ جبراً پڑ گیا تھا۔ حیران تھے۔ چچی ناک بھوں چڑھاتی تھی اور جب گھر میں اس انوکھے بائیکاٹ کا چرچا ہوتا تو سادھو رام یک دم کپڑوں پر 'لمبر گیرنے' چھوڑ دیتا اور زرد زرد دانت نکالتے ہوئے کہتا۔

''خی خی۔۔۔ بابو ہے نا۔''

سکھ نندن نے اب بابو میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھی۔ بابو، جس کا کام سے جی اچاٹ رہتا تھا۔ اب دن بھر گھاٹ پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا۔ بابو اب اس کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا۔ ہریا کے تالاب کے کنارے ایک بڑی سی کروٹن چیل پر وہ اور اس کے دو ایک ساتھی سکول کے وقت کے بعد کان پتہ، کھیلا کرتے تھے۔ اب وہ جگہ بلکل سونی پڑی رہتی تھی۔ قریب بیٹھے ہوئے ایک سادھو جن کی کٹیا میں بچے اپنے بستے رکھ دیتے تھے۔ کبھی کبھی چرس کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے پوچھ لیتے۔ ''بیٹا! اب کیوں نہیں آتے کھیلنے کو۔'' اور سکھ نندن کہتا۔ ''بابو ناراض ہو گیا ہے باوا۔۔۔'' پھر مہاتما جی ہنستے اور چرس کا ایک دم اُلٹا دینے والا کش لگاتے اور کھانستے ہوئے کہتے۔

''اوہوں۔۔۔۔ ہوں۔۔۔ واہ رے پٹھے۔۔۔۔ آخر بابو جو ہوا تو!''

اس وقت سکھ نندن غرور سے کہتا، ''اکڑتا ہے بابو تو اکڑ کرے۔۔۔ اس کی اوقات کیا ہے دھوبی کے بچے کی؟''

۔۔۔مگر بچوں کو اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے کوئی نہ کوئی چاہیے۔ کھیل میں کسی طرح کی ذات پات اور درجے کی تمیز نہیں رہتی۔ حقیقت میں چند ہی سال کی تو بات تھی جب کہ وہ یکساں ننگے پیدا ہوئے تھے اور اس وقت تک ان میں نادار، لکھ پتی، مہا براہمن، بھنوٹ، ہریجن۔۔۔ اور اس قسم کی فضول باتوں کے متعلق خیال آرائی کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

سکھ نندن اپنی تمام مصنوعی عظمت کو کینچلی کی طرح اُتار پھینک بابو کے ہاں گیا۔ بابو اُس وقت دن بھر کام کر کے تھک کر سو رہا تھا۔ ماں نے جھنجوڑ کر جگایا۔ ''اُٹھ بیٹا!۔۔۔اب کھیلنے کبھی نہ جاؤ گے کیا؟ سکھی آیا ہے۔'' بابو آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ چار پائی کے نیچے اس نے بہت سے میلے کچیلے اور اُجلے اُجلے کپڑے دیکھے۔ کپڑے جو کہ پیدائش ہی سے ایک سُکھ نندن اور بابو میں امتیار و تفرقہ پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔ بابو چار پائی پر سے فرش پر بکھرے ہوئے کپڑوں پر کود پڑا۔ دل میں ایک لطیف گدگدی سی پیدا ہوئی۔ کئی دنوں سے وہ کھیلا نہیں تھا اور اب شاید اپنی اکتسابی رعونت پر پچھتا رہا تھا۔ بابو کو جی چاہتا تھا کہ پھلانگ کر برآمدے سے باہر چلا جائے اور سکھی سے بغل گیر۔۔۔ اور کیا انسان کی انسان کے لیے محبت کپڑوں کی حد سے نہیں بڑھ جاتی؟ کیا سکھی کینچلی نہیں اُتار آیا تھا؟ کیا بابو چاہتا تھا کہ دونوں بھائی رہے سہے کپڑے اُتار کر ایک سے ہو جائیں اور خوب کھیلیں، خوب۔۔۔ برآمدے میں کبوتروں کے کابک کے پیچھے جالی کے درمیان میں سے بابو کی نظر سکھی پر پڑی جو پُر امید نظریں اس کے گھر کے دروازے پر گاڑے کھڑا تھا۔ یکا یک بابو کو سکھی کے جنم دن کی بات یاد آ گئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ کبوتروں کی جالی میں اسے بہت سی بیٹیں نظر آ رہی تھیں اور بہت سے سراج، للّہ اور دیسی قسم کے کبوتر، گھوں گھوں، کرتے ہوئے اپنی گردنوں کو پُھلا رہے تھے۔ ایک نَر پھول پھول کر مادہ کو اپنی طرف مائل کر رہا تھا۔ بابو نے بھی اپنی گردن کو پھلا لیا اور گھوں گھوں کی سی آواز پیدا کرتا ہوا چار پائی پر واپس جا لیٹا۔ پھر اسے خیال آیا۔ سکھی دھوپ میں کھڑا جل رہا ہے مگر پھر وہ ایک فیصلہ کُن لائحہ عمل مرتب کرتے ہوئے چار پائی پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ آخر وہ بھی تو کتنا ہی عرصہ اس کے صحن میں برسات کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑا رہا تھا اور اس نے اس کی کوئی پروانہ کی تھی۔۔۔ امیر ہو گا تو اپنے گھر میں۔

''اسے کہہ دو۔۔۔ وہ نہیں آئے گا، ماں۔۔۔ کہو اسے فرصت نہیں فرصت۔'' بابو نے کہا۔

''سرم تو نہیں آتی تجھے۔'' ماں نے کہا۔ ''اتنے بڑے سیٹھوں کا لڑکا آوے، تجھے بُلانے کے لیے اور تو یوں پڑا رہے۔۔۔ گدھا!''

بابو نے کہنیاں ہلاتے ہوئے کہا، ''میں نہیں جانے کا ماں!''

ماں نے بُرا بھلا کہا تو بو بو بولا، ''سچ سچ کہہ دوں ماں۔ میں جانتا ہوں میری کسی کو بھی جرورت نہیں۔۔۔

واویلا کروگی تو میں کہیں چلا جاؤں گا۔''

ماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔اس وقت ننھی بلند آواز سے رونے لگی اور ماں اسے دودھ پلانے میں مشغول ہوگئی۔

بدھئی کے پُروا میں ستیلا (چیچک) کا زور تھا۔ پُروا کی عورتیں کی طرح اپنے اپنے بچوں کو کلیجوں سے لگائے پھرتی ہیں۔کہیں بونہ پکڑ لیں۔اور ستیلا ماتا تو یوں بھی بڑی غصیلی ہیں۔۔۔ڈال چند کی لڑکی،مہابراہمن کے دو بھتیجے سب کو ستیلا ماتا نے درشن دیا۔ان کی مائیں گھٹنوں ان کے سرہانے بیٹھ کر سچے موتیا کے ہار رکھ کر گوری میا گاتی رہیں اور دیوی ماتا سے پرارتھنا کرتی رہیں کہ ان پر اپنا غصہ نہ نکالے۔جب بچے راضی ہوجاتے تو مندر میں ماتھا ٹیکنے کے لیے لے جاتیں۔ماتا تو ہر ایک قسم کی خواہش پوری کرتی تھی۔جب ستیلا کا غصہ ٹلا اور بوکچھ کم ہوئی تو پُروا والوں نے ستیلا کی مورتی بنائی۔اسے خوب سجایا۔سُکھ نندن کے باپ نے مونگے کی مالا ستیلا ماتا کے گلے میں ڈالی۔سب نے بل کر عزت وتکریم سے ماتا کو مندر سے نکالا اور ایک سجی ہوئی بہلی میں براجمان کیا اور بہلی کو گھسیٹتے ہوئے گاؤں سے باہر چھوڑنے کے لیے لے گئے۔ پُروا کے سب بچے بوڑھے جلوس میں اکھٹے ہوئے،پیتل کی کھڑتالیں ، ڈھول ڈھمکے بجتے جارہے تھے۔لوگ چاہتے تھے کہ کرودھی ماتا کہ ہریا کے تالاب کے پاس مہاتما جی کی کٹیا کے قریب ان ہی کی نگہبانی میں چھوڑ دیا جائے تا کہ ماتا اس گاؤں سے کسی دوسرے گاؤں کا رخ کرے۔وہ ماتا کو خوشی خوشی روانہ کرنا چاہتے تھے۔تا کہ ان پر اُلٹی نہ برس پڑے۔سکھی بھی جلوس کے ساتھ گیا۔بابو بھی شامل ہوا۔نہ بابو کو سکھی کے بُلانے کی جرأت پیدا ہوئی نہ سکھی کو بابو کے بُلانے کی۔ہاں کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔

ہریا کے تالاب کے پاس ہی دھوپی گھاٹ تھا۔ایک چھوٹی سی نہر کے ذریعے تالاب کا پانی گھاٹ کی طرف کھینچ لیا جاتا تھا۔گھاٹ تھا بہت لمبا چوڑا۔قریب کے قصبوں میں سے دھوبی کپڑے دھونے آیا کرتے تھے۔اسی گھاٹ پر بابو اور اس کے بھائی بند، باپ دادا، وہی ایک گانا، اسی پُرانی سُر تال سے گاتے ہوئے کپڑے دھوئے جاتے۔ایک دن گھاٹ پر سارا دن بابو سکھی کے بغیر شدّت کی تنہائی محسوس کرتا رہا۔کبھی کبھی اکیلا ہی کروٹن چیل کے بل کھاتے ہوئے تنوں پر چڑھ جاتا اور اُتر آتا۔گویا سکھی کے ساتھ کان پتہ کھیل رہا ہو۔کھیل میں لطف نہ آیا تو وہ اینٹوں کے ڈھیر میں رکھی ہوئی ستیلا ماتا کی مورتی کو دیکھنے لگا اور پوچھنے لگا۔آیا وہ اس گاؤں سے چلی گئی ہیں یا نہیں۔ماتا کچھ کروپ (بدشکل، ناراض) دکھائی دیتی تھیں۔شام کو بابو گھر آیا تو اسے ہلکا ہلکا تپ تھا جو کہ بڑھتا گیا۔بابو کو اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ایک دفعہ بابو کو ہوش آیا تو دیکھا ماں نے موتیا کا ایک ہار اس کی چارپائی پر رکھا تھا۔قریب ہی ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا کورا گھڑا تھا۔گھرے کے منہ پر بھی موتیا کے ہار پڑے تھے اور ماں ایک نیا خریدا ہوا پنکھا ہلکے ہلکے ہلا ہلا کر منہ میں گوری میا گنگنا رہی تھی۔پنکھا مرتے ہوئے آدمی کی نبض آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور الگنی پر سُرخ

پھلکاریوں کے پردے بابو کی بوڑھی دادی کی جھرّیوں کی طرح لٹک رہے تھے اور یہ سامان سب کچھ ماتا کی عزت کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ بابو نے اپنی پلکوں پر منوں بوجھ محسوس کیا۔ اس کے تمام بدن پر کانٹے چبھ رہے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی بھٹّی میں جھونک دیا گیا ہو۔

دو تین دن تو بابو نے پہلو تک نہ بدلا۔ ایک دن ذرا فاقہ سا ہوا۔ صرف اتنا کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا، سکھی اور اس کی ماں دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ سیٹھانی نے ناک پر دوپٹہ لے رکھا تھا۔ دراصل وہ دروازے میں اس لیے بیٹھے تھے کہ کہیں بو نہ پکڑ لیں۔ مگر بابو نے سمجھا آج ان لوگوں کا غرور ٹوٹا ہے۔ اس نے دل میں ایک خوشی کی لہر محسوس کی۔ ایک جیوتشی جی سادھورام کو بہت سی باتیں بتا رہے تھے، انھوں نے ناریل، بتاسے، کھمنی منگوائی۔ سادھورام کبھی کبھار اپنا ہاتھ بابو کے تپتے ہوئے ماتھے پر رکھ دیتا اور کہتا۔

''بابو۔۔۔۔ او بابو۔۔۔۔ بیٹا بابو؟''

جواب نہ ملتا تو ایک مکّا سا اس کے کلیجے میں لگتا اور وہ گم ہو جاتا۔

بابو نے بمشکل تمام کانٹوں کے بستر پر پہلو بدلا۔ پھول ہاتھ سے سرکا کر سرہانے کی طرف رکھ دیے گلے میں تلخی سی محسوس کی۔ ہاتھ بڑھایا تو ماں نے پانی دیا۔ بابو نے دیکھا اس کے ایک طرف گندم کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جیوتشی جی کے کہنے پر بابو کی ماں نے اسے آہستہ سے اٹھایا اور ایک طرف لٹکتے ہوئے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا۔ ترازو کے دوسرے پلڑے میں گندم اور دوسری اجناس ڈالنی شروع کیں۔ بابو نے اپنے آپ کو تلتا ہوا دیکھا تو دل میں ایک خاص قسم کا روحانی سکون محسوس کیا۔ چار دن کے بعد آج اس نے پہلی مرتبہ کچھ کہنے کے لیے زبان کھولی اور اتنا کہا۔۔۔

''اماں۔۔۔ کچھ گندم اور ماش کی دال دے دو سکھی کی ماں کو۔۔۔ کب سے بیٹھی ہے بچاری؟''

سادھورام نے پھر اپنا ہاتھ بابو کے تپتے ہوئے ماتھے پر رکھ دیا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی چند بوندیں گر کر فرش پر بکھرے ہوئے کپڑوں میں جذب ہو گئیں۔ سادھورام نے کپڑوں کو ایک طرف ہٹایا اور بولا۔

''پنڈت جی۔۔۔ دان سے بوجھ ٹل جائے گا؟۔۔۔ میں تو گھر بار بیچ دوں۔۔۔ پنڈت جی۔۔۔''

بابو کی ماں نے سسکیاں لیتے ہوئے سیٹھانی جی کو کہا۔

''مالکن۔۔۔ کل نینی تال جاؤ گی؟۔۔۔ کل۔۔۔ نہیں تو پرسوں ملیں گے کپڑے۔۔۔ ہائے، مالکن! تمھیں کپڑوں کی پڑی ہے۔''

بابو کو کچھ شک سا گزرا۔ اس نے پھر تکلیف سہہ کر پہلو بدلا اور بولا ''اماں۔۔۔ اماں۔۔۔ آج میرا نام جنم دن ہے؟''

اب سادھورام کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ایک ہاتھ سے گلے کو دباتے ہوئے وہ بھرّ ائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہاں بابو بیٹا۔۔۔۔آج جنم دن ہے تیرا۔۔۔بابو۔۔۔بیٹا!''

بابو نے اپنے جلتے ہوئے جسم اور روح پر سے تمام کپڑے اُتار دیے۔ گویا ننگا ہو کر سکھی ہو گیا اور منوں بوجھ محسوس کرتے ہوئے آنکھیں آہستہ آہستہ بند کر لیں!

☆☆☆

ردِّ عمل

جلال کو بالآخر فرصت مل ہی گئی کہ وہ اپنی عیش ونشاط کی محفل کو چھوڑ اور دخترِ رز سے رخصت لے کر اپنے مرتے ہوئے چچا کو اس کی درخواست پر ایک دفعہ دیکھ لے۔

ابھی ابھی تھوڑا سا مینہہ برسا۔ حبیب منزل کے سامنے پانی نشیب میں کھڑا ہو گیا۔ صرف گزرنے کے لئے ایک چھوٹی سی مخدوش پگڈنڈی رہ گئی۔ جلال نے اپنی پتلون کے پائنچوں کو احتیاط سے سنبھالتے، ایڑیاں اٹھا اٹھا کر قدم رکھتے اور خاموش کی زبان میں اس اہم طلب کی وقعت کو غیر ضروری گردانتے ہوئے اپنے چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

سکینہ، جلال کی چچازاد بہن نے دروازہ کھولا اور پھیلتی ہوئی آنکھوں سے جلال کی طرف دیکھا۔ اور آنسو کا وہ قطر جو کہ پہلے آنکھ میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ٹپک پڑا۔ کچھ حیرانی سے اس نے کہا۔

''جلال! تم آ گئے......ابا جان کی امیدوں کے خلاف......وہ تمھیں ابھی ابھی یاد کر رہے تھے۔''

جلال نے بہن کی بات کو بے توجہی سے سُنا۔ برآمدے کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے نیم بوسیدہ ٹاٹ سے اپنے بوٹوں کو نہایت اطمینان سے رگڑ رگڑ کر کیچڑ سے پاک کیا۔ ایک عام دنیا دار کی مانند جلال نے ظاہری اضطراب کا کوئی نشان چہرے پر ہویدا نہ ہونے دیا۔ نہ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں گھبراہٹ سے پھیلیں۔ نہ اس کی رفتار میں خلافِ معمول سرعت آئی۔ چسٹر کو اُتار کر کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ برآمدے کے دائیں کونے کے دریچے میں جو گلی میں کُھلتا تھا۔ کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور اسے گلی میں پھینک دیا۔ سکینہ جو اپنی والدہ کو جلال کی آمد کی اطلاع دے کر آئی تھی، بولی۔

''جلال......تم ابھی یہیں ہو بھائی؟''

''چچا کس کمرے میں ہیں، یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں سکینہ؟''

''اس کمرے میں......جس کے سامنے تم کھڑے ہو، جلال! جلدی پہنچو۔ تمھارے پہنچنے سے شاید ان کی مضمحل طبیعت کچھ بہل جائے۔''

جلال نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر ڈاکٹر پر پڑی۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک پُرانی سی سیٹتھوسکوپ تھی، دوسرے ہاتھ کی اُنگلی کو لبوں تک لے جاتے ہوئے اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

جلال ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے داہنی طرف ہولیا۔ وہاں سے اسے چچا حبیب احمد ادیب کا زرد چہرہ صاف طور پر نظر آ رہا تھا۔ اس پر تھکاوٹ کے آثار اچھی طرح سے نمایاں تھے۔ اس کا ہر ایک خط جو کسی نتیجہ خیز تجربۂ زندگی کی نشانی تھا۔ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے ان کی آنکھیں مکمل طور پر بند نہ تھیں۔ اور بے روشن، نیم وا آنکھوں کے دھندلے پن کو دیکھ کر دیل کو ایک وحشت سی محسوس ہوتی تھی۔

''یہ ہے زردرو، جھریوں والا، کل اُنچاس برس کا محنتی بوڑھا، جس کی بابت ملک الشعراء نے کہا تھا کہ وہ مکمل آدمی ہے۔'' جلال نے دل میں کہا۔ ''کتنا بڑا خطاب دیا اس نے مکمل آدمی ہونا کتنا بڑا امتیاز ہے۔ آج کون آدمی صحیح طور پر مکمل کہا جا سکتا ہے۔''

معاً ادیب نے آنکھیں کھولیں اور اپنا مُنہ دائیں طرف موڑا۔ سامنے جلال کھڑا تھا اس نے سلام کیا۔ لیکن ادیب نے صبر و سکون اور بے چینی کے مابین کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے ماتھے پر تیور چڑھا کر آنکھیں بند کر لیں......ان کے لب آہستہ آہستہ پھڑک رہے تھے۔ گویا ایک صدیوں سے آشنا، پُر حلاوت، جذبات سے لبریز ایک قسم کے ہسٹریکل (HYSTERICAL) بوسے کے لئے مرتعش ہوں۔۔۔ اور جیسے ان کی روح عریاں ہو کر قلب کی اندرون ترین ماہیتوں میں ایک ایسے ہلکے ہلکے، میٹھے، مدہوش کُن صورتِ ازل اور ایک ایسی خنک سی تجلّی کی متلاشی ہو جو اس مقامِ ہو کی عمیق، بے کراں تاریکیوں میں اس کے لئے شمع بردار ہو جائے اور اس کی رہنمائی کی وجہ سے وصلِ تمام ممکن......

جلال نے اپنے بائیں طرف ادیب کی تصنیف کردہ کتابوں پر ایک چھچھلتی ہوئی نظر ڈالی۔ الماری کے پاس ہی اخروٹ کی لکڑی کا ایک ہشت پہلو میز دھرا تھا۔ اس میں کہیں کہیں سپید گلکاری کی ہوئی تھی۔ میز کے اوپر قلم دوات، چائے کی ایک پیالی اور ایک دُہرا کیا ہوا کاغذ پڑا تھا۔ جلال نے کاغذ کو ہاتھ میں لے لیا۔ لکھا تھا۔

بوڑھے کے آنسو چار سُو بکھرے پڑے تھے۔

اس نے ساری عمر کوئی ڈھنگ کا کام نہ کیا تھا۔

بوڑھے نے سر اُٹھایا اور کہا......

زندگی کے اسباب بکھرے پڑے ہیں،

سخی معشوق کی مسکراہٹوں کی مانند،

کسی غریب کے دل کی جمعیت کی مانند،

صرف ایک سبق رہ گیا ہے......پشیمانی کا،

......آموت! وہ بھی سکھا دے، ''حبیب''

جلال کی طبیعت پریشان سی ہوگئی۔ وہ بے پرواضرور تھا۔مگرایک لطیف ذہن اورایک حسّاس دل کا مالک تھا۔ اس کے مزاج کی مستقیل دیوار متزلزل ہوگئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کئی زرد، سُرخ، مبہم سے حلقے ایک دوسرے میں خلط ملط ہوکر اس کی آنکھوں کے پاس کنپٹی سے چھوکر، انواع واقسام کی اقلیدسی اشکال پیدا کرتے ہوئے فضامیں دورونزدیک پھیل رہے ہیں۔اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ ایک خلجان سا پیدا ہوا۔ایک غنودگی یا نیم غشی کی سی حالت میں اس کے قلب میں یک لخت ایک تحریک، ایک زبردست سی، رو پیدا ہوئی اوراس نے چاہا کہ وہ اپنے سامنے میز پر پڑی ہوئی پیالی کواوندھا کردے۔ یہ بےمطلب لاحاصل خواہش کیوں پیدا ہوئی۔جلال نہ جان سکا۔وہ صرف اس بات سے واقف تھا کہ ایک اندرونی طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کررہی تھی۔ایک لمحے کے لئے اس نے دل کے ساتھ تصفیہ کرلیا وہ ہرگز ہرگز پیالی کواوندھا کرنے کے فضول خیال کوعملی جامہ نہیں پہنائے گا۔ بلکہ اس قسم کے خیال پیدا ہونے پر اس نے اپنی کمزور طبیعت کوکوسا۔لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ جب تک وہ پیالی کواوندھا نہ کرلے گا۔اس کے لئے زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا۔مشکل، ناممکن......اور سب کے دیکھتے ہوئے اس نے پیالی کواوندھا کردیا۔تھوڑی سی چائے میز پر سے بہتی ہوئی فرش پر گرگئی۔سب حیرت سے جلال کی طرف دیکھنے لگے......اس کے فوراً بعد ہی اسی قسم کا خیال پیدا ہوا کہ وہ رو دے۔اس وقت جلال نے اپنی ذہنی تحریک کے خلاف جانا بالکل بے سود سمجھا۔وہ جانتا تھا کہ اب نہ رونا اس کے بس کا روگ نہیں۔اس وقت اس نے اپنے آپ کومکمل طور پر اندرونی حکم کے تابع کردیا اور پھوٹ پھوٹ کررونے لگا۔

محفلِ عیش وانبساط سے نکل کر اس فوری درد وکرب کی فضا میں جہاں قہقہوں کی بجائے آنسو، جوانی کی بجائے بُڑھاپا، ناکردہ گناہوں کی پشیمانی، موت گھوم رہے ہوں، اس کا جی نہ لگا۔جلال نے ایک عجیب انداز سے شانے پھڑکائے۔ نئے جلائے ہوئے سگریٹ کی راکھ کوچٹکی سے گرایا اور دل میں کہا کہ کہیں سگریٹ کو باہر پھینک دینے کا خیال اس کے ذہن میں نہ پیدا ہوجائے۔ وہ کانپ اٹھا۔ برقی رو آنے سے پیشتر جلال ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی میں پہنچا اور سگریٹ کو باہر پھینک دیا۔دور...... بہت دور، جتنی دور اس سے ممکن تھا۔اور روکھی سی مسکراہٹ لبوں تک لاتے ہوئے سوچنے لگا۔بھلا ایک مکمل آدمی، محض ایک معمولی سی پشیمانی کی خاطر موت کودعوت دیتا ہے۔ ناگاہ اسے یاد آیا کہ اسی نوعیت کا ایک اور خیال بھی چچانے اپنی کتاب 'رنگ وآہنگ' میں ظاہر کیا تھا کہ انسان اس قدر خودسر اور خودبیں ہے کہ اس پر آسمان کی گردش سے جتنی بھی بلائیں نازل ہوسکتی ہیں۔یکسر نازل ہوجائیں تو بھی انسان خودکردہ فعل کوغلطی یا گناہ کہنے اور صحیح طور پر پشیمان ہونے کی بجائے لچر باتوں سے دل کی تسلی کے سامان بہم پہنچائے گا۔ وہ ہروقت بچپن کے گناہوں کوطفلانہ پن، جوانی کے گناہوں کوجوانی کی نادانی، اور بُڑھاپے کے گناہوں کوانسانی

ناتوانی اور کمزوری کے سر تھوپے گا۔ حتیٰ کہ حد سے زیادہ دیر ہوجائے گی اور موت اپنے تلخ جام کے ساتھ اس کے ہر رگ و ریشے میں پشیمانی کا سبق سرایت کر دے گی۔ ایک عمیق اور تنقیدی نظر اپنی مختصر سی زندگی پر ڈالتے ہوئے جلال نے کہا۔ کس قدر درست بات ہے...... برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن...... قیامت کب کسی نے دیکھی ہے...... یہی دن تو ہیں......اور اس کے اس قسم کے سینکڑوں کلمات اب تک ایتھر میں لہروں کی صورت گھوم رہے ہوں گے۔

''میں جلال سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' دفعتہً جلال کے چچا نے بہت نحیف آواز سے کہا۔ اور نہایت آرام و سکون سے اپنی آنکھیں اس طرف پھیر لیں۔ جلال تیزی سے چچا کی چار پائی کے نزدیک دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''سکینہ......سامنا دروازہ تو کھول دو...... مجھ تک ہوا آنے دو۔'' ادیب نے پھر کہا۔

ایک لمحے کے لئے چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ سکینہ نے دروازہ کھولا۔ ٹھنڈی ہوا ایک دم فراٹے سے اندر داخل ہوئی۔ سب نے ادیب کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''باہر بارش اچھی ہو گئی ہے نا؟''

''جی چچا جان!......کافی برس گیا، پانی۔''

اور اپنی دُھندلی آنکھوں سے باہر دیکھتے ہوئے ادیب بولا۔

''دنیا کس قدر وسیع ہے......رنگین اور بے رنگ بھی......''

''جی ہاں...... بہت وسیع ہے۔ رنگین اور بے رنگ بھی۔'' جلال نے چچا کے تخیل کی رو کو سرعت سے بدلتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے دہرایا۔ ادیب کے اس طور باہر دیکھنے پر سب لوگ باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر کچھ بھی نہ تھا۔ صرف سخت سردی میں ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا جا رہا تھا۔ جلال نے چچا کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ چچا کچھ کہنے کو تھے مگر قوتِ ارادی کی ناتوانی کی وجہ سے کہہ نہ سکے۔ جلال نے دیکھا دوبارہ حد سے زیادہ زور لگاتے ہوئے چچا نے کہا۔

''دیکھو جلال بیٹا باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے راستے پر نشیب و فراز دونوں ہیں۔ جنھیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تاہم اسے چنداں فکر لازم نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے۔''

ایسے معلوم ہوا جیسے یہ بات کہنے میں ادیب نے اپنی تمام قوت صرف کر دی ہو۔ ان کو دو ہچکیاں سی آئیں اور اس سے پہلے کہ فضا میں ہاؤ ہو کی آوازیں لرزش پیدا کر دیں ان کا جسم ساکت ہو گیا اور برف کی مانند ٹھنڈا۔

چچا حبیب احمد کو کفنانے دفنانے کے بعد واپس لوٹتے ہوئے جلال ایک ارتعاشِ سوزاں محسوس کرتا ہوا بازار کی رونق میں سے گزر رہا تھا۔ سینتیس برس کی عمر میں خود کو چچا کے مقابلے پر لاتے ہوئے وہ اپنے آپ کو زیادہ معمر محسوس کرنے لگا۔ اور شاید زیادہ تجربے کار لیکن اس کے خیال میں تلافیِ مافات کے لئے بہت دیر ہو چکی تھی...... بہت دیر...... اور وہ مفردات جو کہ انسان کی بہتری کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اپنی تخریب سے بدن میں کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ یکایک اس کے رونگٹے کھڑے ہونے شروع ہو گئے اور اسے کانوں میں سائیں سائیں اور نفس کی نوع بہ نوع ناموافق سی آوازوں کے درمیان چچا کے آخری الفاظ گونجتے سنائی دیتے...... ''باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے راستے پر نشیب وفراز دونوں ہیں۔ جنھیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تاہم اسے چنداں فکر نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے۔''

کیا یہ الفاظ کسی تشبیہہٴ مجازی کے حامل تھے۔ یا یوں ہی ایک گزرتے ہوئے نابینا کو دیکھ کر ایک علیل دماغ کی داہی تباہی......؟'' جلال نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر جلال نے سوچا' چچا اُستادِ استعارہ مانے جاتے تھے اور یہ کبھی ممکن نہیں کہ اپنے حواس کی موجودگی میں وہ الفاظ انھوں نے بے معنی طور پر اور اتفاقاً کہے ہوں گے...... پھر اس نے اپنی تمام تر علمیت کو جو کہ اب گزرے ہوئے زمانے کی ایک حسین یادگار رہ گئی تھی طلب کیا۔ اور دل ہی دل میں ان الفاظ کی تفسیر وتشریح کرنی شروع کی۔

خوانچے والوں کی آوازیں، اخبار بیچنے والوں کا شور وغوغا، سینما والوں کے بانگ دہل اعلان، ریڈیو مکینک کی دُکان کے اندر ایمپلی فائر کی مدد سے بلند ہوتا ہوا گانا، خوب صورت نیو ماڈل کاروں کے ہارن، اس کے کانوں میں جگہ پانے سے قاصر رہے۔ اس کے پاس ہی سے ایک مونگے رنگ کی ڈاج سیڈان گزری۔ جس کو ایک مونگے رنگ کی وردی کا شوفر چلا رہا تھا۔ کار کے اندر ایک نازنین اسی رنگ کی ایک کریپ کی نہایت خوش نما ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ گزرتے ہوئے لوگ رنگ کی اس مشابہت ومطابقت کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔ جلال جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کار کی آخری سیٹوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اس نے صرف ایک نظر سے اس کار میں دیکھا۔ اس کے فوراً بعد ہی اس کی نظر چند بھک منگوں کی طرف چلی گئی اور اس نے محسوس کیا جیسے کوئی کہہ رہا ہو'' دنیا کس قدر وسیع ہے، رنگ اور بے رنگ بھی......'' اور جلال زمین پر نظریں گاڑے ہوئے وہاں سے گزر گیا۔

ریسٹوراں کے خان ساماں نے اپنے گاہک جلال کو اپنے کیفے کے نزدیک رُکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔'' ''حضور! پیرس سے پنیر کے دو ورقے سموسے آئے ہیں۔ شامپین سے ان کا خاص......''

جلال نے ایک سخت نگاہ سے خانساماں کی طرف دیکھا اور کہا۔'' پیچھے ہٹ جاؤ...... نامعقول۔'' اور خود آگے

بڑھ گیا۔

''چچا آخر کتنا سادہ آدمی تھا۔'' جلال نے سوچا، اور نفس کش، صحیح معنوں میں کفایت شعار، خرچ کرنے کی جگہ خرچ کرنے والا۔ خاموش، سنجیدہ مزاج مگر بولنے کی جگہ جوشیلا مقرر...... حقیقت و اصلاح کے لئے قدرت کی مثبت و منفی دونوں طاقتوں کا استعمال کرنے والا...... آخر وہ مکمل آدمی تھا۔

ایک دفعہ پھر اس کے کانوں میں ادیب کے آخری الفاظ گزرے۔ جس طرح روئے زمین پر پھیل چکنے کے بعد ایتھر میں پھر ایک معین وقفے کے بعد لہر آتی ہے...... ''باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے راستے پر نشیب و فراز دونوں ہیں۔ جنھیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ مگر اسے چنداں فکر نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے۔''

تمام پریشانیوں سے اپنی توجہ کو یکسو راغب کرتے ہوئے اب جلال نے مرحوم چچا کے آخری الفاظ کی تفسیر کرنی شروع کی۔ یکا یک اس کے گالوں پر ایک ہلکی ہلکی سرخی جو شفق پر سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے یا حجلۂ عروسی میں پہلی مرتبہ تقابل جسن کے بازوؤں میں مستغفی ہونے سے دلہن کے چہرے پر ہویدا ہوتی ہے۔ نمودار ہونے لگی اور ایک تلخ سی مسکراہٹ جو دوشیزگی کے وقار کو کھونے کے باوجود پیدا ہوتی ہے۔ مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

''آخر کتنا عمیق تھا چچا کا مطالعہ۔ انسان کی زندگی کے غیر ضروری، ناقابلِ توجہ واقعات سے وہ روانہ سبق لیتے تھے۔ زندگی کی ہر لطیف جنبش سے انھوں نے کچھ نہ کچھ اخذ کیا۔ حتیٰ کہ موت سے پشیمانی، اس کی تفسیر اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ انسان اپنے مستقبل یعنی زندگی کے نشیب و فراز اور اونچے اونچے راستے پر ایک بےخبری کے عالم میں جا رہا ہے۔ کیوں کہ وہ ہونے والے واقعات سے آگاہ نہیں۔ وہ اونچی نیچی جگہ کو دیکھ نہیں سکتا۔ جس طرح اندھا آدمی اپنی لاٹھی کی مدد سے اپنا راستہ نشیب و فراز، پانی اور کیچڑ وغیرہ میں سے نکال لیتا ہے، اس طرح آدمی اپنی دوراندیشی کی لاٹھی سے اپنی زندگی کو بےخطر اور استوار بنا سکتا ہے۔ جس اندھے کے پاس لاٹھی اور جس انسان کے پاس دوراندیشی نہیں وہ دنیا کے نشیب و فراز، پانی اور کیچڑ میں منہ کے بل گرے گا۔

جلال نے کلائی پر سے چسٹر کی آستین ہٹاتے ہوئے وقت دیکھا۔ ساڑھے سات بجے تھے اور سردیوں میں ساڑھے سات بجے اچھا خاصا اندھیرا ہوجاتا ہے۔ دُھند نے سورج کے غروب ہوتے ہی تمام شہر کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا...... اور یہ بلیرڈ کلب میں جانے کا وقت تھا۔

بلیرڈ کلب، سموکنگ کلب، پریل کلب یہ سب ایک ہی بات تھی۔ یہ سب مہذب، مرد عورتوں کی تفریح گاہیں تھیں۔ جلال نے اپنی حبیب ٹٹولی پرسوں کی سویپ اور فلاش میں اس نے تہتّر روپے جیتے تھے۔ جلال کو وہ کھجلی سی محسوس ہونے لگی جو ہر جیتے ہوئے کھلاڑی کو اور داؤ لگا کر سب کچھ گنوا دینے کے لئے اُکساتی ہے۔ جلال ایک دم

رُک گیا۔ چسٹر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے فیصلہ کن اقرار دعویٰ سے کہا کہ وہ یقیناً ان روپوں کو کسی بہتر کام میں صرف کرے گا۔ وہ اپنی بھولی بسری بیوی کے لئے گرم ساڑھی لائے گا یا اپنے بڑے بیٹے کے لئے جو ایک مقامی کالج میں ایف، اے کا متعلم تھا۔ ایک چھوٹی سی لائبریری خرید دے گا۔ وہ نظارہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ جب کہ اس کے بیٹے نے نہایت اشتیاق سے کتابیں خرید کر لا دینے کی التجا میں انگلستان کے بڑے بڑے پبلشر انگلیوں پر گن ڈالے تھے۔

آج پھر جلال نے اپنی گزشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ تمام گزشتہ وقت جوانی کا بیش قیمت زمانہ اس نے عیش و نشاط کی محفلوں مہذب بدمعاشوں کی صحبتوں، طوطا چشم ایکٹرسوں کو طول وطویل چھٹیاں لکھ کر ان کی تصاویر منگوانے میں گنوایا تھا اور خود کو اس اندھے کی مانند بنا دیا جس کے پاس لاٹھی نہ ہو اور جسے ہر طرح کا فکر لازم ہو اور اب بھی زندگی کے نشیب و فراز میں دور اندیشی کی لاٹھی کے بغیر بھاگا جا رہا تھا اور وہ بھی بے تحاشا!

اس نے بازار میں گزرتے ہوئے تمام آدمیوں کو دیکھ کر انسانی فطرت کے مطابق اپنے دل کو تسلی دینی شروع کی۔

ان میں سے کسی کے پاس لاٹھی نہیں ہے۔ اگر ان میں کوئی سنبھلا ہوا ہے بھی تو وہ شخص ہے جو کہ لاٹھی کے نہ ہوتے ہوئے بے تحاشہ نہیں بھاگتا۔ بلکہ استقلال سے قدم بہ قدم چل رہا ہے۔

''مجھے کم از کم بے تحاشا نہیں بھاگنا چاہئے۔'' جلال نے دل ہی دل میں خود کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھا کہ وہ خوب صورت استعارے کے زیرِ اثر خود بھی سُست پڑ گیا ہے۔ اس کی رفتار ایک عام کاروباری آدمی کی رفتار سے بہت کم ہوگئی تھی۔ جلال نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اور تیز چلتے ہوئے اس نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔

''اپنی وہ لاٹھی جو میں نے گھر کے ایک کونے میں پھینک رکھی ہے اور جس کی ہستی کو بھی بھول چکا ہوں۔ محنت اور کاوش سے ڈھونڈ نکالوں گا اور اسے استعمال کیا کروں گا۔''

شہر کے قمار خانے کی شکل پیگوڈا سے مشابہت رکھتی تھی۔ بنکاک کے ایک اعلیٰ کاریگر نے اسے بنایا تھا۔ اس کے چاروں طرف پینتالیس سیڑھیاں تھیں اور صبح و شام شہر کے لوگ سمندر سے آنے والی ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہاں جمع ہو جاتے۔ شراب کے متعلق ملک کے اس حصے کا قانون سخت گیر نہ ہونے کی وجہ سے کئی شخص پینے کے بعد ایک سیڑھی پر بازو رکھ کر اسے تکیے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے باقی کا جسم نچلی سیڑھی پر رکھے پڑے رہتے تھے۔ جس طرح کسی بڑے دریا کے رتیلے کناروں پر گھڑیال دھوپ تاپنے کے لئے پاؤں پھیلا کر دنیا و

مافیہا سے بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ جلال حسبِ معمول ان انسان نما گھڑیالوں یا گھڑیال نما انسانوں سے بچتا بچاتا قمار خانے کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھی جو دو دن سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ نہایت خلوص سے اسے ملے۔ مگر جلال دردِ سر کا بہانہ کر کے ان سے معذرت کا خواہاں ہوا اور ایک آرام کرسی میں دھنس گیا۔

جلال صبح سے بھوکا تھا اور حالتِ گرسنگی میں آدمی لطیف خیالات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جلال جس کا پیٹ طرح طرح کے کھانوں کے علاوہ حرص و ہوا سے تنا رہتا تھا۔ آج اس قابل تھا کہ اسے دور کی سوجھ سکے۔ اور وہ گزشتہ زندگی اور روز مرّہ کے واقعات کا تصور کر کے پریشان و پشیمان ہو۔ بظاہر اس کی آنکھیں قمار بازوں کے سر پر لٹکی ہوئی قندیل پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر دراصل وہ نیم خفت نیم دار حالت میں تھا۔ اسے مس میگی کا گھر دکھائی دیا۔ مس میگی شروع شروع میں ایک یوریشین سوسائٹی گرل تھی اور ایک بڑے بلند مرتبت خاندان کی چشم و چراغ۔ اسے پنٹنگ (PUNTING) کی لت پڑ گئی۔ بُک میکرز نے اسے خوب لوٹا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو بیچنے لگی۔ اور اب اس کے ہاں امیر آدمیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

تصور میں جلال نے اپنے آپ کو میگی کے دروازے پر کھڑا پایا۔ اسے دیکھتے ہی وہ دوڑی دوڑی اسے لینے کے لئے دروازے تک آئی۔ کیوں کہ جلال، مس میگی کا مستقل، مال دار اور قدر دان گاہک تھا۔ میگی نے اسی انداز سے جو شکایت سے تہی نہ تھی، پوچھا۔

''تم گزشتہ دو شب کہاں رہے جلال؟ تمھاری طبیعت مضمحل نظر آتی ہے کچھ۔'' ایک اور سرو قد بُت تھا جو کہ میگی کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بُت قدرے دُھندلا سا دکھائی دیتا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس بُت کے منہ میں زبان نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یکا یک اس بُت نے بھی وہی الفاظ دہرا دئے۔ وہ بُت جلال کی بھولی بسری بیوی تھی۔ جلال نے اپنی بیوی اور مس میگی کے استفسار کا مقابلہ کیا۔ بیوی اسے اسی کے لئے چاہتی تھی۔ اور کبھی کبھی شکایت کے آنسو گراتے ہوئے پوچھتی...... ''میں کہتی ہوں...... آپ دورات کہاں رہے۔ میں یہاں اکیلی ''تڑپتی رہی ہوں۔'' اور وہ آواز مطلق تصنّع اور ناز و انداز کی حامل نہ تھی۔ بلکہ دل ہی سے دماغ سے مشورہ لئے بغیر اس کے خیالات لبوں تک آ جاتے۔ لیکن میگی، جلال کو جلال کے لئے نہیں، اس کی جیب کے لئے چاہتی تھی جو عموماً نہیں بلکہ ہمیشہ معمور ہوتی تھی۔

''فیراڈے...... اس دفعہ پھر ہار گیا جلال...... فیراڈے ہار گیا۔'' میگی نے جلال کو تاسّف سے بھری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسے ہارنا ہی چاہئے......'' جلال نے جواب دیا اور پھر بولا۔ ''میرے عزیز چچا حبیب احمد کل فوت

ہو گئے ہیں......'' اس وقت اس کی رحم طلب نگاہیں وہاں بیٹھے ہوئے دو ایک آدمیوں کی طرف اُٹھ گئیں۔ تمام نے افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک نے یہ بھی محسوس کیا کہ جلال نے عیش و نشاط کے موقع پر یہاں آ کر اپنی افسردگی دلی سے تمام انجمن کو افسردہ کر کے اپنی کم فہمی کا ثبوت دیا ہے۔

میگی نے کئی ایک باتوں سے جلال کو تسلی دینی شروع کی۔ اور یہ بھی کہا کہ اس کے نہ آنے سے کتنی بجلیاں تھیں جو اس پر کوندیں۔ اور کتنے وسوسے تھے جو اس کے دل میں آئے۔

جوں جوں وہ یوریشین لڑکی خوشامد کرتی توں توں جلال کا دل اس سے متنفر ہوتا......اس نے ایک ہاتھ اپنی جیب پر رکھ لیا۔ جس کو بچانے کا صرف آج کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ میگی کے پیش کردہ ہاتھ کو پرے ڈھکیلتے ہوئے ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ سے جلال نے کہا۔ ''تمھیں ایک خبر سناؤں میگی ...... چچا اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ میرے نام چھوڑ گئے ہیں۔''

''سچ؟'' میگی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ یہ بات صحیح معنوں میں اس کے لئے دل خوش کن اور دل ناز تھی۔ وہ اپنی خوشی و فریبِ نظر کے دامن میں مستور نہ کر سکی۔ اگر چہ یہ اس کے پیشے کی خصوصیت ہوتی ہے اور وہ چھپاتی بھی کیسے؟ جب کی جلال کی نظر نہایت باریک بیں ہو گئی تھی۔ اور اس وقت وہ فولاد کے آر پار بھی دیکھ سکتی تھی۔

''علاوہ اور چیزوں کے چچا مجھے ایک لاٹھی دے گئے ہیں......تا کہ میں ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ بنا لوں اور نشیب و فراز میں نہ گروں۔'' جلال نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے پایا۔

''کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو جلال......لو، پی کے بے نیاز ہو جاؤ'' اور میگی نے سمجھا کہ یہ صرف چچا کی موت کا گہرا اثر ہے۔ جلال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمھارا شباب زوروں پر ہے......''

میگی نے اپنے جسم پر ایک چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالی اور مسکرائی۔

''کل ڈھل جائے گا۔''

مس میگی نے دوسری دفعہ اپنے جسم کی طرف دیکھا اور خون اس کے رخساروں اور کانوں کی طرف دوڑنے لگا۔

''تم بوڑھی ہو جاؤ گی اور پھر تمھیں کوئی نہ پوچھے گا...... یہ جتنے بھی بیٹھے ہیں، اور میں خود بھی......'' اس نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے شباب کے خریدار ہیں۔ جوانی کی شام ہونے پر یہ سب لوگ اپنے اپنے گھروندے میں جا گھسیں گے۔ تم کو کوئی نہ پوچھے گا۔ پھر تم کیا کرو گی میگی؟''

''یہ سوال تو میں عنقریب ہی تم سے کرتی......کیا تم اس وقت میری خبر گیری نہ کرو گے؟''

''ایسا نہیں ہوا کرتا میگی، شباب کی رعنائیوں کے خریدار عمر کے ساتھ بوڑھی ہونے والی رعنائیوں کی کھوٹے داموں بھی قیمت ادا نہیں کرتے۔ اگر تم پنٹنگ میں تباہ ہونے کے فوراً بعد ہی شوہر کر لیتیں تو گو زندگی ظاہری طور پر عیش سے نہ گزرتی۔ تب بھی تمھارا انجام خراب نہ ہوتا۔ عورت سے وابستہ وہ آدمی جسے شوہر کہتے ہیں، اپنے بُڑھاپے میں معمر بیوی کی بوڑھی اور بھونڈی رعنائیوں کی بھی وہی قیمت ادا کرتا ہے جو اس نے جوانی میں ادا کی ہوگی...... بلکہ اس سے بھی زیادہ...... میں نے تمھارے شباب کو عزیز کیا ہے اور اس کے لطف کو خریدا ہے۔ مگر بیوی نے بغیر دام لئے اپنے جام خلوص اور ایثار سے مجھے پلا دئے۔ اس لئے وہی ایک ہستی ہے جو میرے جذبۂ ایثار پر تسلّط جمانے کا حق رکھتی ہے۔

......''میگی! تم اس اندھے کی مانند ہو جو کہ بے تحاشا بھاگا جا رہا ہو۔ حالانکہ اس کے پاس لاٹھی بھی نہیں۔ تم نے اپنی لاٹھی یہیں کہیں گھر کے کسی کونے میں بھول کر ڈال دی ہے۔ اُٹھو اسے ڈھونڈ نکالو اور اس سے اپنے مستقبل میں اپنی راہ نشیب وفراز اور کیچڑ سے بچ کر نکال لو...... ورنہ رنج والم کی گہرائیوں میں جا گروگی......''

جلال کی آنکھ کُھل گئی۔ اس نے آخری الفاظ نہایت زور سے کہے تھے۔ قمار خانے کے سب آدمی جلال کی طرف گھور رہے تھے۔ جلال کچھ گھبرا سا گیا۔ اس نے ویسے ہی اونچی آواز میں کہا۔

''یہ میرے ادیب چچا کے آخری الفاظ ہیں اور تم سب لاٹھی کے بغیر ہو۔ جو بالضرور مصائب کی خندق میں اوندھے منہ گروگے......''

......دوسرے لمحے میں جلال پیگوڈا نما قمار خانے کی پینتالیس سیڑھیوں کو بے تحاشا پھلانگتا ہوا جا رہا تھا اور اسے اپنے پیچھے بے تحاشا، دیوانہ وار قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

☆☆☆